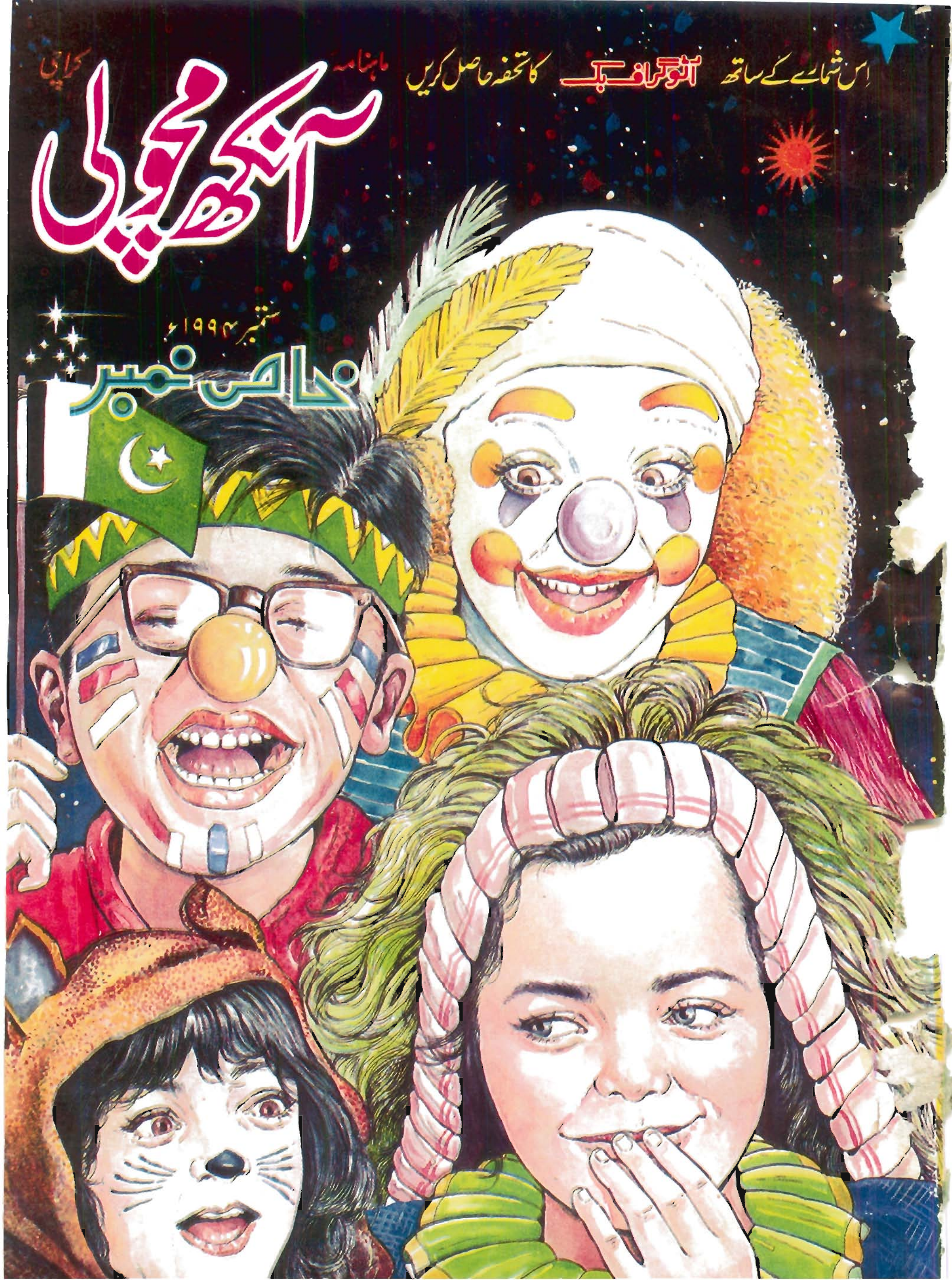
ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
اس شمارے کے ساتھ آٹوگراف بک کا تحفہ حاصل کریں
ستمبر ۱۹۹۴ء
خاص نمبر

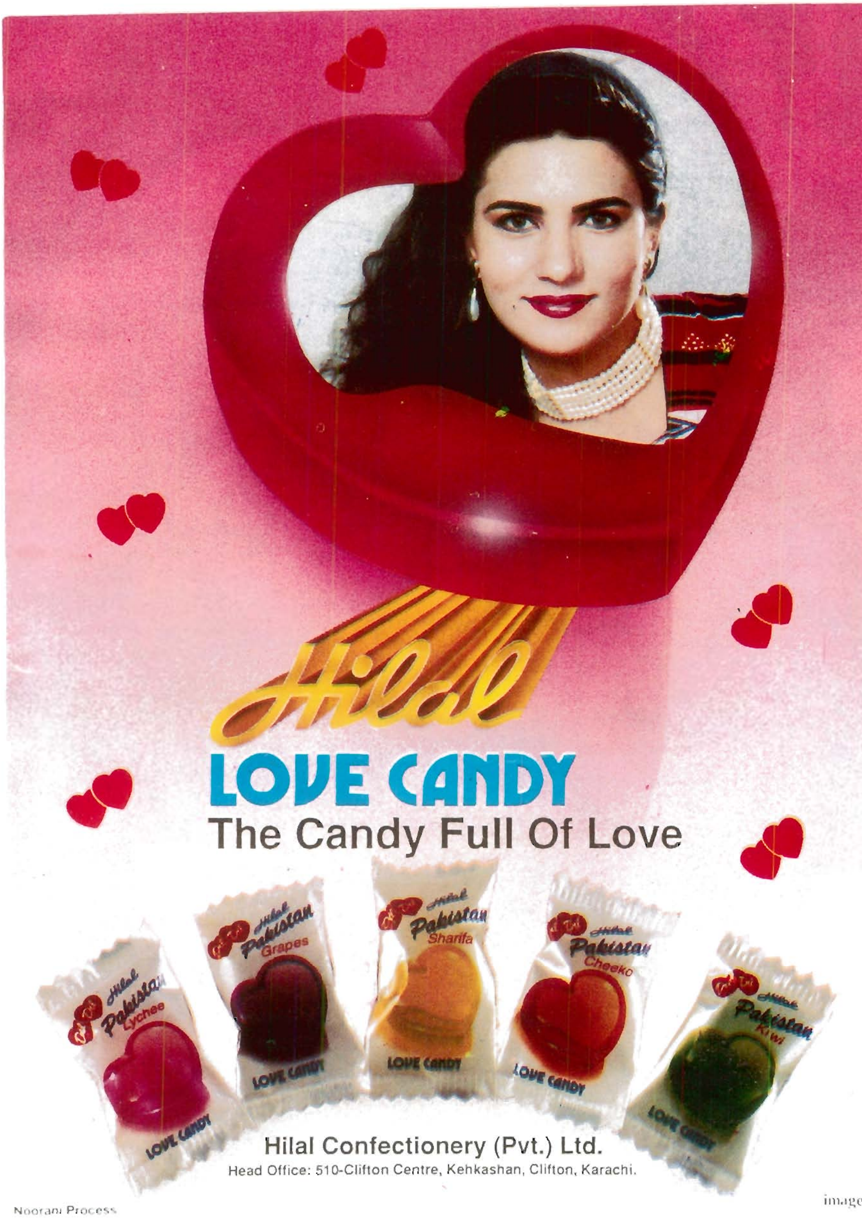

Noorani Process

image

Tempting Taste from
Play Boy
SUGAR COATINGS
TM
TEL NO. 6616050 — 6681241
FAX no. 92-21 — 6615578

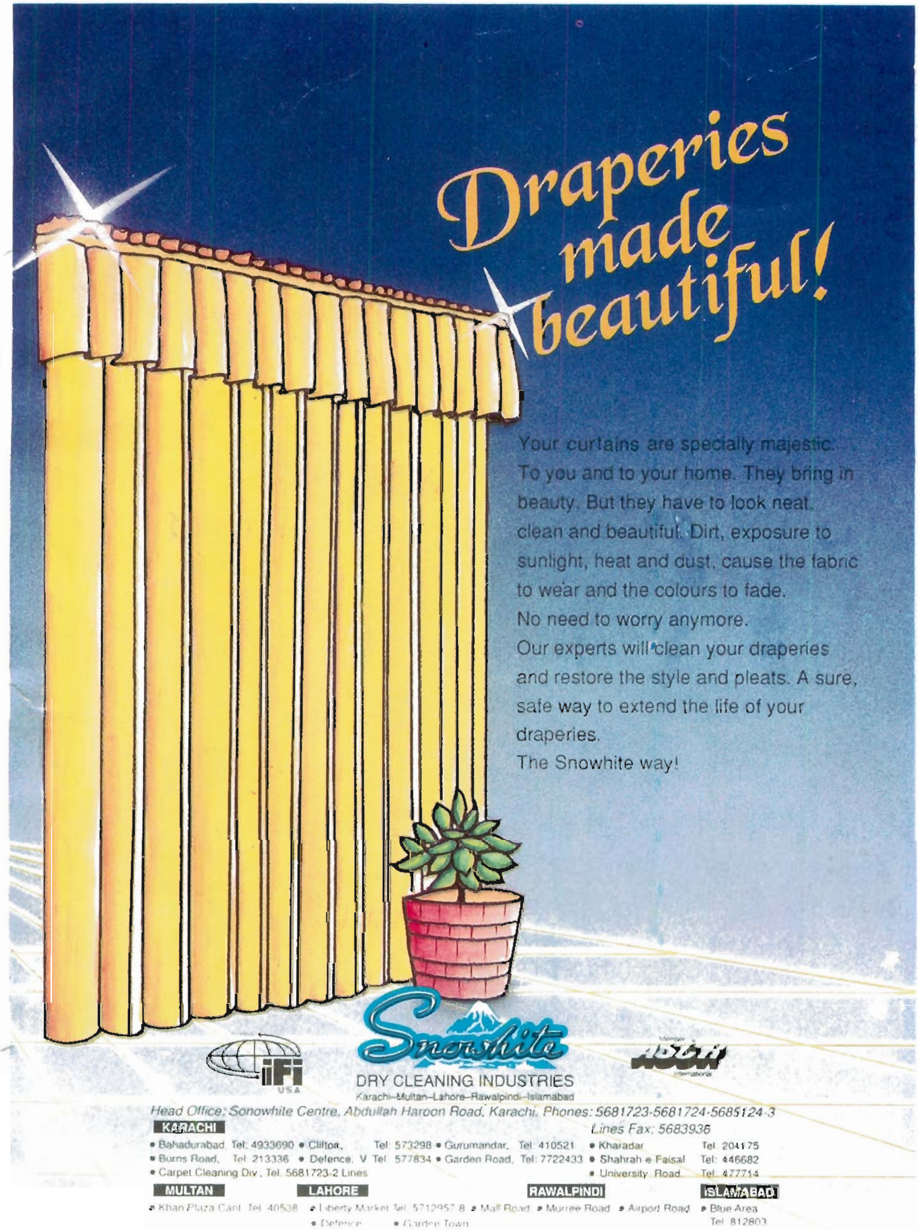
Draperies made beautiful!
Your curtains are specially majestic. To you and to your home. They bring in beauty. But they have to look neat, clean and beautiful. Dirt, exposure to sunlight, heat and dust, cause the fabric to wear and the colours to fade.
No need to worry anymore.
Our experts will clean your draperies and restore the style and pleats. A sure, safe way to extend the life of your draperies.
The Snowhite way!
iFi USA
Snowhite
DRY CLEANING INDUSTRIES
Karachi–Multan–Lahore–Rawalpindi–Islamabad
Head Office: Sonowhite Centre, Abdullah Haroon Road, Karachi. Phones: 5681723-5681724-5685124-3 Lines Fax: 5683936
KARACHI
• Bahadurabad. Tel: 4933690 • Clifton, Tel: 573298 • Gurumandar, Tel: 410521 • Kharadar Tel: 204175
• Burns Road, Tel: 213336 • Defence, V Tel: 577834 • Garden Road, Tel: 7722433 • Shahrah-e-Faisal Tel: 446682
• Carpet Cleaning Div., Tel. 5681723-2 Lines • University Road Tel: 477714
MULTAN
• Khan Plaza Cant. Tel. 40538
LAHORE
• Liberty Market Tel: 5712957-8 • Mall Road • Defence • Garden Town
RAWALPINDI
• Murree Road • Airport Road
ISLAMABAD
• Blue Area Tel. 812803

image

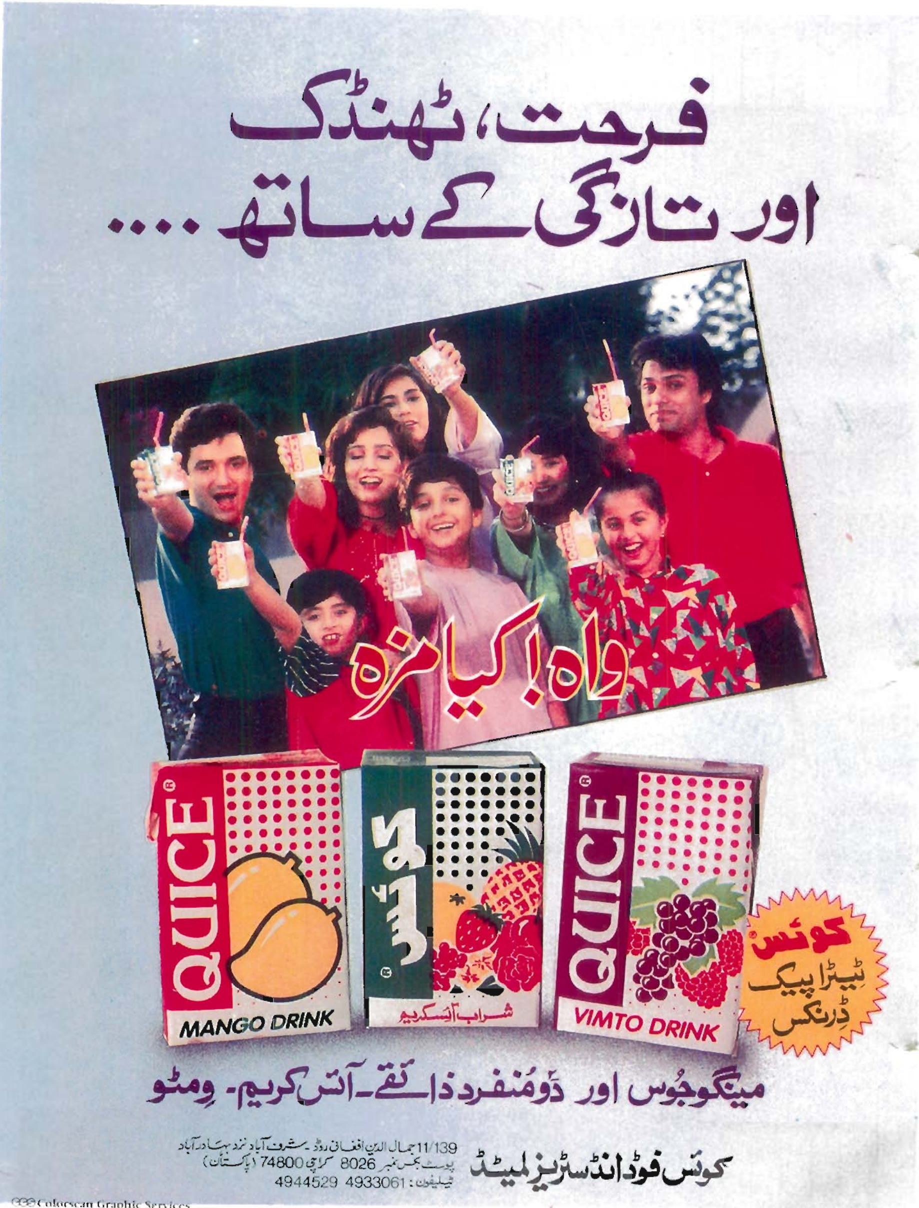

Colorscan Graphic Services.

Transworld

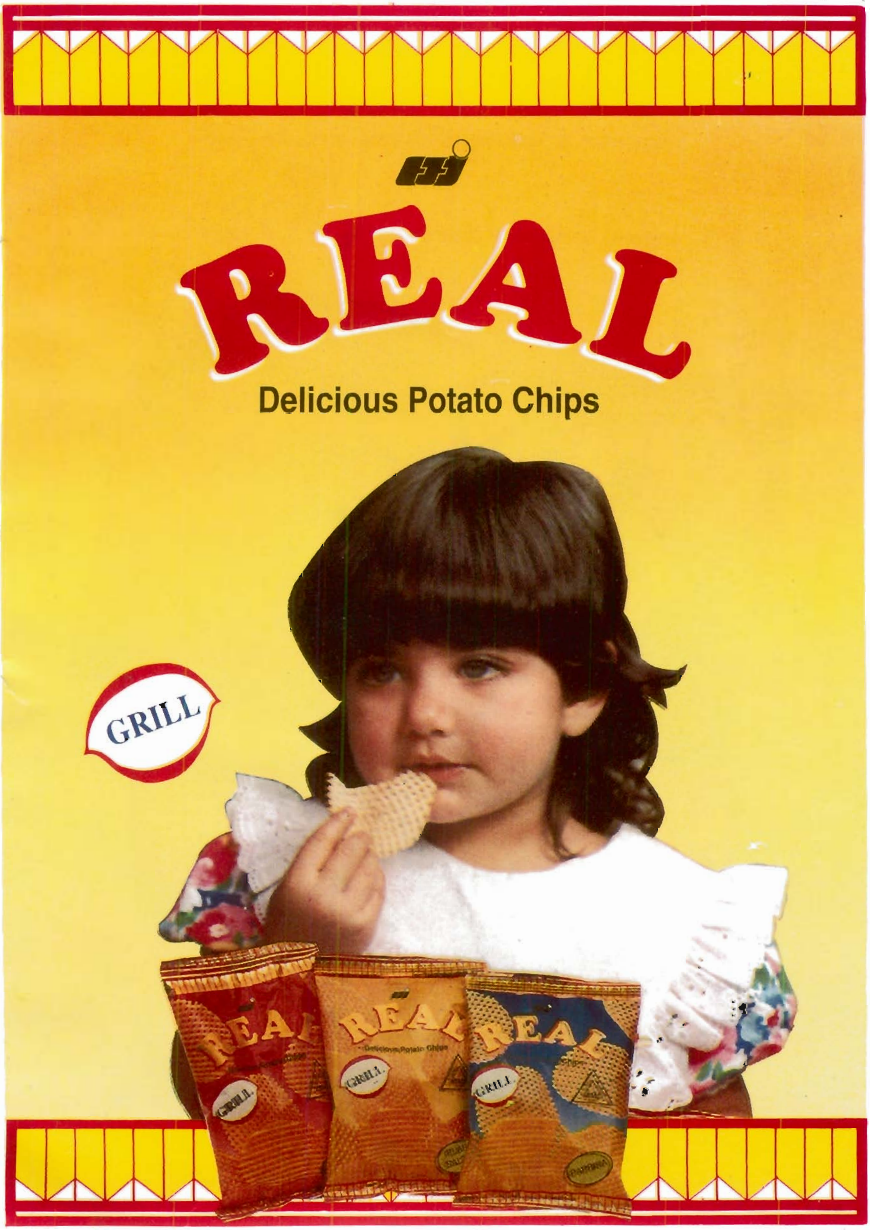

LASER DOT

ہاضمہ خراب ہو تو...

...سونے کا نوالہ بھی بے وقعت!

کھانے کا وقت ہو اور
بُھوک نہ لگے تو یہ معدے
اور جگر کی خرابی کی علامت
ہے۔ ایسی صورت میں
نئی کارمینا لیجیے۔
زود اثر نئی کارمینا فوری
طور پر فعلِ ہضم درست
کرتی ہے اور معدے کی
اصلاح کرتی ہے۔

- دردِ شکم میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں نیم گرم پانی کے ساتھ استعمال کریں
- بدہضمی، قے یا متلی کی شکایت میں نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیں
- نئی کارمینا کی دو سے چار ٹکیاں باقاعدگی کے ساتھ رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے استعمال کی جائیں تو دائمی قبض سے نجات مل جاتی ہے۔
- بھوک کی کمی کی شکایت میں صبح ناشتے سے پہلے، دوپہر اور رات کے کھانے سے قبل نئی کارمینا کی دو ٹکیاں چوسیے۔

بچوں کو حسب عمر آدھی یا ایک ٹکیہ نئی کارمینا دیجیے۔

نظامِ ہضم کی اصلاح کے لیے پُرتاثیر ہاضم ٹکیاں

خوش ذائقہ **نئی کارمینا** ہمیشہ گھر میں رکھیے

ہمدرد

Adarts-CAR-2/92

capri
TOILET SOAP
Aloe Vera
قدرتی موئسچرائزر
Aloe Vera کے ساتھ
ایلوویرا
کیپری کا ملائم جھاگ نرمی سے آپ کی جلد کو صاف کرتا
ہے اور اس میں موجود خصوصی ایلوویرا موئسچرائزر جلد کی
قدرتی نمی کو محفوظ رکھتا ہے۔ ریگولر کے علاوہ تین حسین رنگوں
اور منفرد خوشبوؤں - Sandalwood - Floral
Gardenia - میں دستیاب۔ گھر کے ہر فرد کا انتخاب
جلد کی حفاظت، جلد کی نفاست
PRESTIGE

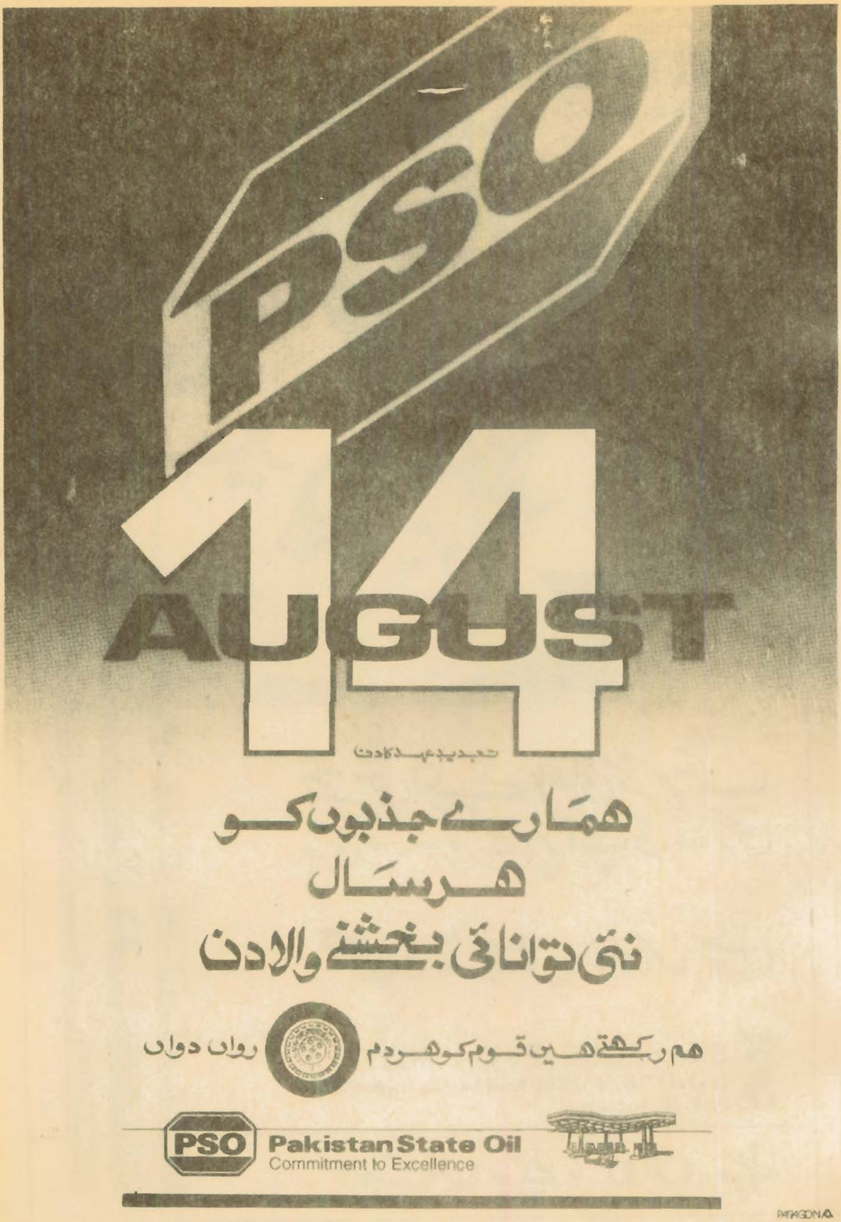
PSO
14
AUGUST
تجدید عہد کا دن
ہمارے جذبوں کو
ہر سال
نئی توانائی بخشنے والا دن
ہم رکھتے ہیں قوم کو ہر دم رواں دواں
PSO
Pakistan State Oil
Commitment to Excellence

حقیر سی لکیر سے اعلیٰ تحریر تک
ہر قدم ، ہر مرحلے پر آپ کی ساتھی

گولڈفِش ڈیلیکس پینسل

SHAHSONS (PVT) LIMITED
D-88 S.I.T.E MANGHOPIR ROAD, KARACHI-16.
PHONE: 296001-4

جہاں چلے ، رواں چلے

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی نقیب

آنکھ مچولی

جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۳

ربیع الاول / ربیع الثانی ۱۴۱۵ھ ستمبر ۱۹۹۴ء

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ

منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی

منیجنگ ایڈیٹر
ایم اے فاروقی

مدیر اعزازی
طاہر مسعود

مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

سرکولیشن مینجر
بابر فاروقی

مصوّر
مومن رحیم

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔
ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ تمام کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ظہیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

قیمت ۲۰ روپے
۱۴ درہم ۱۴ ریال

فون: ۴۹۴۲۸۵۷

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۵-اے پی آئی بی کالونی کراچی ۵ (۷۴۸۰۰)

ناشر: ظفر محمود شیخ - طابع: زاہد علی - مطبع: لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ کراچی

فہرست

سنہرے حروف	ادارہ	۱۴
ماہِ رواں کی پہلی بات	اداریہ	۱۵
خاص نمبر کے بارے میں	ادارہ	۱۶
اے خدا اے خدا (نظم)	آصف وقار آصف	۱۷
رُخِ مصطفٰےؐ	محمّد جاوید خالد	۱۸
ایکشن فلموں کا راز	عبّاس عالم	۲۴
۶ ستمبر (نظم)	عالم شفیع ہمدم	۲۷
اندھے نے چڑیا پکڑی	ترجمہ: آصف فرخی	۲۸
فضائیہ کا شاہین	ظہور الدین بٹ	۳۱
ایک مس نے مجھے ٹھیک کردیا	غلام رضا جعفری	۳۵
ہنسو کہ زندگی ہے یہی	نائلہ بختیار	۳۹
آدم خور	مُحمّد عادل منہاج	۴۲
آنکھ مچولی کے نام (نظم)		۵۵
دماغ ہمارے جسم کا حاکم	مُحمّد عظیم قریشی	۵۶
میرے دکھ کون بانٹے گا	عین غین	۶۰
خلائی حملہ آور	سیّد عرفان علی یوسف	۶۳
مائیں یا مت مائیں چچی (نظم)	حاطب صدیقی	۷۰
۹ کا ہندسہ، ایک تجربہ	منیر احمد فردوس	۷۲
کوہ قاف سے واپسی	طارق محمُود	۷۴
دو بھائی دو کارٹونسٹ	طاہر مسعود	۷۹
گھر یا چڑیا گھر (نظم)	پروفیسر عنایت علی خان	۸۳
عاشی بی	ارشاد محمّد	۸۴
سوال یہ ہے	ایاز محمُود	۹۲
جھُوٹ کے پاؤں	منیر احمد راشد	۹۶
مستقبل کا سفر	احمد ظہیر قریشی	۱۰۳
گھر بیٹھے دولت کمائیے	زوار حسین بجلانی	۱۰۵
سورج کا ٹکڑا	نعیم مشتاق نومی	۱۰۷
خفیہ غار	نکہت سرور	۱۱۴

فہرست

۱۲۲ — عبدالقادر — (نظم) قارون کا خزانہ
۱۲۵ — اعجاز احمد فاروقی — بے وقت کام کا انجام
۱۲۹ — نگہت آرا چوہان — بال کی کھال
۱۳۲ — رخشندہ خالد — میں چھوٹی سی اک لڑکی ہوں
۱۳۵ — محمد جاوید خالد — (نظم) ہڈیوں کے ماہر
۱۳۶ — اشتیاق احمد — اُلٹی گنگا
۱۴۱ — سیدہ صدف عرفان — نیند کی قیمت
۱۴۵ — لطائف — ہنستے ہنستے
۱۵۱ — سلیم خالق — پاکستان سے پیار کریں
۱۵۶ — فیصل احمد شجراہ — ستاروں کے پُراسرار ذرات
۱۵۸ — اظہار الحق — (نظم) لڈو چرائے
۱۵۹ — سلیم خالق — آمنے سامنے
۱۶۳ — فرزانہ روحی — ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
۱۶۷ — عبدالستار خان طاہر — کوہِ نور کی کہانی
۱۷۲ — محمد عقیل صابر قریشی — طرف دار
۱۷۶ — عنایت اللہ اعوان — (نظم) چنگیز خان کی رحمدلی
۱۷۷ — الطاف حسین — آنکھ بند مرغے
۱۸۲ — خطوں کے جواب — بنام آنکھ مچولی
۱۸۶ — اُفق دہلوی — (نظم) ہوا
۱۸۷ — ادارہ — پڑھائی کے لئے پٹائی ضروری ہے
۱۹۶ — یاسر اعجاز — عقل کے کرشمے،
۱۹۷ — ادارہ — عکس ادھورے کیجئے پورے
۲۰۱ — جیدون ادیب — بابو شرط باز
۲۰۵ — پروفیسر عنایت علی خان — گھر کا کام
۲۱۱ — ناصرہ فیضی — ہم نے بنایا سیب کا حلوہ
۲۱۵ — محمد عمر احمد خان — وہ کیا راز تھا
۲۲۳ — ننھی تحریریں — قلم دوست

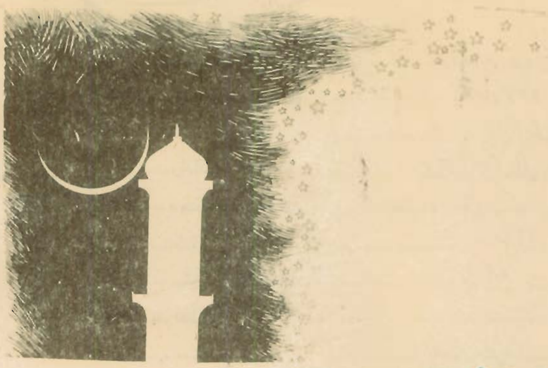

سنہرے حروف

ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے کے لئے آیا۔ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت کو اس کے آنے کی اطلاع دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسے اندر بلالو میں جانتا ہوں وہ اپنے قبیلے میں سب سے بُرا آدمی مشہور ہے۔"

وہ شخص اندر آیا اور بے تکلفی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیٹھ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت اور ملائمت سے باتیں کیں۔ اس پر حضرت عائشہؓ کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے اس شخص کے جاتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شخص کوئی اچھا آدمی نہیں اس سے اتنی نرمی اور محبت سے باتیں کیں؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا۔ "عائشہؓ اس دنیا میں وہ آدمی بہت بُرا ہے جو کسی شخص سے محض اس لئے بات نہیں کرتا کہ وہ ایک خراب آدمی ہے۔"

(بخاری)

پہلی بات

آدمی جس شاخ پر بیٹھا ہوتا ہے اسے کبھی نہیں کاٹتا۔ جس تھالی میں کھاتا ہے اس میں کبھی چھید نہیں کرتا لیکن یہ ہمارے ملک کی بڑی بدقسمتی ہے کہ یہاں کے رہنے والے اسی ملک کو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہم میں سے کسی کو بھی کوئی تکلیف پہنچ جائے وہ فوراً پاکستان کے خلاف تقریر شروع کر دیتا ہے۔ بجلی چلی جائے، پانی غائب ہو جائے، کوئی بڑا حادثہ ہو جائے، کسی کو نوکری نہ ملے یا کوئی نوکری سے نکال دیا جائے، اسکول میں داخلہ نہ ملے یا کوئی کالج ہنگامے کی وجہ سے بند ہو جائے۔ غرضیکہ کچھ بھی ہو جائے ہم لوگ اس کا ذمہ دار پاکستان کو ٹھہراتے ہیں حالانکہ ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہے لیکن پتا نہیں ہم اپنا سارا غصہ پاکستان کے خلاف کیوں نکالتے ہیں۔ مسائل کس ملک میں نہیں ہیں؟ قتل، ڈاکہ، رشوت، بدعنوانی، کام چوری اور دیگر مسائل ہر جگہ ہیں لیکن دنیا کے شاید ہی کسی ملک کے لوگ اس کا قصوروار اپنے ملک کو ٹھہراتے ہوں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ان چھوٹے بڑے مسائل کو دیکھ کر فوراً اپنے ملک کے وجود کے بارے میں شک و شبہے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور بعض احمق تو یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے کہ یہ ملک باقی نہیں رہے گا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ باتیں زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس ملک نے تعلیم دی، روزگار دیا، عزت دی وہی لوگ اس ملک کی عزت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ جس شخص نے اس ملک سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے وہی اس ملک کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے پر تلا ہوا ہے۔ بھلا بتایئے دنیا کے کس خطے میں ایسے احسان فراموش لوگ رہتے ہوں گے؟

ستمبر کا مہینہ ہمارے ملک میں دفاع کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے کیونکہ اس مہینے ہماری مسلح افواج نے اللہ پر یقین اور عوام کی مدد سے اپنے سے پانچ گنا بڑی طاقت کے حملے کو روکا تھا۔ اس دن کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے اس مہینے ہم یوم دفاع مناتے ہیں لیکن ہمارے ملک میں جس قسم کی سوچ پروان چڑھ رہی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم ہر روز اور ہر لمحے اپنے ملک کے دفاع کے لئے تیار رہیں۔ ہم ان لوگوں کی صف میں شامل نہ ہو جائیں جو اس ملک کے خلاف اپنی زبانیں دراز کرتے ہیں بلکہ جہاں کہیں ایسی کوئی گفتگو ہو رہی ہو وہاں اپنے آپ کو سچا محبِ وطن پاکستانی ثابت کریں۔ ملک کے اندر ملک کی سالمیت کی حفاظت اب کہیں زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ دشمن کی کوشش ہے کہ ملک کے اندر بے یقینی پیدا کی جائے کیونکہ بے یقینی سے انتشار جنم لیتا ہے اور انتشار سے بدامنی پھیلتی ہے جو ملک کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے۔ لہٰذا بے یقینی کو ختم کرنا پہلی ضرورت ہے۔ اسی لئے قائد اعظم نے فرمایا تھا کہ پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور انشاء اللہ یہ قائم رہے گا۔ قائد اعظم کے اس قول کو ہم اپنے عمل ہی سے صحیح ثابت کر سکتے ہیں۔

آپ کا دوست طاہر مسعود

خاص نمبر کے بارے میں

سات برس بعد آنکھ مچولی کا خاص نمبر پیش کیا جارہا ہے۔ اب تک ہم نے مسلسل موضوعاتی شمارے شائع کئے ہیں۔ اتنی کثرت سے اور اتنے مختلف موضوعات پر خصوصی شمارے پیش کرنے کی کوئی مثال بچوں کی صحافت میں اس سے قبل موجود نہیں تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس خدمت کا ہمیں موقع ملا اور آپ لوگوں نے ہماری ان کوششوں کو دل سے سراہا۔ یہی ہماری خدمت کا صلہ ہے۔ پچھلے ایک سال سے ساتھیوں کی جانب سے ہمیں نت نئے موضوعات پر خصوصی نمبر چھاپنے کی فرمائشیں موصول ہو رہی تھیں لیکن اب کے ہم نے سوچا کہ موضوعاتی نمبر پڑھ پڑھ کر آپ لوگ کچھ بور ہو گئے ہوں گے کیونکہ کسی ایک موضوع کی وجہ سے رسالے میں یکسانیت سی آجاتی ہے اور جن دوستوں کو اس موضوع سے دلچسپی نہ ہو، ان کے لئے تو پورا رسالہ ہی غیر دلچسپ ہو جاتا ہو گا۔ باوجود اس کے کہ کسی خصوصی شمارے کے سلسلے میں ہمیں ایسی کوئی شکایت نہیں ملی۔ پھر بھی ہم نے اس خاص نمبر کو آپ کے لئے رنگارنگ موضوعات سے سجانا ہی زیادہ مناسب سمجھا۔

آنکھ مچولی کی عمر ابھی بہت مختصر ہے۔ ملک میں کئی رسالے ایسے ہیں جو گزشتہ چالیس پچاس سال سے شائع ہو رہے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان رسائل نے نونہالان وطن کی تعلیم اور تربیت میں بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ہمارے شکریئے کے مستحق ہیں۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ حکومت نے ان کے مدیران اور سینیئر لکھنے والوں کو کبھی کسی اعزاز کا مستحق نہیں سمجھا۔ لیکن یہ لوگ اپنے پڑھنے والوں میں مقبول ہیں اور کئی نسلیں ان سے واقف ہیں۔ آنکھ مچولی نے ان ہی رسالوں کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ چونکہ یہ نئی نسل کا رسالہ ہے اس لئے یہ پچھلے رسالوں سے مختلف ہے اور آئندہ جو رسالے نکلیں گے وہ یقیناً آنکھ مچولی سے مختلف ہوں گے۔ زمانے کی رفتار بہت تیز ہے۔ رسائل کے مقابلے میں ٹیلی ویژن، ویڈیو فلمیں اور ڈش اینٹینا مقبول ہو رہے ہیں۔ ہماری اولین کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم رسائل میں ایسا دلچسپ مواد پیش کریں جو ان ذرائع سے آپ تک نہ پہنچ رہا ہو۔ مطالعے کا نعم البدل کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ آپ کو بھی چاہئے کہ مطالعے کی عادت کو ختم نہ ہونے دیں۔ مطالعہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ آپ لوگوں کے لئے جو رسائل نکل رہے ہیں انہیں طرح طرح کے مسائل کا سامنا ہے۔ وہ تجارتی لحاظ سے گھاٹے کا سودا ہیں۔ ان کی مشکلات کو سمجھنا اور ان سے تعاون کرنا آپ کا فرض ہے۔ آنکھ مچولی نے پچھلے ماہ دل پر پتھر رکھ کر انتہائی مجبوری کے عالم میں اپنی قیمت میں اضافہ کیا اور اس کی وجوہ بھی ہم نے آپ کو بتا دیں۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ اضافہ آپ کو ناپسند ہو گا لیکن ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ حالات اگر بہتر ہوئے تو ہم قیمت میں کمی بھی کر سکتے ہیں۔ موجودہ صورت میں ایسا رسالہ اسی قیمت پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ خاص نمبر کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرنا نہ بھولئے گا۔

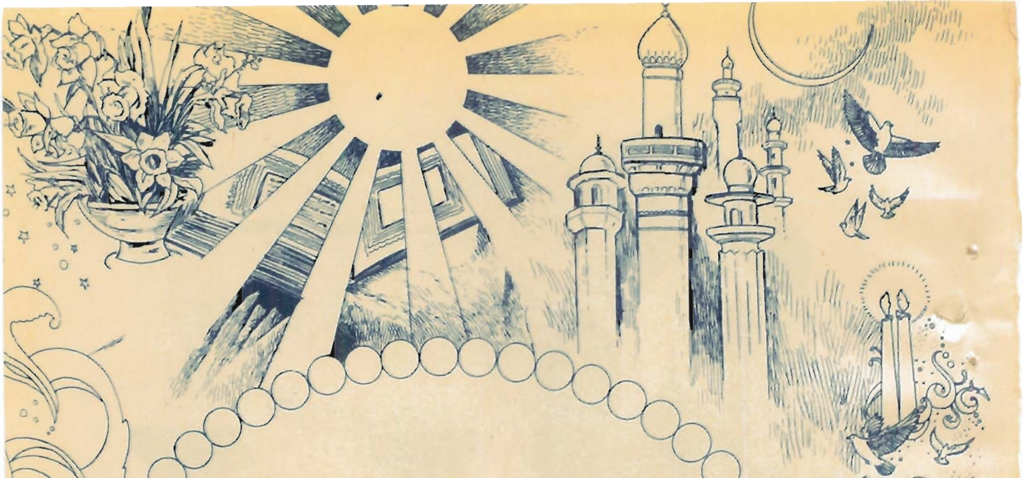

اے خدا اے خدا

آصف وقار آصف

نہ تیری ابتدا — نہ کوئی انتہا
تو ہے سب سے بڑا — اے خدا اے خدا
مجھ کو جو بھی ملا — وہ تجھی سے ملا
تجھ سے مانگوں دعا — اے خدا اے خدا
ہے چمن میں بھی تو — پھول کا رنگ تو
تیری نکہت جُدا — اے خدا اے خدا
ماں کی مَمتا کا نور — پیار کا اک سرور
سب ہے تیری عطا — اے خدا اے خدا
رات دن ہر گھڑی — حمد کرتے تیری
یہ زمیں آسماں — اے خدا اے خدا
تو رحیم و کبیر — تو خبیرو قدیر
مالکِ روح و جاں — اے خدا اے خدا

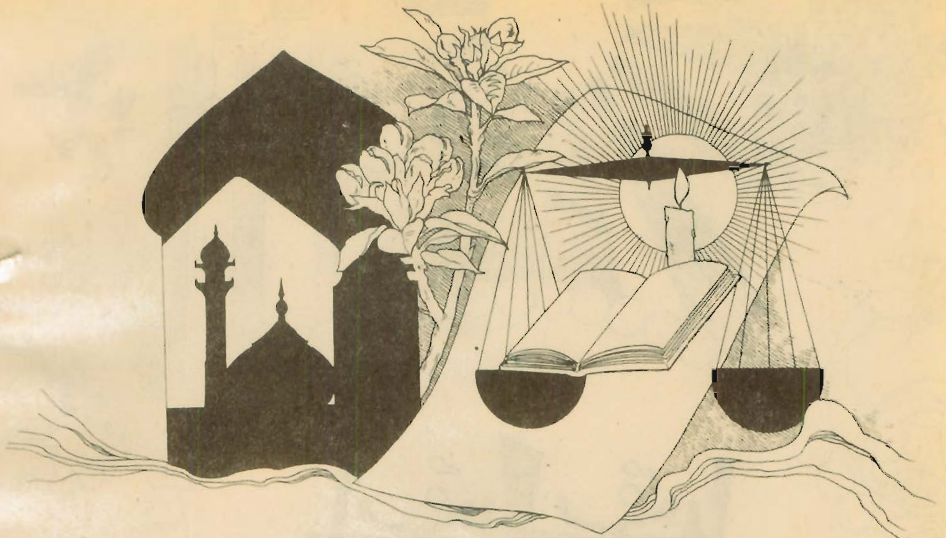

رخِ مصطفےٰ ﷺ

محمد جاوید خالد

کروڑوں، اربوں سال پہلے یہ دنیا وجود میں آئی اور خدا ہی بہتر جانے کہ اسے کب تک قائم رہنا ہے۔ اس سارے عرصے میں اَن گنت انسان پیدا ہوئے اور مر گئے اور اسی طرح پیدا ہوں گے اور مر جائیں گے۔ ان کی صحیح تعداد کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسانوں کے اس بے انتہا ہجوم میں صرف ایک انسان ایسا ہے جس کی زندگی کو وہ اہمیت حاصل ہے جو کسی دوسرے انسان کے حصے میں نہیں آئی۔

یہ اہمیت دو وجوہ کی بنا پر ہے۔

(الف) اس زندگی کو خود خالق دو جہاں نے ایک مثالی زندگی قرار دیا اور اسے اختیار کرنے کی تلقین کی۔

(ب) اس زندگی کا کوئی گوشہ، کوئی دَور بلکہ کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جو کھلی کتاب کی طرح نہ ہو اور محفوظ نہ ہو۔

یہ عظیم انسان فخرِ انسانیت حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کی زندگی ولادت سے لے کر وفات تک ہر ہر انسان کے لئے مینارۂ نور

ہے۔ ایسی روشنی جو ہر طرح کے انسان کو ہر حالت میں منزلِ مقصود تک پہنچا دیتی ہے۔ انسان، مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے انسان، امیر و غریب، حاکم و محکوم، سپاہی و سالار، بزرگی و شباب غرض کہ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو رہنمائی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے نہ ملتی ہو۔ آیئے اس مینارۂ نور سے کچھ کرنیں ہم بھی اپنے اندھیروں کے لئے حاصل کریں۔

خطاب میں امتیاز:۔ رسول پاکؐ کی حیاتِ طیبہ کی ایک منفرد بات یہ ہے کہ رہتی دنیا تک باقی رہنے والی آسمانی کتاب قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کا ذکر فرماتے ہوئے انہیں ان کے نام سے مخاطب کیا جیسے:

یا آدم - یا داؤد - یا ذکریا - یا یحییٰ

لیکن پورے قرآن مجید میں ایک جگہ بھی "یا محمد" اور "یا احمد" کا انداز اختیار نہیں کیا گیا بلکہ جہاں کہیں آپؐ سے خطاب ہے، الفت و محبت میں القاب کے ساتھ ہے جیسے: یا ایھا الرسول - یا ایھا النبی - یا ایھا المزمل - یا ایھا المدثر

محنت میں عظمت ہے:۔ رسول پاکؐ نے محنت سے کبھی جی نہیں چرایا، خود محنت کی اور محنت کرنے کو پسند فرمایا۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ بڑا آدمی بننے کے بعد انسان یا تو ماضی کو بھول جاتا ہے یا اسے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ آپؐ کا معاملہ یہاں بھی منفرد ہے۔ دس بارہ برس کی عمر میں آپؐ نے بکریاں چرائیں اور زمانۂ رسالت میں بھی آپ اس سادہ اور پر لطف مشغلہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ صحابہؓ کے ساتھ جنگل میں تشریف لے گئے۔ جھڑبیریاں توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ آپؐ نے فرمایا "جو خوب سیاہ ہو جاتے ہیں، زیادہ مزے کے ہوتے ہیں۔ یہ میرا اس زمانے کا تجربہ ہے جب میں بچپن میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا۔"

امن کی حمایت:۔ آپؐ اپنی نو عمری اور نوجوانی میں بھی حق بات کو نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ اس کی حمایت بھی کرتے تھے۔ قریش میں بات بات پر لڑائیاں ہوتیں اور سیکڑوں گھرانے اس کی نذر ہو جاتے۔ قتل و سفاکی جب عام ہو گئی تو کچھ بزرگوں نے اس کے خلاف تحریک پیدا کی۔ چنانچہ مکہ کے سرکردہ خاندانوں نے بیٹھ کر ایک معاہدہ کیا کہ "ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔" رسول پاکؐ اس معاہدہ میں پیش پیش تھے اور عہدِ نبوت میں فرمایا کرتے تھے "معاہدے کے مقابلے میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ لیتا اور آج بھی ایسے معاہدے کے لئے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔"

گھر کی گواہی:۔ آدمی جھوٹا نقاب اوڑھ کر ساری دنیا کو دھوکہ دے سکتا ہے لیکن گھر والوں سے اور خاص طور پر شریکِ حیات سے کوئی پردہ نہیں رہتا۔ رسول پاکؐ کے اخلاق، منصبِ نبوت پر فائز ہوتے

سے پہلے ہی کس قدر اعلیٰ اور پسندیدہ تھے، اس کا اندازہ حضرت خدیجہؓ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے نبوت کے واقعہ کے بعد رسول پاکؐ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمائے۔ جب رسول پاکؐ نے فرمایا کہ "میں ایسے واقعات دیکھتا ہوں کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہو گیا ہے۔" تو حضرت خدیجہؓ نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم خدا آپ کو کبھی ضائع نہ ہونے دے گا۔ آپ عزیزوں اور رشتہ داروں سے حسنِ سلوک کرتے ہیں۔ ناتوانوں، بے کسوں اور غریبوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا ان کی مدد کرتے ہیں۔ مہمانوں کی تواضع کرتے ہیں۔ مصیبتوں میں حق کے مدد گار ہوتے ہیں، سچ بولتے ہیں۔"

شہر کی گواہی: ۔ تین برس تک خاموش تبلیغ کے بعد جب حکم ملا کہ اب آپؐ صاف صاف اور نزدیک، خاندان والوں کو دعوتِ توحید دیجئے اور اسلام کی طرف بلائیے تو آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کو پکارا۔ "یا معشر قریش۔" لوگ جمع ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آرہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟" سب نے کہا۔ "ہاں! کیونکہ ہم نے ہمیشہ آپ کو سچ بولتے دیکھا ہے۔"

امانت داری: ۔ مکہ کے سرکش لوگ نہ صرف یہ کہ رسولِ پاکؐ کی دعوتِ توحید کو مانتے نہیں تھے بلکہ آپؐ اور آپؐ کے ماننے والوں کو طرح طرح کی ایذائیں بھی دیتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی جان کے دشمن ہو گئے تھے۔ مگر اس کے باوجود آپؐ پر ان کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ اپنی امانتیں بھی آپؐ ہی کے پاس رکھواتے تھے۔ چنانچہ ہجرت کے وقت بھی جب مکہ کے یہی سرکش (نعوذ باللہ) آپؐ کے قتل کی نیت سے آپؐ کے مکان کو گھیرے ہوئے تھے، آپؐ نے حضرت علیؓ کو تمام امانتوں کا معاملہ سمجھایا اور فرمایا کہ "یہ ان کے مالکوں کو لوٹا کر مدینے چلے آنا۔"

فراست اور دانائی: ۔ معرکۂ بدر میں ابھی دونوں لشکر آمنے سامنے نہیں ہوئے تھے کہ بدر کے چشمے پر کفارِ مکہ کے دو غلام پکڑے گئے۔ مسلمانوں نے ان سے معلومات حاصل کرنا چاہیں جو کہ ظاہر ہے آسان کام نہیں تھا۔ رسولِ پاکؐ نے ان دونوں کو اپنے سامنے بلوایا اور پوچھا وہ لوگ (قریش) کتنے ہیں؟" "وہ بہت ہیں"۔ غلاموں نے گول مول جواب دیا۔

آپؐ نے پوچھا "کھانے کے لئے روزانہ کتنے اونٹ ذبح کئے جاتے ہیں؟"

"کسی روز نو کسی روز دس"۔ انہوں نے جواب دیا۔

آپؐ نے بے ساختہ فرمایا کہ کفار کے لشکر کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے۔ کیونکہ ایک اونٹ تقریباً سو آدمیوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔

نبی رحمتؐ: ۔ معرکۂ احد میں عتبہ بن ابی وقاص نے آپؐ کا نیچے کا داہنا دانت شہید کر دیا۔ اس

چوٹ سے لبِ مبارک پر بھی زخم آیا۔ عبداللہ بن شہاب نے پیشانی مبارک کو زخمی کیا۔ عمرو بن قمیہ نے ایک پتھر اس زور سے مارا کہ خود کی دو کڑیاں رخسارِ مبارک میں گھس گئیں۔ آپ ؐ نے فرمایا "وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبیؐ کا چہرہ خون سے رنگین کرتی ہے۔" پھر تمام وقت میں بس یہ دعا فرماتے رہے "اے خدا میری قوم کو راہ ہدایت دکھا دے۔ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں یا خدا انہیں معاف کر دے۔"

احساسِ ذمہ داری:۔ آپ کے شفیق چچا جناب ابو طالب ایک دفعہ سخت بیمار پڑے۔ رسول پاکؐ کو ان سے بہت محبت تھی۔ آپ عیادت کے لئے تشریف لے گئے۔ جناب ابو طالب نے کہا "بھتیجے! جس خدا نے تجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اس سے دعا مانگو کہ مجھ کو اچھا کر دے۔" آپؐ نے دعا کی اور وہ اچھے ہو گئے۔ اس پر جناب ابو طالب نے کہا "خدا تیرا کہنا مانتا ہے۔" رسول پاکؐ نے برجستہ جواب دیا۔ "آپ بھی اگر خدا کا کہنا مانیں تو وہ بھی آپ کا کہنا مانے۔"

اصول پرستی و مساوات:۔ مدینۂ منورہ میں قیام کے بعد آپؐ نے سب سے پہلا کام خانۂ خدا کی تعمیر کا کیا۔ مسجد کی تعمیر کے لئے جو جگہ منتخب کی گئی وہ دو یتیم بچوں کی تھی۔ آپؐ نے ان کو بلوایا۔ ان بچوں نے زمین نذر کرنا چاہی مگر آپؐ نے منع فرمایا دیا اور قیمت ادا کی۔ پھر جب اس کی تعمیر شروع ہوئی تو شہنشاہِ عالم خود مزدوروں کے لباس میں صحابہؓ کے ساتھ ساتھ پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ یہی حال غزوۂ احزاب میں خندق کی کھدائی کے موقع پر تھا۔ ایک روز خندق میں سخت زمین آ گئی جہاں کدال کام نہیں کر رہے تھے۔ حضور اکرمؐ خود اترے۔ شکم مبارک پر پتھر بندھا ہوا تھا۔ کیونکہ تین روز سے کچھ نہ کھایا تھا۔ آپؐ نے کدال چلایا تو وہ سخت زمین آناً فاناً ہموار ہو گئی۔

بے مثال فاتح:۔ تاریخ انسانی کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ جب کسی فاتح نے کسی قوم پر غلبہ پایا تو اس نے ہر طرف تباہی پھیلا دی۔ اس کے ہاتھوں نہ جان محفوظ رہی نہ عزتیں۔ مگر فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے جو حسن سلوک کیا اس کی مثال پوری تاریخ انسانی میں کہیں نہیں ملتی۔ آپ نے کفار سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "میں آج وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کیا تھا۔ آج میری طرف سے تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ جاؤ آج تم سب آزاد ہو۔" یہ وہ لوگ تھے جو اکیس سال تک آپؐ پر اور آپؐ کے ماننے والوں پر اذیتوں، دکھوں اور مصیبتوں کے وہ تمام طوفان لاتے رہے جو ان کے بس میں تھے۔ جو مسلسل تلواریں، برچھیاں اور تیر برساتے رہے۔ اسی موقع پر ایک شخص آپؐ سے بات کرنے کے لئے آپؐ کے سامنے پہنچا تو مارے ہیبت کے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آپؐ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔ "کچھ پروانہ کرو۔ میں بادشاہ نہیں، قریش کی ایک غریب خاتون کا فرزند ہوں جو سوکھا گوشت کھاتی

مہکتی کلیاں

○ ...... جو لوگ آج کا کام کل پر اٹھا رکھتے ہیں، وہ نہیں سوچتے کہ آج ہم نے کیا کیا جو کل کر لیں گے۔

○ ...... مایوسی اور کامیابی کبھی اکٹھی نہیں رہتی۔ آزادی و کامیابی کے محل میں داخل ہونے کے لئے "ہمت عالی" پہلا دروازہ ہے۔

○ ...... اگر پہاڑ کو سر کرنے کی خواہش ہے تو پہلے ذروں کو سر کرنا سیکھو۔

○ ...... ہر کام میں دوسروں کا سہارا تلاش نہیں کرنا چاہئے۔

○ ...... فرض ایک قرض ہے جس کو سوائے اپنے کوئی دوسرا ادا نہیں کر سکتا۔

مرسلہ .... طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ

○ ــ حصول علم کیلئے دلجمعی درکار ہے۔

○ ــ جس کی توبہ عمل کے مطابق ہے وہ توبہ مقبول ہے۔

○ ــ جو اللہ کے کاموں میں لگ جاتا ہے اللہ اس کے کاموں میں لگ جاتا ہے۔

فہیم حیدر ــ کراچی

تھی۔"

حقوقِ انسانی:۔ جہاد کے ایک سفر میں جب صحابہؓ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو گئے تو ادھر ادھر سے کچھ بکریاں پکڑ لائے اور ذبح کر کے ان کا گوشت دیگچیوں پر چڑھا دیا۔ رسول پاکؐ کو خبر ہوئی تو آپ نے کمان سے دیگچیاں الٹ دیں اور فرمایا۔ "لوٹ کا مال مردار چیزوں سے کچھ بہتر نہیں۔" فوج کو حکم تھا کہ راستے میں دودھ دینے والے مویشی ملیں تو ان کا دودھ دوہنے کی بھی اجازت نہیں۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ سخت مجبوری کی حالت میں بھی مالک موجود ہو تو اجازت لینی چاہئے ورنہ تین بار بآوازِ بلند پکارنا چاہئے۔

بچوں پر شفقت:۔ حضور اکرمؐ بچوں پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ آپؐ جب سفر سے تشریف لاتے اور لوگ استقبال کے لئے نکلتے تو بچے بھی ساتھ ہوتے تھے۔ یہ بچے دوڑ کر ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے۔ جو پہلے پہنچتے انہیں آپ اپنے ساتھ سواری پر بٹھا لیتے۔ یہ شفقت مسلمان بچوں تک ہی محدود نہ تھی۔ ایک دفعہ کسی لڑائی میں چند بچے بھی بے خبری میں مارے گئے۔ "فرمایا "مشرکین کے بچے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار! بچوں کو قتل نہ کرو۔ خبردار بچوں کو قتل نہ کرو، خبردار بچوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔" جابر بن سمرہؓ، ایک صحابی، اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے رسول اللہؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ پھر آپ کے ساتھ ہو لیا۔ سامنے سے چند بچے اور آ گئے۔ آپ نے سب کو پیار کیا اور مجھے بھی پیار کیا۔"

NAZ
DELICIOUS PAN MASALA
جس کی خوشبو بھی پیاری
جس کی لذّت بھی پیاری
جو ہے سب کی پسند
میری مُٹھی میں بند
ہے کیا.... بتادو نا
ناز
پان مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS
P.O. BOX 3546, KARACHI-5 (PAKISTAN)
CABLE: "TWO-IN-ONE"

ایکشن فلموں کا راز

عباس عالم

ایک زبردست دھماکہ ہوا! کار میں آگ بھڑک اٹھی ہر طرف دھواں ہی دھواں۔ شعلے ہی شعلے۔ اور بس منظر ختم۔

ایک آدمی نہایت بلند چٹان سے گر رہا ہے۔ نیچے سمندر ہے جھاگ اڑاتا ہوا۔ وہ بے بسی سے ہاتھ پیر چلاتا سمندر میں گرتا ہے اور بس منظر ختم۔

ایک طاقتور شخص فضا میں بہت اونچے اڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر کے نچلے حصے سے لٹکا ہوا ہے۔ نیچے نوکیلی چٹانیں ہیں۔ وہ صرف ایک ہاتھ سے ہیلی کاپٹر کو تھامے ہوئے ہے۔ ہیلی کاپٹر تیزی سے پرواز کر رہا ہے۔ اور بس منظر ختم۔

یہ سارے خوفناک واقعات ہو سکتا ہے کہ آپ کے ساتھ روزانہ پیش آنے لگیں۔ گھبرا گئے نا۔ لیکن ایسا تبھی ہو سکتا ہے کہ آپ اگر "اسٹنٹ مین" بن جائیں۔

"اسٹنٹ مین" یعنی وہ آدمی جو فلموں کے خطرناک مناظر میں اصل اداکاروں کی جگہ کام کرتا ہے۔ تاکہ اصل اداکار محفوظ رہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ اسے ان خطرناک مناظر میں کام کرنے کی خاص تربیت دی گئی ہوتی ہے۔ اسے وہ خاص خاص طریقے معلوم ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے مشکل کاموں کو بڑے مزے سے کیا جا سکتا ہے۔

اصل میں ایکشن فلمیں بڑی محنت سے بنتی ہیں۔ ان میں اصل کام یہ کرنا ہوتا ہے کہ آپ انہیں دیکھ کر حیران رہ جائیں۔ اتنے کہ دو گھنٹے تک اسکرین سے نظریں ہی نہ ہٹا پائیں۔ لیکن ایسا جبھی ہو سکتا ہے کہ فلم کے مناظر اتنے حیرت انگیز ہوں کہ پہلے کبھی آپ نے دیکھے ہی نہ ہوں۔ اس کے لئے فلم کے ڈائریکٹر اور دوسرے لوگ بہت محنت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے طریقے سوچتے ہیں۔ لیکن اصل کام اسٹنٹ مین کو کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ بہت محنت کرتا ہے۔ کئی سال تک تربیت حاصل کرتا ہے۔ پھر کہیں جا کر ان مناظر میں کام کرتا ہے۔

اسے بڑی اچھی اچھی ترکیبیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ آیئے ہم اس سے پوچھ کر چند ترکیبیں آپ کو بھی بتاتے ہیں۔

آپ نے فلم میں یا ٹی وی پر دیکھا ہو گا کہ کاریں اچانک الٹ جاتی ہیں اور قلابازیاں کھاتی ہوئی کئی گز تک چلی جاتی ہیں۔ آپ نے سوچا ہے کہ کار کو اپنی مرضی سے کیسے الٹایا جا سکتا ہے۔ اسٹنٹ مین بتا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم کار میں دروازے کے نزدیک ایک ٹیوب لگا دیتے ہیں جس کا رخ نیچے زمین کی طرف ہوتا ہے۔ جیسے آپ تصویر میں دیکھ رہے ہیں۔ اس ٹیوب کے ساتھ ہی ایسا آلہ ہوتا ہے جس کے ذریعے اس ٹیوب کو بہت طاقت سے دھکا دیا جا سکتا ہے۔ جب بھی کار کو الٹنا

ہوتا ہے۔ یہ آلہ ٹیوب کو پوری طاقت سے کار کے نچلے حصے سے باہر دھکیل دیتا ہے۔ ٹیوب اتنی طاقت سے باہر نکلتی ہے کہ کار اس کے دھکے سے دوسری طرف تیزی سے الٹ کر قلابازیاں کھاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ فلموں میں لوگ قلابازیاں کھاتے ہوئے ادھر سے ادھر گرتے ہیں۔ یہ کیسے ہو جاتا ہے۔ اسٹنٹ مین سے پوچھیں تو وہ ہنس دے گا۔ بھئی اصل میں ایک خاص طرح کا آلہ ہوتا ہے جس میں اسپرنگ سے لگے ہوتے ہیں۔ اور انہیں اس طرح نصب کیا گیا ہوتا ہے کہ جیسے ہی اس آلے کے اوپر کسی کا پاؤں پڑے وہ اسپرنگ پوری طرح کھل جائیں ہوا کے دباؤ سے اور پھر جس آدمی کا پاؤں پڑتا ہے وہ کئی قلابازیاں کھا جاتا ہے۔ یہی ہوتا ہے کہ جہاں لڑائی دکھانی ہو وہاں جا بجا ایسے آلے نصب کر دیئے جاتے ہیں اور لوگ قلابازیاں کھاتے رہتے ہیں۔ ہے نا مزے کی بات۔

فلموں میں بعض دفعہ کپڑوں میں آگ بھی لگ جاتی ہے، بہت زبردست۔ لیکن ظاہر ہے کوئی جلتا تو نہیں ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک خاص طرح کی کریم ہوتی ہے جسے اگر آپ چہرے اور ہاتھ پیروں پر مل لیں تو آگ سے آپ کے ہاتھ پیر نہیں بلکہ وہ کریم جلتی رہتی ہے۔ کریم تقریباً تیس سیکنڈ جل سکتی ہے اس کے بعد ہاتھ پاؤں جلنے کی باری آتی ہے لیکن سین تو اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔

بہت بلندی سے گرتے ہوئے آدمی کو دکھانے کے لئے اس کی کمر سے بہت باریک سا تار باندھ دیا جاتا ہے۔۔۔اور تار اوپر ایک چرخی سے لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ چرخی کو تیز یا آہستہ چلانے کے لئے بھی خاص طریقہ ہوتا ہے۔ پھر آدمی گرتا تو ہے لیکن بہت آہستہ آہستہ فلم تیز چلا کر اسے بہت تیزی سے گرتا ہوا دکھا دیا جاتا ہے۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ جہاں گرنا ہو وہاں ایسے بڑے بڑے بیگ رکھ دیئے جاتے ہیں جن میں ہوا بھری ہوئی ہوتی ہے اور گرنے سے چوٹ نہیں لگتی۔

ان سب طریقوں کے لئے اسٹنٹ مین خوب سوچتے ہیں، مشق کرتے ہیں جب کہیں جا کر آپ فلموں میں یہ مناظر دیکھ سکتے ہیں۔

ایک اور فلم میں جس کا نام The Fugitive (مفرور) تھا ایک ٹرین اور بس کا حادثہ دکھایا گیا۔ اور یہ حادثہ واقعی کیا بھی گیا۔ جس وقت حادثہ ہوا تو اسٹنٹ مین بالکل نزدیک کھڑا تھا اصل ہیرو کے بدلے اسے کھڑا کیا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بچ نہیں سکے گا۔ لیکن شوٹنگ کے بعد دیکھا گیا تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ زندہ سلامت۔ ہم حیران رہ گئے۔ اس سے پوچھا۔ یہ کس طرح ممکن ہوا؟ آپ کو معلوم ہے کیا ہوا۔ وہ مسکرایا، کہنے لگا۔ یہ راز کی بات تو ہم نہیں بتا سکتے۔ ہم تو نہیں سمجھ سکے آپ ہی سوچئے ایسا کیسے ہوا ہو گا۔

۶ ستمبر

عالم شفیع ہمدم

ملا کر قدم ضو بڑھاتے چلیں گے
جہاں رات ہوگی مٹاتے چلیں گے
دل و جاں ترنم، تکلّم، تبسّم
وطن پہ سبھی کچھ لٹاتے چلیں گے
مجاہد کسی سے بھی ڈرتے نہیں ہیں
اَجل سے بھی آنکھیں ملاتے چلیں گے
بجھا کر جہاں سے دیا کفر و شر کا
صداقت کی شمعیں جلاتے چلیں گے
شجاعت سے ہمت سے دانش سے اپنی
غنیم وطن کو مٹاتے چلیں گے
مٹا کر رعونت زمانے سے ہمدم
اخوّت کا ڈنکا بجاتے چلیں گے

اندھے نے چڑیا پکڑی

ترجمہ: آصف فرخی

ایک نوجوان آدمی کی شادی ایسی لڑکی سے ہوئی، جس کا بھائی اندھا تھا۔ وہ نوجوان چاہتا تھا کہ اپنی بیوی کے بھائی سے پکی دوستی قائم کر سکے، اس لئے اس نے اسے اپنے ساتھ شکار پر چلنے کی دعوت دی۔

"میں دیکھ نہیں سکتا۔" اندھے نے کہا۔ "لیکن تم میری مدد کر سکتے ہو۔ چلو چلیں۔"

نوجوان، اندھے کا ہاتھ پکڑ کر جنگل میں لے گیا۔ پہلے پہل تو وہ مانوس راستے پر چلتے رہے اور اندھے کے لئے بھی آسان تھا کہ اپنے بہنوئی کے پیچھے پیچھے چلتا رہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ یہاں درختوں کی شاخیں مل گئی تھیں اور جانوروں کے چھپنے کے لئے بہت سی جگہیں تھیں۔ اندھا اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑے رہا اور جو آوازیں وہ سن سکتا تھا ان کے بارے میں بتاتا رہا وہ دیکھ نہیں سکتا تھا، اس لئے اس کے سننے کی قوت بڑھی ہوئی تھی اور وہ بڑی آسانی سے جنگلی جانوروں کی آوازوں کا مطلب بتا سکتا تھا۔

"اس طرف جنگلی سور ہیں۔" وہ کہتا۔ "مجھے ان کی آواز آ رہی ہے۔"

"وہ چڑیا اڑنے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس کے پر کھلنے کی آواز سنو۔" اس کے بہنوئی کے لئے یہ آوازیں بے معنی تھی اور وہ اندھے کی اس صلاحیت سے بہت متاثر ہوا کہ آوازوں کے ذریعے جنگل کو سمجھ سکتا ہے حالانکہ یہ سب کچھ اس کے لئے ایک بڑی تاریکی کے سوا کچھ نہ ہو گا۔

وہ دونوں کئی گھنٹے تک چلتے رہے پھر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں چڑیاں پکڑنے کا جال بچھایا جا سکتا تھا۔ اندھے نے اپنے بہنوئی کے مشورے پر عمل کیا اور جال وہاں بچھایا جس جگہ چڑیاں پانی پینے آتی ہیں اس کے بہنوئی نے اس سے ذرا فاصلے پر اپنا جال بچھا دیا، لیکن پہلے اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ اس جال کو چھپا دیا تاکہ چڑیوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ یہاں جال بچھا ہے اندھے کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا جال یوں ہی سامنے پڑا ہے اور چڑیوں کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ یہ جال ہے۔

اگلے دن وہ دونوں اس جگہ واپس آئے اندھا آدمی یہ سوچ کر اس کے جال میں چڑیا پھنسی ہوگی اس قدر خوش تھا کہ اس کے ساتھی نے اسے ڈانٹ کر چپ کرایا۔ "چپ رہو، ورنہ جانور ڈر کر بھاگ جائیں گے۔"

اندھا آدمی خاموش ہو گیا۔ جال کی جگہ پہنچنے سے پہلے ہی اندھے آدمی کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے جال میں کچھ پھنسا ہے۔

"چڑیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔" اس نے کہا۔ "جال میں چڑیاں پھنس گئی ہیں۔"

وہ جال کی طرف پہنچے تو نوجوان نے دیکھا کہ اس کے جال میں ایک چھوٹی سی چڑیا پھنسی ہے۔ نوجوان نے جال میں سے چڑیا کو نکال کر اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔ پھر وہ دونوں اندھے کے جال کی طرف گئے۔

"اس میں بھی چڑیا ہے۔" نوجوان نے اندھے سے کہا۔ "تم نے بھی چڑیا پکڑ لی ہے۔"

لیکن یہ کہتے کہتے وہ جل کر رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ اندھے کے جال میں جو چڑیا پھنسی ہے وہ رنگ برنگی ہے۔ بلکہ اس کے پروں پر اتنے رنگ ہیں جیسے وہ دھنک میں سے اڑتی ہوئی آئی ہو اور دھنک کے سارے رنگ اس کے پروں پر لگ گئے ہوں۔ مگر اندھے آدمی کی بھی تو بیوی تھی۔ وہ ضرور چاہے گا کہ اس کے لئے لے جائے۔

نوجوان نیچے جھکا اور اندھے کے جال میں سے چڑیا نکال لی۔ پھر اس کی جگہ اپنے تھیلے میں سے چڑیا نکال کر اسے دے دی اور وہ رنگ برنگی دھنک جیسے پروں والی چڑیا اپنے تھیلے میں ڈال لی۔

یہ رہی تمہاری چڑیا۔" اس نے اندھے آدمی سے کہا۔ "اسے اپنے تھیلے میں رکھ لو۔"

"اندھے نے ہاتھ بڑھا کر چڑیا پکڑ لی۔ ایک لمحے کے لئے وہ اس چڑیا کو پکڑے رہا، اس کے

جواہر پارے

نوشابہ اکرم، رحیم یار خان

○ — پرانے کوٹ سے کام چل جائے گا چند نئی کتابیں خرید لیجئے۔

(آسٹن فلپ)

○ — پستی کو حقیر مت جانو اس نے بلندی کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔

(رسکن)

○ — کیچڑ مت اچھالو۔ دوسرے اس سے آلودہ ہوں یا نہ ہوں تمہارے ہاتھ ضرور آلودہ ہوں گے۔

(جوزف پرکر)

○ — اگر آپ ایک (POUND) پر ہی مطمئن ہو جائیں تو ایک ٹن کبھی بھی حاصل نہیں کر سکتے

(برن ولیمنہ)

پروں پر انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر کچھ کہے بغیر چڑیا کو تھیلے میں ڈال لیا۔ اور وہ دونوں گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

راستے میں وہ دونوں ایک درخت کی چھاؤں میں ستانے کے لئے رکے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ دنیا جہاں کی باتیں کرتے رہے۔ نوجوان، اندھے آدمی کی عقل مندی سے بڑا متاثر ہوا اسے اندازہ ہوا وہ دیکھ نہیں سکتا لیکن دنیا کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔

"لوگ ایک دوسرے سے لڑتے کیوں ہیں؟" نوجوان نے اندھے آدمی سے پوچھا۔ یہ سوال اکثر اسے پریشان کرتا رہتا تھا وہ سوچنے لگا کہ یہ اتنا عقل مند ہے تو شاید یہی اس کا جواب دے دے۔

اندھے آدمی نے کچھ دیر تک کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن نوجوان کو اندازہ ہو گیا کہ وہ سوچ رہا ہے۔ پھر اندھے آدمی نے سر اٹھایا اور نوجوان کو محسوس ہوا کہ جیسے اس کی دیکھ نہ سکنے والی آنکھیں اس کی روح میں جھانک رہی ہیں۔ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"لوگ اس لئے لڑتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ویسا سلوک کرتے ہیں جیسا تم نے میرے ساتھ کیا ہے۔"

اس بات سے نوجوان شرمندہ ہو گیا۔ اس نے جواب دینا چاہا مگر اس کی سمجھ میں کوئی جواب نہ آیا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور تھیلے میں سے رنگ برنگی چڑیا نکال کر اندھے آدمی کے حوالے کر دی۔

اندھے آدمی نے چڑیا کو چھو کر دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"ہاں ایک سوال اور ہے۔" نوجوان نے کہا۔ "ایک دفعہ لڑنے کے بعد لوگ دوست کیسے بنتے ہیں؟"

"جو تم نے کیا ہے، اس کے بعد دوست بن سکتے ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

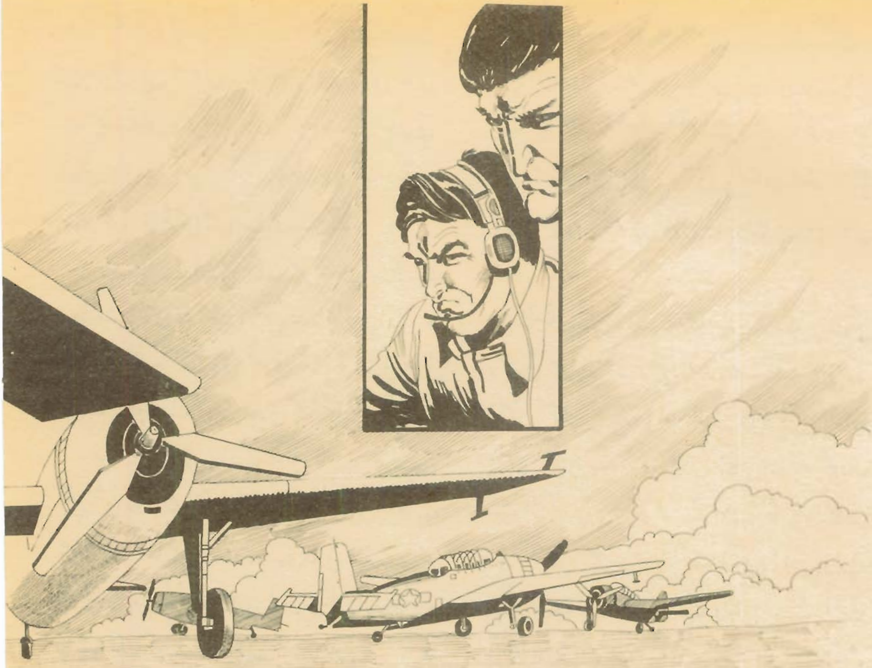

فضائیہ کا شاہین

ظہور الدین بٹ

سال ۱۹۶۵ کا تھا اور رات پانچ اور چھ ستمبر کی درمیانی۔ پاکستان کے دشمن بھارت نے رات کے اندھیرے میں اس وقت حملہ کیا جب پاکستانی میٹھی نیند سو رہے تھے۔ بھارت اس وقت پاکستان سے دس گنا بڑا ملک تھا۔ اس کے پاس جدید اسلحہ تھا اور اس کے مقابلے میں پاکستان کا اسلحہ پرانا اور فرسودہ تھا۔ یہی حال ہوائی اور بحری جہازوں کا تھا لیکن مسلمانوں نے ایمان اور جذبہ شہادت سے ایسی جنگ لڑی جس سے ساری دنیا پر پاکستانی افواج کی دھاک بیٹھ گئی۔

اسکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیق ان شہیدوں میں نمایاں ہیں جنھوں نے قوم کو ہندوؤں کی غلامی سے بچانے اور وطن کی آبرو کے لئے اپنی جان کی قربانی دی۔ آپ مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے شہر راج شاہی میں پیدا ہوئے تھے۔

انہوں نے فضائی جنگ میں سب سے پہلے چھمب میں دو بھارتی جنگی جہاز "ویمپائر" مار گرائے تھے۔ انہیں ٦ ستمبر کی شام کو بھارتی ہوائی اڈے "ہلواڑے" پر بمباری کا مشن سونپا گیا۔

یہ منظر ہلواڑے کے ہوائی اڈے کا ہے۔ آپریشن روم میں آپریٹر ریڈار پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ فضا میں اڑتے ہوئے بھارتی طیارے ہنٹر مانوس دھبوں کی شکل میں ریڈار پر نظر آرہے تھے یکایک ایک گوشے میں ایک غیر مانوس دھبہ بڑا ہوتا جارہا ہے۔ آپریٹر نے پہچان لیا۔ یہ پاک فضائیہ کا سٹار فائیٹر ایف ۱۰۴ تھا۔ اسے دیکھتے ہی خطرے کا سائرن بجا دیا گیا طیارہ شکن توپوں کو اس خطرے سے نپٹنے کی ہدایت دی جارہی تھیں لیکن یہ کیا؟ آپریٹر نے حیرانی سے ریڈار کی طرف دیکھا۔ پاکستانی جہاز واپس جارہا تھا۔ "شکر ہے بلا ٹلی۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر اس وقت وہ ہوائی اڈے پر حملہ کر دیتے تو وہاں پر موجود پندرہ سولہ ہنٹروں کو یوں نشانہ بنا سکتا تھا جیسے پانی کی سطح پر تیرتی ہوئی بطخوں کو۔

دن بھر کا تھکا ماندہ زرد سورج مغرب میں ڈوبتا جارہا تھا۔ اس کی زرد کرنیں ہلواڑے کے ہوائی اڈے پر الوداعی نظریں ڈال رہی تھیں۔ آپریشن روم کی گھڑی نے ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن ٹن کر کے چھ بجائے اچانک فضا میں غیر مانوس سی بھنبھناہٹ سنائی دی۔ "کیا پاکستانی جہاز آپہنچے ہیں؟ وہاں بیٹھے ہر بھارتی کی زبان پر یہی سوال تھا۔"

یقیناً یہ تین سیبر جٹ طیارے تھے۔ ان کی رہنمائی سرفراز احمد رفیق کررہے تھے۔ ان کے ساتھ سہیل چوہدری اور فلائیٹ لیفٹیننٹ خواجہ یونس حسین تھے۔ یہ تینوں جنگی جہاز سرگودھا سے اڑ کر نیچی پرواز کرتے ہوئے آئے تھے۔ ریڈار انہیں نہیں دیکھ پایا تھا۔ انہیں آدم پور کے ہوائی اڈے پر حملہ کر کے واپس جانے والے پاکستانی جہازوں نے فضا میں موجود بھارتی جہازوں کے بارے میں بتلا دیا تھا خطرے کا الارم بجتے ہی بھارتی شہروں اور ہلواڑے کے ہوائی اڈہ پر تاریکی چھا گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستانی شہبازوں کو اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ انہوں نے ہوائی اڈے کے گرد کئی چکر لگائے اور پھر واپسی کا ارادہ کر لیا اچانک ان پر دس بھارتی ہنٹر جھپٹ پڑے۔

سرفراز رفیق نے چلاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو پٹرول کی فالتو ٹنکیاں گراتے کا حکم دیا۔ سب نے ایسا ہی کیا مگر خواجہ یونس کے پٹرول کی ٹنکیاں جہاز سے جدا نہ ہوسکیں۔ رفیق نے دو ہنٹروں کو تاکا اور ان کے عقب میں جا پہنچے

ان کے عقب کی نگرانی سہیل چوہدری کر رہے تھے اچانک دشمن کا نمبر دو اپنے قائد سے جدا ہو گیا اور دائیں جانب گھوم گیا۔ یونس اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر اس کے پیچھے لگ گئے۔

رفیق نے دشمن کے قائد جہاز کو زد میں لیا اور اپنی مشین گنوں کے بٹن دبائے۔ سیبر کی گولیاں ہنٹر کو چھلنی کر گئیں ہنٹر اپنی ہی فضا میں پھٹ گیا اتنے میں سہیل نے دو ہنٹروں کو آتے دیکھا تو سرفراز کو اطلاع دی۔ سرفراز نے سہیل کو ان پر حملہ کرنے کو کہا اور خود قلا بازیاں کھاتے ہوئے ہنٹروں کے عقب میں پہنچ گئے۔ اتنی دیر میں فضا بھارتی طیاروں سے یوں بھر گئی جیسے مکھیاں ہوں۔

سہیل نے اپنے قائد کو ان کے بارے میں اطلاع دی تو ان کے منہ سے اچانک نکلا "ہم انہیں چن چن کر ماریں گے" ایسی بے مثال جرأت کا مظاہرہ بھی سرفراز رفیق کے سوا کون کر سکتا تھا؟ انہوں نے اپنی مشین گنوں کے بٹن دبائے مگر یہ کیا؟ گنیں کام نہیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے بار بار بٹن دبائے مگر بے سود ان کی گنیں جام ہو چکی تھیں انہوں نے واپس جانے کے بجائے سہیل کو بتایا کہ ان کی گنیں کام نہیں کر رہیں لہٰذا وہ اس کی جگہ پہنچ جائے۔

سہیل چوہدری قائد کے حکم پر ایک ہنٹر کے پیچھے لگ گئے۔ ہنٹر نے انہیں چکر دینے کی کوشش کی مگر وہ اس کے پیچھے لگے رہے۔ یکایک ان کی گنیں گرجیں اور دشمن کے طیارے کو آگ لگ گئی۔ اب انہوں نے مزید دو ہنٹروں کو جا لیا۔ ہنٹروں نے سہیل سے بچنے کی کوشش کی مگر وہ ان کے پیچھے لگے رہے۔ یکایک ان کی گنیں گرجیں اور دشمن کے طیارے کو آگ لگ گئی۔ اب انہوں نے مزید دو ہنٹروں کو جالیا۔ ہنٹر سہیل سے بچنے کی کوشش میں نیچے ہی نیچے جاتے رہے مگر سہیل ان کے عقب میں تھے۔ اس دوران انہوں نے ایک ہنٹر مزید مار گرایا۔ دوسرا ہنٹر یوں غائب ہو گیا گویا اسے زمین نگل گئی۔ شاید وہ سہیل سے بچنے کے خوف میں زمین سے جا ٹکرایا تھا۔

اس دوران یونس حسین ایک ہنٹر کا تعاقب کر رہے تھے۔ اول تو سیبر کا ہنٹر سے کیا مقابلہ؟ دوسرے پیٹرول کی بھری ہوئی ٹنکیاں بھی ان کے لئے پریشانی کا باعث تھیں مگر وہ بھی پاکستانی شہباز تھے۔ انہوں نے ایک ہنٹر کو جالیا پھر فضا میں نارنجی رنگ کا شعلہ لپکا اور ہنٹر کو آگ لگ گئی۔

سہیل چوہدری نے بہت دیر تک اپنے قائد کی آواز نہ سنی تو انہوں نے وائرلیس پر رابطے کی کوشش کی۔ لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ سہیل کو یاد آیا انہوں نے تھوڑی دیر پہلے ایک دھماکہ سنا تھا۔ اس وقت وہ اپنا طیارہ تیزی سے موڑ رہے تھے۔ انہوں نے مڑتے ہوئے دیکھا تو دو ہنٹروں کو قریب سے گزرتے ہوئے پایا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان طیاروں نے ان کے قائد کو گھیر لیا ہے۔ وہ چار ہنٹر طیاروں

جواہر پارے

مرسلہ...... مدثرہ، حیدر آباد

○ انسان برسوں میں جوان ہوتا ہے لیکن اگر اپنے وقت کو بہترین طریقے سے استعمال کرے تو وہ گھنٹوں میں بوڑھا یعنی تجربہ کار ہو جاتا ہے۔

(فیثا غورس)

○ انا کے مضبوط ترین خول کو ہمیشہ محبت توڑتی ہے۔

(جبران)

○ لوگ اونچے پہاڑوں پر سے نہیں بلکہ اکثر کنکریوں سے پھسلتے ہیں۔ (کنفیوشس)

○ ہم اکثر و بیشتر غلطیاں کرتے ہیں اور اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ غلطی کسی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گئی ہے۔ حالانکہ وہ دروازے پر بیٹھی ہوتی ہے۔

(برناڈ شا)

کے نرغے میں تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اچانک ان کی نظر اسلحہ اور ایندھن کی طرف گئی تو وہ ختم ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کیا اور وطن کی طرف پرواز شروع کر دی۔

چاروں ہنٹر ان کے پیچھے سائے کی طرح لگے ہوئے تھے۔ تب سہیل اپنے طیارے کو نیچے لے گئے۔ ایسے لگتا تھا جیسے ان کا طیارہ درختوں پر پھسلتا چلا گیا ہو۔ ہنٹر ان کے پیچھے نیچائی پر آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ شاید ان کا پیٹرول ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ واپس چلے گئے۔

سہیل چوہدری میدان جنگ سے واپسی پر سوچ رہے تھے کہ سرفراز رفیقی نے کنیں جام ہونے پر واپسی کے بجائے اپنے ساتھیوں کا عقب سے تحفظ کیا۔ وہ چاہتے تو واپس بھی جا سکتے تھے لیکن انہوں نے موت کو لڑنے پر ترجیح دی۔ تو کیا وہ دوستوں پر قربان ہو گئے؟

بے شک سرفراز رفیقی شہید اپنے انجام سے باخبر تھے۔ مگر انہوں نے موت سے منہ نہ موڑا۔ دشمن نے انہیں تنہا پاکر مار گرایا مگر ان کی قربانی رائیگاں نہ گئی۔ ان کے ساتھیوں نے دشمن کے مزید تین طیارے مار گرائے۔ انہوں نے جان کی قربانی دے کر ایسی روایت قائم کی جس نے فضائی معرکوں کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا۔

ان کی حاضر دماغی، بے مثال قیادت اور بہادری سے متاثر ہو کر انہیں شہادت کے بعد ہلال جرأت اور ستارۂ جرأت کے اعزاز سے نوازا گیا۔ آپ پاک افواج کے پہلے سپاہی ہیں جنہیں بیک وقت دو اعزاز عطا کئے گئے۔ آیئے ہم اپنے شہیدوں کو آج کے دن سلام اور نذرانۂ عقیدت پیش کریں جنہوں نے اپنے لہو سے ہماری تاریخ کے روشن باب لکھے۔ اللہ تعالیٰ تا قیامت ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ہمیں آزادی جیسی نعمت کی حفاظت کرنا سکھائے۔ "آمین!"

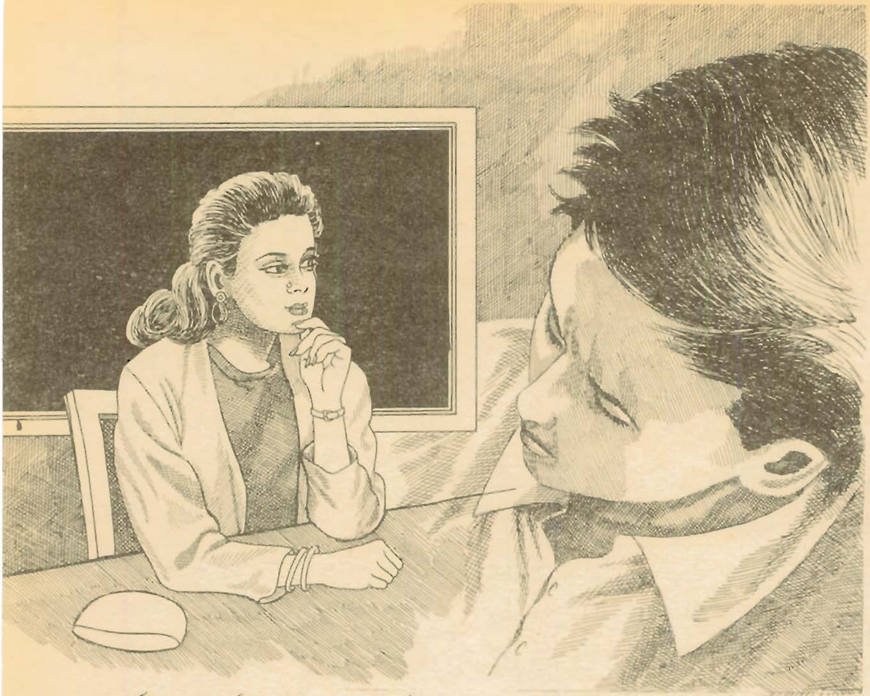

مِس نے مجھے ٹھیک کر دیا

غلام رضا جعفری

میں بہت شریر تھا۔ شریر ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا بدتمیز بھی۔ لوگ مجھے شیطان کہا کرتے۔ میں شیطانوں کا شیطان تھا۔ پورا اسکول میری کارستانیوں سے تنگ تھا۔ لڑکوں کی چڑیں رکھنے کے ساتھ ساتھ میں استادوں کی چڑیں بھی بنا دیتا جو پورے اسکول میں مشہور ہو جاتیں۔ لڑکوں کے ساتھ ساتھ استاد بھی میری حرکتوں سے پناہ مانگتے تھے۔

پڑھائی لکھائی پر توجہ دینے کے بجائے میں نت نئی شیطانی ترکیبیں ایجاد کرتا اور پھر میری یہ "ایجادات" تہلکہ مچا دیتیں۔

پرنسپل صاحب تک کئی بار میری کارستانیوں کی شکائتیں پہنچائی گئیں اور انھوں نے شکائیتوں کا پلندا ابا جان تک بھی پہنچایا لیکن ابا جان ہنس کر ٹال گئے۔ کیوں کہ جو شرارتیں میں نے کی تھیں وہ تھیں ہی ایسی کہ ان کی بھی ہنسی چھوٹ گئی تھی، حالاں کہ وہ سخت مزاج تھے۔ ابو اس لئے ہنس کر ٹال گئے

تھے کہ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

پرنسپل صاحب ابو کے بچپن کے دوست تھے۔ ان کی اور ابو کی بہت اچھی دوستی تھی جسکی وجہ سے میرا نام نہیں کٹا تھا۔ اگر پرنسپل صاحب ابو کے دوست نہ ہوتے تو کب کا میرا نام کاٹ چکے ہوتے۔

لڑکوں کی ڈیسکوں میں مُردہ لال بیگ، مُردہ چھپکلیاں اور زندہ مینڈک رکھ دینا تو معمولی شرارتیں تھیں میں اس سے بڑی بڑی کارروائیاں بھی کرتا جسے لوگ شیطانی کارستانیوں کا نام دیتے۔ ان شیطانی کارستانیوں کا ذکر یہاں کرنا مناسب نہ ہو گا۔

فارسی کے جو استاد تھے ان کا نام آخوندی تھا۔ میں نے انہیں ایک بار "شکر قندی" کہہ دیا۔ بس جی کچھ ہی دن میں وہ پورے اسکول میں اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ کبھی کبھی تو پرنسپل صاحب کے منہ سے بھی بے خیالی میں نکل جاتا "شکر قندی صاحب! آپ خیریت سے تو ہیں نا؟" اسی طرح ایک اور استاد تھے جو ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ وہ اتنے تیز لہجے میں باتیں کرتے تھے کہ ان کے منہ سے تھوک اُڑتا تھا۔ ان کا نام میں نے "فوارہ" رکھ دیا تھا۔ وہ بھی پورے اسکول میں اسی نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ اسی طرح اور بھی استاد تھے جن کو مختلف القاب میں نے دیئے تھے اور وہ مشہور ہو گئے تھے۔

آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ کتنا بدتمیز ہے استادوں کا مذاق اُڑاتا ہے اور پھر فخریہ انداز میں اسے بتا بھی رہا ہے ...... یہ بات نہیں۔ استاد تو بہت احترام کے قابل ہوتے ہیں۔ وہی تو ہمیں سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔ وہ ہمیں ایسی روشنی دیتے ہیں جو ساری زندگی کام آتی ہے۔

اسکول میں استاد جو روشنیاں دیتے تھے میں انہیں فیوز کر دیتا تھا۔ استاد جب شرارتوں پر مجھے مُرغا بناتے تو میں بانگ دینے لگتا اور جب کان کھینچے جاتے تو کہتا "جناب! کیا کن کھڑا بنائیں گے مجھے؟" استاد یہ جملہ سُن کر ایک دم ہنس پڑتے اور سزا سے میری جاں بخشی ہو جاتی۔

انہی دنوں جب کہ میری شرارتیں اور شیطانی کارستانیوں عروج پر تھیں اور شیطان بھی پناہ مانگ رہا تھا تو ایک نئی مس ہمارے اسکول میں آئیں...... دبلی پتلی گوری سی۔ پہلی دفعہ جب میں نے انہیں دیکھا تو ان کی لمبی چٹیا ہی نظر آئی پھر جب وہ ہماری کلاس میں آئیں تو پتہ چلا کہ آج سے وہ ہمیں اردو پڑھائیں گی۔ پہلے ہی دن انہوں نے تعارفی کلاس لی سب سے پہلے اپنا تعارف کرایا کہ وہ مس امینہ ہیں پھر تمام کلاس سے تعارف حاصل کیا۔ دھیما دھیما لہجہ اور ہر ایک سے بہت پیار بھرے انداز میں بات کرنا سب کو اچھا لگا۔ جماعت کے طالب علم تو پہلے ہی دن سے مس کے فین ہو گئے لیکن میں "پیڈسٹل فین" بن گیا اور پہلے دن ہی جب لڑکے اپنا تعارف مکمل کرا رہے تھے تو میں بیچ بیچ میں لُقمے دیتا رہا جس پر کلاس میں دبے دبے قہقہے نکلتے رہے مثلاً جب راشد نے کھڑے ہو کر کہا "میرا نام راشد ہے" تو میں نے کھڑے ہو کر ایک دم سے

کہا "اور مس انہیں "نزلہ" بھی کہتے ہیں کیوں کہ ان کی ناک چوبیس گھنٹے بہتی رہتی ہے۔"

"آپ بیٹھ جایئے میں نے آپ سے نہیں پوچھا ہے۔"

مس نے کہا لیکن ان کا لہجہ سخت نہیں تھا۔ میری ہمت بڑھ گئی جب موٹا عرفان اپنا تعارف کرانے لگا تو میں نے بیچ میں کہا "مس! ان کا نام عرفان نہیں "زلزلہ" ہے۔ اس پر ساری کلاس ہنس پڑی۔

"پلیز! آپ بیچ میں نہ بولیں۔" اس بار مس نے گھوم کر مجھ سے کہا اور میں جلدی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ طالب علموں سے تعارف حاصل کرنے کے دوران مس کو میں پریشان کرتا رہا۔ وہ گفتگو کے دوران بار بار رک جاتیں کیوں کہ میرا کوئی شوخ جملہ فضا میں بکھر جاتا اور لڑکوں کے دبے دبے قہقہے۔

میرے بار بار بولنے کے دوران ایک موقع پر مس کوئی بات کہتے کہتے رک گئیں پھر بولیں۔

"پتہ نہیں کیا کہنا چاہ رہی تھی......؟"

مس کی یہ بات سن کر میں ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔ "مس! ایک بات کہوں ......!!" میں نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"کہو!" مس گڑ بڑا کر بولیں۔ "مس! آپ بادام کھایا کریں کیوں کہ آپ کا حافظہ......

"میرا تو حافظہ ہی خراب ہے لیکن آپ کا دماغ ...... لگتا ہے اس میں سیروں کے حساب سے بھوسہ بھرا ہے۔" مس نے میری بات کاٹ کر کہا تو ساری کلاس ہنسنے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کو کسی استاد کے اس طرح کہنے پر لڑکے مجھ پر ہنسے تھے۔ لڑکوں کو مجھ پر ہنستا دیکھ کر مس نے کہا "خاموش!" تمام کلاس خاموش ہو گئی تو مس نے مجھ سے کہا۔

"تمہارا نام ہی عرفان ہے ناں؟"

"ارے! آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا ...... اس کا مطلب ہے میں مشہور ہو گیا ہوں۔" میں پھر چہکنے لگا۔

"ہاں! واقعی تم تو بہت مشہور ہو گئے ہو مگر بُرے لوگوں میں۔" اتنا کہہ کر مس خاموش ہو گئیں۔ کلاس میں بھی بالکل خاموشی چھا گئی تھی اور مس کے منہ سے یہ جملہ سن کر ایک دم سے مجھے بھی ایک جھٹکا سا لگا تھا کیوں کہ آج سے پہلے کسی نے مجھے "بُرا" نہ کہا تھا۔

مس دوبارہ بولیں تو ان کا لہجہ کچھ سخت ہو گیا تھا وہ کہنے لگیں:

"شہرت ڈاکوؤں بھی ہوتی ہے اور چور اُچکوں کی بھی...... عبادت گزار لوگوں کی بھی اور ملک کو احسن طریقے سے چلانے والوں کی بھی، لوگوں کے کام آنے والوں کی بھی اور آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرنے والوں کی بھی ...... تم کون سی شہرت حاصل کرنا چاہتے ہو؟" مس میرے سر پر آ کھڑی ہوئیں۔

"کھڑے ہو جاؤ!!" ان کا لہجہ سخت تحکمانہ تھا۔ میں جو اُستادوں سے کبھی ڈرتا نہیں تھا۔ ایک دم سے ڈر کر کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا مس جو اتنی

دیر سے مجھے برداشت کر رہی تھیں اب ایک تھپّڑ لگائیں گی لیکن انہوں نے صرف اتنا کہا۔ "جو استادوں کی عزّت کرتے ہیں انہیں ہی دنیا میں عزّت ملتی ہے اور جو استادوں کا احترام نہ کریں وہ دنیا میں ہمیشہ گمنام رہتے ہیں ...... آج سے میرے دل میں تمہارے لئے کوئی عزّت نہیں!!!"

یہ کہہ کر مس نے اپنا پرس اٹھایا اور اسٹاف روم کی طرف چل دیں کیوں کہ ان کا پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج چکی تھی۔

مس کے جانے کے بعد کلاس میں کیا کچھ ہوا اور کس طرح میں چھٹی میں گھر پہنچا مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ میرے دماغ میں تو بس ایک ہی جملہ گونجتا رہا۔ "آج سے میرے دل میں تمہارے لئے کوئی عزّت نہیں ...... کوئی عزّت نہیں!!" رات بھر میں اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح جب میں سو کر اٹھا تو رونے سے سارا تکیہ گیلا ہو رہا تھا۔ میں اسکول پہنچا تو میری آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں اور طبیعت کی ساری جولانی کہیں گم ہو چکی تھی۔

میں کلاس میں داخل ہوا تو مس امینہ پیریڈ لے رہی تھیں۔

"مس میں کلاس میں آسکتا ہوں؟" بڑے دھیمے سے لہجے میں میں نے کلاس میں آنے کی اجازت مانگی۔ "آجاؤ!" مختصر سے لہجے میں مس نے کہا اور ان کے اس مختصر سے لہجے میں میرے لئے ذرا سی بھی محبّت نہ تھی۔ تب میں اپنی سیٹ پر جاکر بیٹھا نہیں۔ اسکول بیگ وہیں فرش پر رکھا۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا مس کے قریب پہنچا جو کرسی پر بیٹھی تھیں اور مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ مس کے قریب پہنچ کر بڑی آہستگی سے میں نے اپنے سر سے وہ ٹوپی اتاری جو اسکول میں تمام لڑکوں کو پہننی پڑتی تھی۔ میں نے وہ ٹوپی مس کے سامنے میز پر رکھ دی اور سر جھکا کر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میری آنکھوں میں بہت سارے آنسو آنے لگے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" مس نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مس یہ میری عزّت ہے ...... آپ چاہیں تو اسے اُٹھاکر میرے سر پر رکھ سکتی ہیں اور ...... چاہیں تو زمین پر پھینک سکتی ہیں میں آئندہ کسی کو تنگ نہیں کروں گا!!" یہ کہہ کر میں رونے لگا۔

تب مس کرسی سے اُٹھیں اپنے خوشبو والے رومال سے انہوں نے میرے گالوں پر بہنے والے آنسو پونچھ ڈالے اور پھر میز سے میری ٹوپی اُٹھا کر میرے سر پر رکھ دی۔

میں نے گردن سیدھی کی تشکّر آمیز بھیگی پلکیں اوپر اُٹھائیں تو دیکھا مس کی آنکھوں میں میرے لئے محبّت ہی محبّت تھی۔

وہ دن اور آج کا دن میں نے کبھی کسی کو بُرے نام سے نہیں پکارا۔ اور کبھی کوئی تکلیف دینے والی شرارت بھی نہیں کی ---------------- ایک مس نے مجھے ٹھیک جو کر دیا تھا!!!

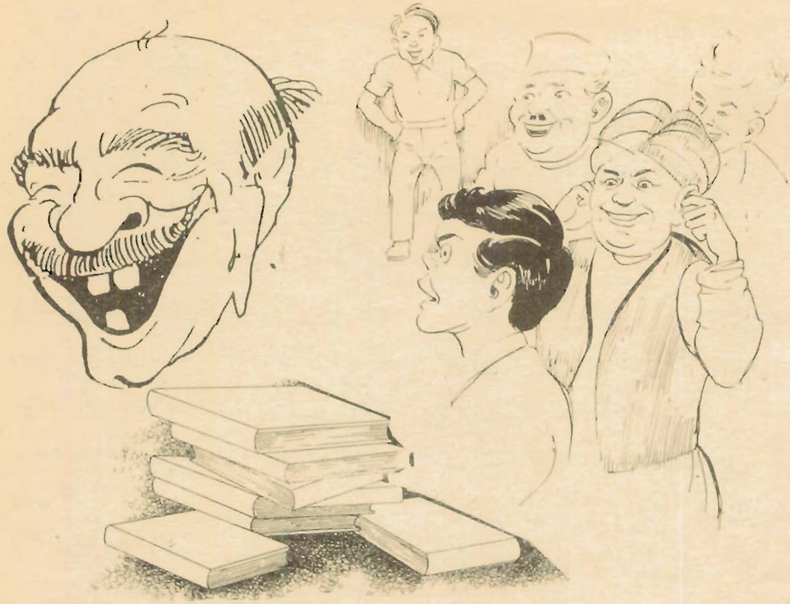

ہنسو کہ زندگی ہے یہی

نائلہ بختیار

(۱) باغی مسلمان

جنگ آزادی کے ختم ہونے پر انگریزوں نے باغی مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ شروع کی۔ مرزا غالب کی پنشن بند کر دی گئی تو وہ کہنے لگے۔ "کمال ہے زندگی بھر میں نے شراب پی، کبھی نماز نہ پڑھی، پتا نہیں سرکار نے مجھے "باغی مسلمانوں" میں کس طرح شامل کر دیا۔"

(۲) قوم کا شاعر

کیفی اپنے اشعار میں لطائف و ظرائف سے نہ چوکتے تھے۔ ایک دفعہ اشعار میں یہ لطیفہ بیان کیا

کل یہ شاگرد سے استاد نے جھنجلا کے کہا
تو پڑھے گا نہ کبھی، ہٹ میرا بھیجا مت کھا
کند ہے ذہن ترا، ٹھس ہے طبیعت تیری
کچھ نہ آئے گا تجھے، قوم کا شاعر بن جا

(۳) فرمائش

ایک مرتبہ بنگلہ کے مشہور شاعر قاضی نذر السلام کو پتہ چلا کہ "ڈھاکہ میونسپل کارپوریشن ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کا مجسمہ ایک پارک میں نصب کروانا چاہتی ہے، جس پر ایک لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔" قاضی نذر السلام نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ "اگر کارپوریشن یہ رقم مجھے دے دے، تو میں خود ہی اس مجسمہ کی جگہ کھڑا ہو جاؤں گا۔"

(۴) چوٹی کا شاعر

فنا نظامی کانپوری کو ایک مشاعرے میں اسٹیج سیکریٹری کنور مہندر سنگھ بیدی نے یہ کہتے ہوئے طلب کیا۔ "اب میں چوٹی کے شاعر حضرت فنا نظامی کانپوری کو دعوت دیتا ہوں۔"

فنا نظامی نے اپنی دراز ریش (داڑھی) پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "چوٹی" کے شاعر تو آپ ہیں، سردار جی! میں تو "داڑھی" کا شاعر ہوں۔" اس فقرے کا سننا تھا کہ محفلِ مشاعرہ قہقہوں سے گونج اٹھی۔

(۵) اقبالؒ کا طنز

۱۹۳۲ء میں جامعہ اسلامیہ دہلی میں ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے برطانوی حکومت پر ان الفاظ میں چوٹ کی۔ "جنگِ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مُریداس کے پاس گئے تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا سگار پی رہا ہے۔ اس سے بے کاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔

"آج کل مجھے بالکل فرصت ہے۔ کیونکہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کو سونپ رکھا ہے۔"

(۶) پیروڈی

مشہور شاعر قتیل شفائی نے ایک موقع پر کہا۔ "پیروڈی میں ایک آدھ لفظ کی ترمیم سے ہی بات پیدا کرنا چاہئے۔ عدم کا شعر ہے:

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہیں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

میں نے اس کی پیروڈی یوں کی۔

؎ شاید مجھے نکال کے کچھ کھا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آگیا ہوں میں

قتیل شفائی کے اس شعر پر تمام شاعر، ہنس پڑے۔ ایک دوسرے شاعر نے فوراً کہا۔ "قتیل صاحب آپ کا شعر ہے۔

؎ اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز کسی سودائی کی

میں نے اس کی پیروڈی یوں کی ہے

؎ اڑتے اڑتے آس کا پنچھی دور افق میں ڈوب گیا
روتے روتے بیٹھ گئی آواز قتیل شفائی کی

یہ سن کر سب شاعر زور زور سے ہنسنے لگے۔

سالہا سال سے مقبول
آپ کی اپنی ٹپال چائے
Tapal chai
ٹپال چائے
FAMILY MIXTURE
یہی ہے بس، ایک مزے کی پیالی

ایک پر تجسس کہانی جسے پڑھتے ہوئے آپ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں گی۔

آدم خور

محمد عادل منہاج

پروفیسر شجاع نے کیاریوں میں پانی ڈالنے کے بعد اپنے ہاتھ دھوئے اور باغ کے اس سرے کی طرف بڑھے جہاں میز پر چائے رکھی تھی۔ ان کی بیگم اور دس سالہ بیٹا نبیل وہاں بیٹھے ان ہی کا انتظار کر رہے تھے۔

"ختم ہو گیا آپ کا کام۔" بیگم شجاع نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی۔ آج کا کام ختم۔" پروفیسر مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"ابو! آپ نے کون سا پودا لگایا ہے۔" نبیل نے پوچھا۔

"بیٹا میں نے تربوز کا بیج بویا ہے اب جلد ہی تربوز کی بیل اگے گی پھر ہم خوب مزے لے لے کر تربوز کھایا کریں گے۔"

"تربوز کی بیل!" بیگم شجاع حیرت سے بولیں، "مگر آپ کو تو عجیب و غریب پودے

اگانے کا جنون ہے اور تربوز کی بیل تو عام سا پودا ہے۔"

"بھئی دراصل میں نے تربوز کی جین میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں ایک تو یہ کہ بیل بہت تیزی سے بڑھے اور دوسری یہ کہ تربوز بہت بڑے بڑے لگیں۔ دیکھو کہ جین کی تبدیلی کا تجربہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔"

"ابو! یہ جین کیا چیز ہے؟" نبیل نے الجھن کے عالم میں پوچھا۔

"جین۔ بھئی ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا تم یوں سمجھو کہ ہر جاندار چیز چھوٹے چھوٹے خلیوں سے مل کر بنی ہے۔ خلیہ بہت چھوٹا خوردبین سے نظر آنے والی چیز ہے۔ خلیہ کے اندر مرکزہ ہوتا ہے اور اس مرکزے کے اندر جین ہوتی ہے جس میں اس جاندار کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں مثلاً تمہارے خلئے میں جو جین ہوگی اس میں یہ معلومات ہیں کہ تم لڑکے ہو تمہارے بالوں کا رنگ کالا ہے وغیرہ وغیرہ۔" پروفیسر نے بتایا۔

"اور آپ نے تربوز کی جین میں کیا تبدیلی کی ہے؟"

"میں نے جین میں یہ معلومات دی ہیں کہ اسے بہت تیزی سے بڑھنا ہوگا اور تربوز کا سائز بہت بڑا ہوگا۔"

"خیر اب اس بحث کو ختم کریں۔ میرے تو کچھ پلے نہیں پڑا۔" بیگم شجاع بولیں۔ وہ اب چائے کے برتن سمیٹ رہی تھیں۔ "اور ہاں آپ کو یاد ہے نا کہ کل نسرین کی بیٹی کی شادی میں جانا ہے۔" وہ اچانک کوئی خیال آنے پر بولیں۔

"یاد ہے بھئی۔ حالانکہ تم جانتی ہو اس طرح میرے کام کا کتنا حرج ہوگا۔"

"کوئی حرج نہیں ہوگا۔ ایک دن پودوں پر تجربات نہ ہوئے تو قیامت نہیں آجائے گی۔ رشتے دار اسی لئے آپ سے ناراض رہتے ہیں کہ آپ بس تجربات کے ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"اچھا بابا۔ جھگڑا ختم کل کا دن پورا تمہاری بھانجی کی شادی کے لئے وقف! بس۔"

پروفیسر شجاع فجر کی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے تو نبیل دوڑتا ہوا آیا۔

"ابو۔ ابو وہ تربوز کا پودا تو نکل بھی آیا۔"

"کیا کہہ رہے ہو بھئی کل شام تو بیج بویا ہے۔ اتنی جلدی کہاں سے پودا نکل آیا!؟"

"آپ خود چل کر دیکھ لیں۔" نبیل نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"اچھا چلو۔" وہ نبیل کے ساتھ باغ میں آئے اور پھر ایک کیاری کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ وہاں واقعی پودا نکل آیا تھا بلکہ کئی انچ زمین سے نکلا ہوا تھا اور اس پر دو بڑے سے پتے بھی لہرا رہے تھے۔

"حیرت ہے۔ ایک رات میں پودا اگ بھی گیا اور اتنا بڑھ بھی گیا۔ ناقابل یقین ___ اتنی جلدی تو میں نے کوئی پودا اگتے نہیں دیکھا۔" پروفیسر

حیرت سے بولے۔
"یہ کیا۔۔ آپ پھر باغ میں ہیں۔ آپ کا وعدہ تھا کہ آج کے دن کوئی تجربہ نہیں ہو گا۔"
بیگم شجاع بھی ادھر آنکلیں۔
"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ یہ تو نبیل مجھے کھینچ لایا۔ وہ جو کل شام میں نے تربوز بویا تھا اس کا پودا نکل آیا ہے اور دیکھو کتنا بڑھ گیا ہے۔"
"اتنی جلدی۔ صرف رات رات میں۔"
بیگم شجاع نے بھی حیرت سے پودے کو دیکھا۔
"ہاں۔۔ میں خود حیران ہوں۔ اس پودے کا تو تفصیلی جائزہ لینا ہو گا۔"
"یہ جائزہ کل ہو گا۔ ابھی میں ناشتہ بناتی ہوں پھر فوراً تیار ہو جائیں اور چلنے کی کریں۔" بیگم شجاع نے گھبرا کر کہا کہ پروفیسر پھر کسی تجربے میں مشغول نہ ہو جائیں۔
نہ چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو پورا دن شادی والے گھر میں گزارنا پڑا۔ رات کو وہ اکیلے لوٹے۔ بیگم اور نبیل کا ایک دن اور وہیں رہنے کا ارادہ تھا۔ گھر پہنچے تو اتنے تھکے ہوئے تھے کہ فوراً بستر پر گر گئے پھر اگلے دن ان کی آنکھ کھلی۔ نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ باغ میں آئے۔ ان کا باغ بھی عجوبۂ روزگار تھا جہاں عجیب عجیب پودے اور درخت تھے۔ وہ اکثر پودوں کی جین میں تبدیلیاں کر کے اگاتے۔ کسی پودے میں ایک کی جگہ دو دو پھل اگتے۔ کہیں بڑے بڑے درخت منی ایچر (مختصر سائز) صورت میں اگے ہوئے تھے۔

اس وقت پروفیسر تربوز کے پودے کو دیکھنے آئے تھے۔ کیاری سے چند قدم دور ہی وہ ٹھٹھک گئے۔ تربوز کی بیل بہت لمبی ہو چکی تھی کیاری سے باہر نکل کر کافی دور تک پھیل چکی تھی۔ اور بیل صرف لمبائی میں نہیں بڑھ رہی تھی بلکہ اس کی شاخ سے کئی کئی شاخیں نکل کر اطراف میں پھیل رہی تھیں گویا وہ چاروں طرف سے بڑھ رہی تھی۔ صرف ایک دن میں اس کا اتنا بڑھ جانا پروفیسر کے لئے بہت حیرت انگیز تھا اگرچہ انہوں نے اس کی جین میں یہی تبدیلی کی تھی کہ وہ تیزی سے بڑھے مگر اتنی تیز رفتاری کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔
اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔ وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ باہر دودھ والا تھا۔ دودھ باورچی خانے میں رکھ کر وہ نکلے تو انہیں یاد آیا کہ جس تربوز کا بیج انہوں نے بویا تھا اس کے کچھ بیج لیبارٹری میں بھی رکھے ہیں۔ کیوں نہ انکا جائزہ لیا جائے۔ یہ سوچ کر وہ اپنی لیبارٹری میں داخل ہوئے۔ تربوز سے بیج نکالے اور ان کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئے۔
کافی دیر بعد انہوں نے خوردبین سے سر اٹھایا اور بڑبڑائے۔ "حیرت ہے میں نے جین میں جو تبدیلیاں کی تھیں اس میں تو کچھ اور تبدیلیاں بھی نظر آرہی ہیں۔ یہ۔۔ یہ کیسے ہوا؟" وہ پھر خوردبین پر جھک گئے۔ مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ ان کی پریشانی بڑھتی رہی ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر جین میں کس قسم کی تبدیلیاں رونما ہو گئی

ہیں۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی رہیں ......
سورج نکل کر ڈھل بھی گیا۔ اچانک گھڑی پر ان کی نظر پڑی تو وہ چونک اٹھے۔

"ارے! یہ تو شام ہو گئی۔ شکر ہے بیگم گھر پر نہیں ورنہ ناشتہ اور کھانا چھوڑنے پر خوب صلواتیں سناتی۔" وہ مسکرائے۔ پھر انہوں نے فرج سے کچھ پکی ہوئی چیزیں نکال کر کھائیں اور دوبارہ اپنے تجربے میں مصروف ہو گئے۔ یہاں تک کہ نیند سے ان کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔

"یہ ماجرا تو میری سمجھ سے باہر ہے۔ کسی سے مشورہ کرنا پڑے گا۔ خیر کل دیکھیں گے۔"

وہ لیبارٹری سے باہر نکل آئے اور کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ گئے۔

ایک اور نیا دن نکل آیا۔ پروفیسر نے سوچا کہ آج پہلے ناشتہ کر لیا جائے پھر باغ میں جانا چاہئے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باغ میں پہنچے۔ ایک بار پھر وہ چکرا گئے۔ تربوز کی بیل تو ہر طرف پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔ ہر شاخ سے کئی کئی شاخیں نکل رہی تھیں۔

"یہ تو مہینوں میں اتنی زیادہ نہیں بڑھتی جتنی ان دو تین دنوں میں بڑھ گئی ہے۔" وہ بڑبڑائے اور آگے بڑھے۔ انہیں بیل کے پتے بھی تھوڑے سے مختلف لگ رہے تھے۔ شاخوں کی رنگت بھی قدرے سیاہی مائل تھی۔ انہوں نے جھک کر ایک شاخ کو اٹھایا تو۔۔۔ دھک سے رہ گئے۔ شاخ تیزی سے ان کے بازو کے گرد لپٹ گئی تھی۔ انہیں یوں لگا جیسے کسی سانپ نے ان کے بازو کے گرد بل ڈال دیئے ہو۔ انہیں بازو میں شدید جلن اور چبھن کا احساس ہوا تو انہوں نے فوراً بازو کو جھٹکا دے کر بیل ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ تو بری طرح لپٹ گئی تھی۔ آخر انہوں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا سرا پکڑا اور تیزی سے بل کھولے۔ انہیں پورا زور صرف کرنا پڑا کیونکہ بیل بہت مزاحمت کر رہی تھی اور بازو پر چمٹی جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ بازو سے الگ ہوئی تو وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئے۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بیل کو دیکھنے لگے۔ جو کچھ ہوا تھا وہ نا قابل یقین تھا۔ ادھر بازو اور ہاتھ میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ فوراً بازو ڈاکٹر کو دکھانا چاہئے کہیں یہ بیل زہریلی نہ ہو اور بازو پر کچھ اثر نہ ہو جائے۔ وہ تیزی سے باہر نکلے۔ اتفاق سے چند گھر چھوڑ کر ان کے دوست ڈاکٹر زبیر رہتے تھے وہ انہی کے گھر کی طرف دوڑے۔

ڈاکٹر زبیر نے ان کے بازو اور ہاتھ پر مرہم لگا دیا تو بولے۔ "زہر وغیرہ کا تو کوئی خطرہ نہیں بازو بالکل ٹھیک ہے بس یوں لگتا ہے کہ کسی نے بہت ساری سرنجیں لگا کر خون نکالنے کی کوشش کی ہو۔۔۔ ویسے یہ ہوا کیسے ؟" ڈاکٹر زبیر نے پوچھا۔

"تربوز کی بیل کے ذریعے۔" پروفیسر کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولے۔

"کیا مطلب!" ڈاکٹر زبیر چونکے۔ جواب میں پروفیسر نے انہیں ساری کہانی کہہ سنائی۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو ؟ اس بیل نے تمہارا

خون چوسنے کی کوشش کی ہے!! " ڈاکٹر زبیر کا منہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

"ہاں ــ یہی بات ہے۔ میں نے افریقہ کے جنگلوں میں پائے جانے والے ایسے درختوں اور پودوں کا ذکر سنا ہے جو آدم خور ہوتے ہیں اور جب بھی کوئی انسان ان کے قریب سے گزرتا ہے وہ اسے اپنی شاخوں کے ذریعے جکڑ لیتے ہیں۔ مگر یہ تربوز کی بیل کس طرح آدم خور بن گئی۔ میں نہیں جانتا۔ "

"تم نے اس کی جین میں جو تبدیلی کی ہے لگتا ہے اس میں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ "

"ہاں ــ مگر وہ گڑبڑ میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ کل سارا دن میں جائزہ لیتا رہا۔ "

"میرا مشورہ ہے کہ اس بیل کو فوراً ختم کر دو۔ ورنہ یہ بہت خطرناک ثابت ہو گی۔ "

"ہاں شاید اب یہی کرنا پڑے۔ میں آج اور جائزہ لیتا ہوں اور اس تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں اگر یہ وجہ سمجھ میں آگئی تو بہت بڑی کامیابی ہو گی ورنہ اسے ختم کرنا ہی ہو گا۔ "

پروفیسر نے ڈاکٹر زبیر کا شکریہ ادا کیا اور واپس اپنے گھر آگئے۔

وہ باغ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر بیل کو غور سے دیکھنے لگے۔ زمین پر پڑی ہوئی اور ایک دو درختوں پر چڑھی ہوئی یہ بیل اس وقت بالکل بے ضرر نظر آرہی تھی۔

"ارے! آپ یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔ " عقب سے بیگم شجاع کی آواز گونجی۔

"تم ــ اتنی صبح صبح ہی آگئیں۔ " وہ حیرت سے بولے۔

"ہاں ــ نبیل کا دل نہیں لگ رہا تھا اس نے تو رات بھی مشکل سے گزاری ہے اس لئے میں ناشتہ کرتے ہی آگئی۔ "

"ہوں ــ نبیل ہے کہاں ؟" انہوں نے پوچھا۔

"آتے ہوئے ضد کر کے نسرین کے گھر سے ایک بکری کا بچہ لے آیا ہے۔ اسے پتے وغیرہ کھلا رہا ہو گا۔ یہ بھی کوئی نہ کوئی روگ پالے ہی رکھتا ہے۔ "

ان الفاظ کے ساتھ ہی بچے کی میں میں سنائی دی اور بکری کا بچہ اُچھلتا ہوا ادھر آتا دکھائی دیا۔

"امی پکڑیں اسے۔ " پیچھے نبیل چلاّتا ہوا آرہا تھا۔

بکری کا بچہ چھلانگیں لگاتا ہوا باغ میں گھس گیا۔ اچانک پروفیسر کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔ وہ زور سے چلاّئے۔ "رُک جاؤ نبیل! باغ میں مت گھُسنا۔ "

ان کی گرجدار آواز سن کر نبیل سہم کر رک گیا۔ پروفیسر تیزی سے بڑھے اور نبیل کو پیچھے کھینچ لیا۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو ؟" بیگم شجاع حیرت سے بولیں۔ مگر پروفیسر کی نظریں تو باغ کی طرف جمی تھیں۔ بیگم شجاع نے بھی ادھر دیکھا اور پھر ان کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ

بکری کے بچے کے گرد بیل کی شاخیں لپٹ گئی تھیں۔ بچہ اس افتاد سے گھبرا گیا اس نے اپنی ٹانگیں چھڑانے کی کوشش کی مگر شاخوں نے چاروں ٹانگوں کو بھی جکڑ لیا۔ نتیجتاً بکری کا بچہ دھڑام سے گر پڑا۔ اب شاخیں اس کے جسم اور گردن کے گرد بھی اور زیادہ تعداد میں لپٹ گئیں۔ وہ چاروں طرف سے شاخوں سے جکڑا جا چکا تھا۔ اس کے منہ سے درد ناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ "میں میں...... میں میں......" وہ بری طرح چلّا رہا تھا۔

ادھر وہ تینوں پتھرائی ہوئی نگاہوں سے اس کا انجام دیکھ رہے تھے۔ اور پھر آہستہ آہستہ اس کی آوازیں دم توڑتی چلی گئیں اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ بکری کا بچہ جو کافی تندرست و توانا تھا اب ایک مریل ساہڈیوں کا پنجر نظر آرہا تھا۔ بیل کی شاخیں اب اس کی جسم سے الگ ہونے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام شاخوں نے اس کے مُردہ جسم کو آزاد کر دیا۔

"یہ — یہ سب کیا ہے ؟ کیا میں نے کوئی خواب دیکھا ہے۔" بیگم شجاع کانپتی آواز میں بولیں۔

"نہیں! یہ حقیقت ہے۔ یہ بیل آدم خور بن گئی ہے۔" پروفیسر سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"مگر کیسے!!"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔ میں نے اس کو جین میں جو تبدیلی کی تھی لگتا ہے اس میں کوئی گڑ بڑ ہو گئی ہے۔"

"اُف میرے خدا۔ یہ آپ نے کس قسم کی تبدیلی کر ڈالی ہے۔ خدا کے واسطے اب مزید تجربات بند کریں اور اس بیل کو کسی طرح ختم کریں ورنہ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ یہ — یہ تو ہم سب کا خون پی جائے گی۔" انہوں نے خوف سے جھر جھری لی۔

"میں خود اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ بس صرف آج کا دن اور اس کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اگر کچھ سمجھ میں آگیا تو بہت اچھی بات ہو گی ورنہ اسے ختم کر دوں گا۔

تم اور نبیل بس باغ کی طرف مت آنا بلکہ اس حصے میں ہی مت آنا۔ گھر کے اندرونی حصے میں ہی رہو۔ میں اپنے ایک دوست کو فون کرتا ہوں وہ بھی نباتات کا ماہر ہے۔ مشکل یہ ہے کہ وہ دوسرے شہر میں رہتا ہے خیر میں اسے تاکید کرتا ہوں کہ فوراً آج ہی یہاں پہنچ جائے شاید اس کی سمجھ میں کچھ آجائے۔"

"جو کچھ بھی کرنا ہے فوراً کریں اور کل ہر حالت میں اس منحوس بیل کا خاتمہ کریں۔ آؤ نبیل اندر چلیں۔"

"امی — میری بکری —" نبیل کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"ہم تمہیں اور بکری لا دیں گے بیٹے! اور ہاں آج گھر کے اندر ہی رہنا ادھر بالکل مت آنا۔"

اپنے دوست کو فون کر کے پروفیسر لیبارٹری میں آگئے۔ ساری بات سن کر انکا دوست بھی

حیران رہ گیا تھا اور اس نے آج رات کی فلائٹ سے پہنچنے کو کہا تھا جو رات دو بجے پہنچنا تھی۔ پروفیسر ایک بار پھر اس بات پر غور کر رہے تھے کہ جین میں اس قسم کی تبدیلی کیونکر واقع ہوئی۔ انہوں نے افریقہ کے جنگلوں میں پائے جانے والے آدم خور پودوں کے بارے میں ایک کتاب نکالی اور پڑھنے لگے۔

بیگم شجاع باورچی خانے میں تھیں انہوں نے نبیل کو کمرے میں ہی رہنے کی ہدایت کی تھی نبیل ٹی وی آن کر کے دیکھنے لگا اس وقت ایس ٹی این کی دوپہر کی نشریات چل رہی تھی اور ایک انگریزی فلم آرہی تھی۔ نبیل فلم دیکھنے میں مگن تھا کہ اچانک ٹی وی اسکرین پر لہریں سی آنے لگیں۔ تصویر بگڑ گئی اور اوپر نیچے ہونے لگی۔ نبیل نے آگے بڑھ کر ٹی وی کے بٹن ہلائے جلائے مگر تصویر ٹھیک نہ ہوئی۔

"امی ــ ٹی وی ٹھیک نہیں چل رہا۔" وہ چلّایا۔

"کیا ہوا ــ ٹھیک کر لونا ــ" بیگم شجاع باورچی خانے سے بولیں۔

"نہیں ٹھیک ہو رہا۔" وہ پھر چلّایا۔

"اوہو ــ ایک تو تم کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔ دکھاؤ کیا ہوا ہے اسے ؟" وہ کمرے میں داخل ہوئیں اور انہوں نے بھی بٹن گھمائے۔ مگر تصویر ٹھیک نہ ہوئی۔

"کہیں انٹینا تو نہیں ہل گیا۔ ذرا دیکھ کر آؤ۔" وہ بولیں۔ نبیل دوڑتا ہوا چھت پر گیا اور پھر اس کی چیخ سنائی دی۔ "امی ــ"

بیگم شجاع گھبرا گئیں اور سیڑھیوں کی طرف دوڑیں۔ لیبارٹری میں پروفیسر نے بھی اس کی چیخ سنی۔ وہ بھی گھبرا کر باہر نکل آئے۔

"یہ نبیل کیوں چیخا تھا؟" وہ بولے۔

"پتہ نہیں وہ چھت پر ہے۔" بیگم شجاع سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولیں پروفیسر بھی ادھر دوڑے اور کئی کئی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے چھت پر پہنچے۔ وہاں نبیل اینٹینے سے کچھ دور کھڑا تھا پروفیسر اور ان کی بیگم نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ تربوز کی بیل کی ایک شاخ ایک درخت پر سے ہوتی ہوئی دیوار پر چڑھی اور پھر منڈیر سے ہوتی ہوئی ٹی وی کے اینٹینے تک پہنچ گئی تھی اور اس کا ایک سرا اینٹینے کی سلاخوں پر لپٹا ہوا تھا۔

"نبیل ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ اچانک تصویر ہلنے جلنے لگی لہریں سی آنے لگیں میں سمجھی کہ شاید اینٹینے کا رخ بدل گیا ہے مگر یہ تو اس بیل کی کارستانی ہے۔"

"حیرت ہے کیا یہ ٹی وی کی نشریات میں بھی گڑبڑ کر سکتی ہے۔" پروفیسر بولے۔

"یہ تو پتہ نہیں کیا کچھ کر سکتی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ یہ ہمارے گھر کی ہر چیز تک پہنچ جائے گی۔ میں پھر کہتی ہوں اسے فوراً ختم کر دیں۔"

"ہاں۔ ہاں بس آج کی رات اس بیل کی آخری رات ہے۔ نبیل ذرا باورچی خانے سے چھری تو اٹھا لاؤ۔"

"جی اچھا۔" وہ نیچے دوڑ گیا۔
"کک ۔۔ کیا کرنا چاہتے ہیں آپ۔" بیگم شجاع کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔
"ڈرو مت۔ کوئی خطرناک کام نہیں کر رہا۔"
اسی وقت نبیل چھری لے کر آگیا۔ پروفیسر نے اس سے چھری لی اور منڈیر کی طرف بڑھے کچھ فاصلے سے انہوں نے تیزی سے چھری کا وار بیل پر کیا۔ بیل فوراً کٹ گئی اور منڈیر سے نیچے جاگری۔ اس کا ٹوٹا ہوا سرا اینٹینے میں اٹکا جھولنے لگا اور پھر انہوں نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ اینٹینے سے لٹکے ہوئے شاخ کے سرے سے خون ٹپک رہا تھا۔
"یہ ۔۔ یہ تو خون ہے۔" نبیل خوفزدہ آواز میں بولا۔
"اس بیل میں تو انسان کی طرح خون دوڑ رہا ہے۔ شاید یہ اس بکری کا خون ہے۔" پروفیسر آگے بڑھے اور شاخ اینٹینے سے اتار لی۔ "اس کا جائزہ لینا ہوگا۔"
"میں تو ان جائزوں سے تنگ آگئی ہوں۔" بیگم شجاع بھنا کر بولیں۔
"نبیل ذرا دیکھو۔ ٹی وی ٹھیک ہوا یا نہیں؟" پروفیسر بولے۔ نبیل فوراً کمرے میں گھسا اور وہیں سے چلایا۔ "ٹھیک ہو گیا ابو۔"
"ہوں!۔" وہ سوچ میں گم ہو گئے پھر بولے۔ "اپنے کمرے ہی میں رہنا نبیل!" یہ کہہ کر وہ لیبارٹری میں گھس گئے۔

رات تک کوئی اور واقعہ پیش نہیں آیا۔ رات کا کھانا کھا کر بیگم شجاع تو نبیل کو لے کر سونے چلی گئیں۔ جبکہ پروفیسر اپنی لیبارٹری میں آگئے۔ آج ان کا سونے کا ارادہ نہیں تھا یوں بھی رات دو بجے ان کے دوست ڈاکٹر افتخار پہنچ رہے تھے۔ جو علم نباتات کے ماہر تھے۔ پروفیسر نے شاخ سے نکلنے والے خون کا معائنہ کیا تو وہ واقعی بکری کا خون تھا مگر وہ حیران تھے کہ پودوں میں تو رگیں وغیرہ نہیں ہوتیں نہ ہی دل ہوتا ہے جو خون پمپ کرتا ہے پھر اس بیل میں خون کس طرح دوڑ رہا ہے۔ ہزار سر پٹخنے کے باوجود ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تربوز کی یہ بیل ان کے لئے ایک مُعمّہ ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس مَعمّے کو حل کرنے کے خواہاں تھے ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ اس کا راز پالیں مگر وہ بھی جانتے تھے کہ ان کے پاس کل کا دن ہے پھر اس بیل کو ختم کرنا پڑے گا کیونکہ جس تیز رفتاری سے یہ بڑھ رہی تھی۔ چند دنوں میں پورے گھر میں پھیل جائے گی اور ہو سکتا ہے گھر سے باہر نکل جائے اور شہری علاقے میں ایسی آدم خور بیل کا وجود بہت خطرناک ہے کسی وقت بھی کوئی بھی اس کی زد میں آسکتا ہے۔ وہ انھی سوچوں میں گم تھے کہ ایک تیز چیخ کی آواز سُنائی دی۔ وہ اُچھل پڑے اور تیزی سے خواب گاہ کی طرف دوڑے۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک گئے۔ ان کی آنکھیں خوف

سے پھیل گئیں۔

کمرے کے روشن دان سے بیل کی ایک شاخ اندر آگھسی تھی اور نبیل کے بازو کے گرد لپٹ گئی تھی۔ بیگم شجاع نبیل کا دوسرا بازو پکڑے اسے کھینچ رہی تھیں۔ پروفیسر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تیزی سے آگے بڑھے اور کوئی پروا کئے بغیر نبیل کے بازو کے گرد لپٹی شاخ کو پکڑ لیا اور پورا زور لگا کر بیل اس کے بازو سے کھول دی۔ اس کے بازو سے الگ ہوتے ہی شاخ پروفیسر کے ہاتھ پر لپٹنے لگی مگر انہوں نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا شاخ نیچے گر پڑی۔

نبیل بیگم شجاع سے لپٹا ہوا سسک رہا تھا۔

"اب میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رک سکتی۔ یہ قاتل، خونی بیل تو ہم سب کو مار ڈالے گی مگر آپ کا تجربات کا شوق پورا نہیں ہو گا۔" وہ نبیل کو پکڑے دروازے کی طرف بڑھیں۔

"بیگم! سنو تو۔ اس وقت کہاں جا رہی ہو۔" پروفیسر گھبرا گئے۔

"میں سامنے بیگم جمال کے گھر جا رہی ہوں۔ رات وہاں گزاروں گی اور صبح ہوتے ہی نسرین کے گھر چلی جاؤں گی اور اسی وقت واپس آؤں گی جب یہ منحوس بیل یہاں نہیں ہو گی۔" وہ بولیں اور نبیل کو لے کر نکل گئیں۔ پروفیسر اپنا سر پکڑ کر رہ گئے۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو وہ تھکے تھکے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھے۔ باہر ان کے دوست ڈاکٹر افتخار تھے۔ "ہیلو پروفیسر، کیا حال ہے؟" وہ پروفیسر کو دیکھتے ہی بولے۔

"ٹھیک ہی ہوں.... آؤ۔"

یہ تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ بس ایک تربوز کی بیل سے خوفزدہ ہو گئے۔" ڈاکٹر افتخار ہنسے۔ "یہ بات نہیں افتخار! معاملہ بہت سیریس ہو چکا ہے۔"

"کیا مطلب!؟" وہ چونکے۔

"بیٹھو۔ تمہیں بتاتا ہوں۔ اس بیل نے کیا گُل کھلائے ہیں۔" وہ انہیں لیبارٹری میں ہی لے آئے اور کچھ باتیں تو فون پر بتا چکے تھے۔ اس کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ بھی سنا ڈالے۔

"ہوں۔ یہ تو واقعی خطرناک بات ہے۔ آؤ ذرا میں بھی تو دیکھوں اسے۔" پروفیسر انہیں لے کر باغ تک آئے۔ باغ میں اس وقت اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے بلب جلا دیئے۔

"بظاہر تو یہ ایک عام سی بیل نظر آ رہی ہے۔" ڈاکٹر افتخار بولے۔

"ہاں۔ دیکھنے میں تو بے ضرر سی ہے مگر حقیقتاً کتنی خطرناک ہے اس کا اندازہ تم نہیں لگا سکتے۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی پورے گھر میں اندھیرا چھا گیا۔

"ارے۔ شاید لائٹ چلی گئی۔" وہ بولے مگر ایکدم روشنی ہو گئی۔

"لو آبھی گئی۔" ڈاکٹر افتخار بولے اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ چند سیکنڈ بعد پھر بلب روشن ہو گئے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" ڈاکٹر افتخار بولے۔
"پتہ نہیں کیا چکر ہے؟" لائٹ بار بار آ اور جا رہی تھی!!
"میں مین سوئچ دیکھتا ہوں۔" پروفیسر بولے اور مین سوئچ کا جائزہ لیا مگر وہ بالکل ٹھیک تھا۔
"ارے! پروفیسر۔ وہ۔ وہ دیکھو اوپر۔" ڈاکٹر افتخار چونک کر بولے۔
پروفیسر نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سڑک پر لگے بجلی کے پول سے جو تار ان کے گھر کی طرف آ رہی تھی۔ اس تار پر بیل کی ایک شاخ لپٹی ہوئی تھی۔
"یہ بیل یہاں تک بھی پہنچ گئی۔" ڈاکٹر افتخار حیرت سے بولے۔
"اس کی تیز رفتاری پر میں خود حیران ہوں۔ ہر طرف سے اس کی شاخیں نکل نکل کر چاروں طرف پھیلتی جا رہی ہیں۔ خیر پہلے اس شاخ کو تو نیچے اتاروں ورنہ یہ لائٹ صحیح نہیں ہوگی۔" پروفیسر بولے۔ لائٹ مسلسل جل بجھ رہی تھی۔
پروفیسر نے ایک لمبا بانس لیا اور اس کے سرے پر چھری باندھ دی پھر کافی دور کھڑے ہو کر بانس تار پر بندھی شاخ پر مارا۔ چھری کا سرا شاخ پر لگا مگر شاخ کٹی نہیں انہوں نے کئی بار اسی طرح شاخ پر وار کیا آخر کار وہ کٹ کر نیچے گر پڑی اور ایک بار پھر اس میں سے خون نکلنے لگا۔
ڈاکٹر افتخار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ادھر شاخ کے گرتے ہی لائٹ ٹھیک ہو گئی تھی۔
"ناقابل یقین۔ آخر یہ بیل تاروں میں کس طرح گڑبڑ کر دیتی ہے۔"
"میں تو کچھ سمجھ نہیں سکا۔ آؤ لیبارٹری میں چلیں تم اس بیل کی شاخ کا اور بیجوں کا معائنہ کر کے دیکھ لو۔ شاید کچھ سمجھ سکو۔"
پروفیسر اور ڈاکٹر افتخار صبح تک معائنے میں مصروف رہے یہاں تک کہ سورج نکل آیا۔
"کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ تم نے تربوز کی جین میں چند تبدیلیاں کیں تاکہ بیل کی نشوونما اور پیداوار بہتر ہو۔ مگر ان تبدیلیوں کے ساتھ جین میں چند اور تبدیلیاں بھی رونما ہو گئیں بہت سے جانداروں کی جین میں خود بخود بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں مثلاً بہت سے جانور پہلے پانی میں رہتے تھے۔ پھر وہ خشکی پر رہنے لگے اور انہوں نے خود کو حالات کے مطابق تبدیل کر لیا یعنی ان کی جین میں تبدیلیاں آ گئیں۔ کہتے ہیں کہ پہلے سانپ کے پاؤں ہوتے تھے مگر وقت کے ساتھ اس کی جین میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور اب سانپ کے پاؤں نہیں ہوتے۔" ڈاکٹر افتخار بولے۔
"ہاں مگر اس قسم کی تبدیلیاں کئی سالوں میں جا کر پیدا ہوتی ہیں۔" پروفیسر بولے۔
"ہاں یہ تو ہے مگر اس پودے نے بڑی تیزی سے اپنی جین بدلی اور اس میں آدم خور پودوں والی خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ کس طرح؟ اس کا

جواب بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ اب ہمیں مزید وقت گزارے بغیر اسے ختم کر دینا چاہئے کیونکہ جس تیزی سے یہ بڑھ رہی ہے جلد ہی تمہارے گھر سے باہر نکل جائے گی اور آس پاس کے گھروں تک پھیل جائے گی۔ اور کوئی بھی اس کی زد میں آکر ہلاک ہو سکتا ہے۔"

"ہوں۔ تو پھر ٹھیک ہے اب یہ سوچو کہ اسے ختم کیسے کیا جائے ؟"

"ہاں یہ بھی مسئلہ ہے کوئی عام سی بیل ہو تو جڑ سے پکڑ کر کھینچ دو یا کلہاڑی کے ایک دو وار کر دو مگر اس کے تو قریب جانا بھی خطرناک ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اسے گیس کے ذریعے ختم کر دیں۔"

"گیس کے ذریعے!" پروفیسر بڑبڑائے۔

"ہاں جس طرح آگ لگنے پر ہم اس پر کاربن ڈائی آکسائیڈ کے جھاگ پھینکتے ہیں اس طرح اس بیل پر بھی پھینکتے ہیں ظاہر ہے پودے بھی آکسیجن سے سانس لیتے ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے ذریعے انہیں ختم کیا جا سکتا ہے۔"

"مگر یہ بیل تو پورے باغ میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہر درخت پر چڑھی ہوئی ہے۔ اگر اس پر جھاگ پھینکیں گے تو سارے درخت اور پودے بھی اس کی زد بھی آکر ختم ہو جائیں گے اور تم جانتے ہو کہ میرے باغ میں کتنے قیمتی پودے ہیں۔ سالوں کی محنت ہے ان پر۔"

"ہاں یہ بھی ہے — پھر کیا کریں —"

ڈاکٹر افتخار سوچتے ہوئے بولے۔ "ہوں — آئیڈیا — کیوں نہ اس پر لیزر (LASER) سے فائر کر کے اسے ختم کر دیا جائے۔"

"لیزر —" پروفیسر کے منہ سے نکلا۔

"بالکل — تم تو جانتے ہی ہو لیزر کتنی طاقتور شعاعیں ہیں اگر پتھر پر بھی پڑیں تو اسے جلا کر راکھ کر دیں۔ اگر ہم اس بیل کی جڑوں پر لیزر گن سے فائر کریں تو اس کی جڑیں جل کر راکھ ہو جائیں گی اور جب پودے کی جڑیں ختم تو پودا بھی ختم!"

"بات تو ٹھیک ہے مگر لیزر کا بندوبست کہاں سے ہو گا؟"

"اس کے لئے اٹامک انرجی والوں سے بات کرنا ہوگی۔"

"تو پھر تم ہی کر دو بات۔"

شام کا وقت تھا۔ پروفیسر کے گھر بہت سے لوگ جمع تھے۔ اخباری رپورٹر بھی موجود تھے۔ وہ اس بیل کے بارے میں سن کر حیران رہ گئے تھے اور کسی کو یقین نہ آیا۔ آخر تجربے کے طور پر ایک بلّی کو قربان کرنا پڑا۔ اور سب نے دیکھا کہ جیسے ہی بلّی شاخوں کے قریب پہنچی۔ شاخوں نے اسے جکڑ لیا اور اس کا خون نچوڑ لیا۔ سب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ اٹامک انرجی سے بھی چند لوگ آئے تھے جن کے پاس لیزر

گن تھی۔ انہوں نے فائر کرنے کے لئے چھت کا انتخاب کیا۔ اگرچہ بیل کی چند شاخیں چھت پر بھی پہنچ چکی تھیں اس لئے پہلے چھری کے وار کر کے ان شاخوں کو نیچے گرایا گیا اور پھر سب نے ان شاخوں سے اسی طرح خون نکلتے دیکھا۔ جیسے انسان کے جسم کے کسی زخمی حصے سے نکلتا ہے۔

ایک مناسب جگہ منتخب کر کے لیزر گن مین نے اس جگہ کا نشانہ لیا جہاں اس بیل کا بیج بویا گیا۔ سب کے دل دھک دھک کر رہے تھے ــــ اور پھر گن سے ایک شعاع نکلی اور تیر کی طرح باغ میں گئی ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا اور باغ سے دھواں اُٹھنے لگا۔

"وہ مارا ــــ لگتا ہے بیل کی جڑیں جل گئی ہیں۔" فائر مین چیخا

"احتیاطاً ایک فائر اور کرو۔"

پھر دوسرا فائر ہوا اور اس بار تیزی سے دھواں اٹھنے لگا اور پھر انہوں نے دیکھا کہ بیل کی شاخیں جو درختوں اور دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں، نیچے گرنے لگیں اور اس طرح تڑپنے لگیں جیسے کوئی انسان یا جانور موت کی اذیت سے تڑپتا ہے۔ شاخیں اُچھل اُچھل کر گر رہی تھیں، بل کھا رہی تھیں۔ پھر عجیب وغریب آواز سنائی دی۔

"یہ ــ یہ کیا ــ کیا یہ بیل سسکیاں لے رہی ہے!!" ڈاکٹر افتخار تھرا اُٹھے۔

"لگتا تو یونہی ہے یا پھر شاید ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔" پروفیسر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

آہستہ آہستہ دھواں چھٹنے لگا۔ انہوں نے دیکھا کہ شاخوں کا تڑپنا ختم ہو چکا تھا اب وہ بالکل بے جان زمین پر پڑی تھیں۔

"کک ــــ کیا بیل مر چکی ہے؟" پروفیسر کھوئی کھوئی آواز میں بولے۔

"یہ تو اُتر کر دیکھنا ہوگا۔" فائر مین بولا۔

"ہاں ــــ دیکھنا تو ہوگا ــ آیئے نیچے چلیں۔"

سب نیچے اُترے اور باغ کی طرف آگئے مگر بیل سے دور ہی رک گئے۔ پروفیسر ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور شاخ کے ایک سرے کو چھوا مگر کچھ نہ ہوا۔ اب ان کا حوصلہ بڑھا تو انہوں نے شاخ کو اُٹھالیا۔ شاخ ان کے ہاتھ میں جھول کر رہ گئی۔

"یہ مر چکی ہے۔" وہ بولے۔

پھر سب آگے بڑھے اور شاخوں کو اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگے۔ چند نے شاخوں کو توڑا تو اس بار خون نہ نکلا البتہ ٹوٹے ہوئے سرے سے خون جما نکلتا نظر آ رہا تھا۔

پروفیسر اس کیاری کے پاس آئے جہاں بیج بویا گیا تھا اب وہاں ایک گڑھا بن چکا تھا اور گڑھے کے ارد گرد جلی ہوئی شاخیں پڑی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہو پروفیسر؟" ڈاکٹر افتخار نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "نہ جانے کیوں

کالر کا سائز

مرسلہ...... زرمینہ مرتضیٰ، اناور

ریاضی کے پروفیسر کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے بولے "ریاضی بہت ہی دلچسپ مضمون ہے۔ اب دیکھئے نا میری جو سن پیدائش ہے اگر میں اسے اپنے ٹیلی فون نمبر پر تقسیم کر دوں، تو جو جواب آئے گا اگر اسے میں اپنے بھائی کی عمر سے ضرب دے دوں تو میرے کالر کا سائز نکل آئے گا۔"

مجھے دُکھ سا ہو رہا ہے یوں لگ رہا ہے جیسے کسی زندہ انسان کو ہلاک کر دیا گیا ہے۔" پروفیسر بولے۔

"پروفیسر زندہ انسان بھی اگر قاتل اور خونی بن جائے تو اسے پھانسی دے دی جاتی ہے۔ یہ بیل بھی قاتل بن گئی تھی سمجھ لو اسے بھی سزائے موت دے دی گئی ہے ـــــ اور ہاں اب اس بیل سے گھبرا کر کہیں پودوں پر تجربات کرنا ہی نہ چھوڑ دینا۔ تجربات جاری رکھنا۔ ہو سکتا ہے ایک دن ایسی بیل بھی اُگ آئے جس میں واقعی بڑے تربوز لگیں۔" ڈاکٹر افتخار مُسکرائے تو پروفیسر کے چہرے پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

آج بھی پروفیسر کے باغ میں اس جگہ جہاں اس قاتل بیل کا بیج بویا گیا تھا ایک قبر موجود ہے جس میں اس بیل کی مُردہ شاخیں دفن ہیں اور قبر کے سرہانے ایک بڑے سے بورڈ پر لکھا ہے "آدم خور بیل" نیچے اس بیل کی کہانی درج ہے!!

بچّوں کے مشہور و معروف مُصنّف

اشتیاق احمد

کے سنسنی خیز، ہنگامہ آرا، مزاح اور جاسوسی سے بھرپُور ناول

۵۸۳ـــ جن باس ـــــ میڈیم خاص نمبر ـــ ۶۰ روپے

۶۰ـــ رات کا مہمان ـــــ انسپکٹر جمشید سیریز ـــ ۱۵ روپے

۶۱ـــ اجنبی کی آمد ـــــ " ـــ ۱۵ روپے

۶۲ـــ سلاٹر ـــــ " ـــ ۱۵ روپے

۶۳ـــ دوسری عدالت ـــــ " ـــ ۱۵ روپے

۲۰ ستمبر ۱۹۹۴ء کو آپ کے شہر میں ہر بڑے بکسٹال پر دستیاب

ـــ یا ـــ

پھر براہِ راست خط لکھ کر ادارے سے بذریعہ وی پی منگوائیں

اشتیاق پبلی کیشنز

۹/۱۲ نصیر آباد، مسلم پورہ، سانده کلاں لاہور، ـــ فون ۷۲۴۶۳۵۶

خاص شمارے کے لئے خاص نظم

آنکھ مچولی کے نام

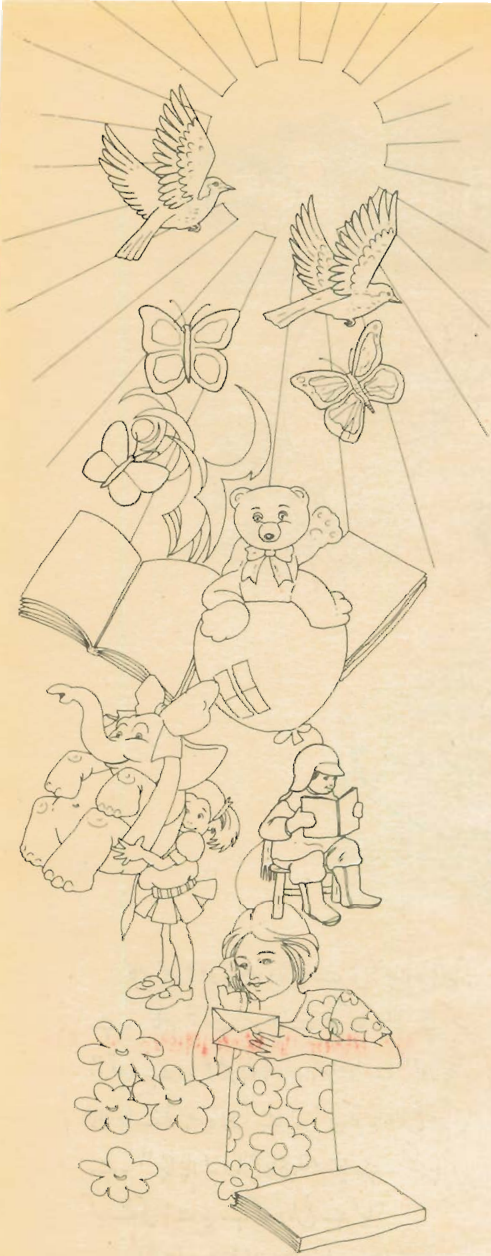

کُل آٹھ برس ہو گئے اس آفتاب کو
بچّوں کے اس شمارے کو اس ماہتاب کو
ہر سرورق ہے اس کا نہایت ہی لاجواب
ہے جلد لا جواب کتابت بھی لاجواب
سچائیوں کا درس ہے اچھائیوں کی بات
ہے اس کی ابتدا میں جو ماہِ رواں کی بات
یہ حمد و ثنا اور یہ نعتِ رسول ؐ ہے
چھپنے سے اس کی ہر جگہ رحمت نزول ہے
بچّوں کا ترجمان، بڑوں کا بھی ترجمان
ہے خاص نمبروں میں فتح یاب و کامران
نظمیں ہیں شاندار اور قصّے ہیں بہترین
اسلوب ہے کمال کا انداز دل نشین
پچھلوں کی بات ہے گئے وقتوں کی بات ہے
سائنس کی بات ہے نئے وقتوں کی بات ہے
گر اس میں شرارت کی ظرافت کی بات ہے
ہر ایک شمارے میں صداقت کی بات ہے
تنقید کی جو بات ہے چھپتی ہے وہ ضرور
تعریف کتنی کیجئے آتا نہیں غرور
یہ نظم میری آنکھ مچولی کے نام ہے
اور اس کے دوستوں کو بھی میرا سلام ہے

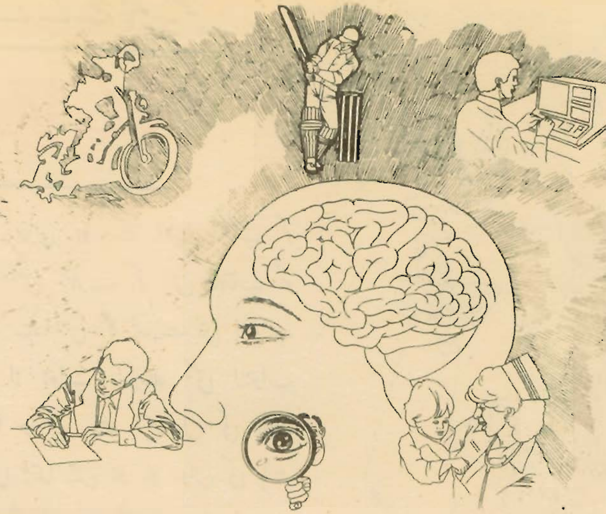

دماغ ہمارے جسم کا حاکم

محمد عظیم قریشی

کام چھوٹا ہو یا بڑا، دماغ سے ہی انجام دیا جاتا ہے۔ کام خراب ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ "تمہارے دماغ میں تو بھوسہ بھرا ہوا ہے" اور کام ٹالا جائے تو تبصرہ ہوتا ہے کہ "یہ تو بد دماغ ہو گیا ہے۔" پتا چلا کہ دماغ بڑی اہم چیز ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دماغ ہے کیا؟

دماغ ہمارے خیالات، جذبات، ہماری جبلّت (فطرت) حتیٰ کہ ہمارے خوابوں تک کو کنٹرول کرتا ہے۔

ہر وہ کام جو ہم کرتے ہیں، ہر وہ چیز جس کے متعلق ہم سوچتے ہیں، ہر حرکت جو ہمارے جسم میں ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں ہمارا حیرت انگیز کمپیوٹر نما دماغ کنٹرول کرتا ہے۔

اگر آپ انسان کے سر کو کھول کر دماغ کو

دیکھیں تو یہ بڑی غیر مُتاثر کن چیز معلوم ہو گا۔ اس کا وزن تین پونڈ سے بھی کم ہوتا ہے۔ یہ بھورے گلابی رنگ کا ایک نرم و نازک عضو ہوتا ہے جسے کبھی اخروٹ سے اور کبھی اسفنج سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

دماغ کے تین بڑے حصے!

دماغ کے تین بڑے حصے ہوتے ہیں۔ سوچنے والا حصہ دماغ کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ جس کو مقدم دماغ (CEREBRUM) کہتے ہیں۔ دماغ کا یہی حصہ اعصاب کے ذریعہ سے وہ پیغامات وصول کرتا ہے جو ہمیں سونگھنے، چکھنے، چھونے، سننے اور دیکھنے کے قابل بناتے ہیں۔

جب آپ اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہ پیغامات عضلات کو مقدم دماغ ہی بھیجتا ہے۔ یہ پیغامات دماغ کے اس حصے کے ذریعے سے جاتے ہیں جس کو مخیچہ.......... (CEREBELLUM) کہتے ہیں۔ اسے چھوٹا دماغ بھی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ربڑ کی چھوٹی گیند کے برابر ہوتا ہے۔ یہ مقدم دماغ کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔

دماغ کا تیسرا اہم حصہ حرام مغز کا سر-Med) (ulla Oblongata ہے۔ سر حرام مغز اعصاب کا انچارج ہوتا ہے۔

یادداشت کیا ہے؟

دماغ کے بارے میں ایک اور سربستہ راز یہ ہے کہ ہمیں اچانک کوئی بھولا بسرا واقعہ کیوں یاد آجاتا ہے؟ یا ہم کسی ایسے چہرے کو کس طرح پہچان سکتے ہیں جو ہم نے سالہا سال پہلے دیکھا تھا؟

ہر روز خواہ ہم کام میں مصروف ہوں یا کھیل میں مشغول۔ ہمارے دماغ کو اطلاعات کی ایک پوری کہکشاں کا تجزیہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ تجزیہ شعوری طور پر بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری طور پر بھی۔

اس دشوار کام کے لئے دماغ مختلف منتخب اطلاعات کو پہلے سے جمع کر لیتا ہے اور ضرورت کے وقت ان اطلاعات سے کام لیتا ہے۔ اسی کام کی صلاحیت کو یادداشت کہتے ہیں۔ یادداشت کی دو اقسام ہیں۔ ایک وہ جسے مختصر دورانئے کی یادداشت کہتے ہیں۔ یہ اس صلاحیت کا نام ہے جس سے نئی معلومات سیکھی جاتی ہیں۔ طویل دورانئے کی یادداشت وہ ہے جو گزرے ہوئے زمانے میں حاصل ہونے والے مشاہدات اور تجربات کو یاد رکھتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو یہ کیسے یاد رہتا ہے کہ کل آپ نے کیا کام کیا تھا؟ اس کام کے لئے آپ اپنے دماغ کے تین حصوں میں سے ایک حصہ، سوچنے والا حصہ یا مقدم دماغ (Cere-brun) استعمال کرتے ہیں۔ تب ہی آپ گزرے ہوئے دن کے بارے میں سوچ سکتے ہیں یا یہ یاد کر سکتے ہیں کہ کل آپ نے کیا کام سرانجام دیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اپنے کسی دوست کو

لنگر

امید زندگی کا لنگر ہے اس کا سہارا چھوڑ دینے سے انسانی کشتی گہرے پانی میں ڈوب جاتی ہے۔ (حکیم لقمان)

کوئی پرانا واقعہ سنانا چاہتے ہوں۔ یہ باتیں آپ کے مقدم دماغ میں محفوظ ہیں۔ دماغ کا یہی حصہ آپ کو پچھلے کام کی پچھلی باتیں بیان کرنے کے قابل بناتا ہے۔

ہم جیسے جیسے بوڑھے ہوتے جاتے ہیں، ہماری یادداشت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بوڑھے دماغ کے کام کرنے کی رفتار کم پڑ جاتی ہے۔ دماغ کے خلیے جو ایک ہی جگہ پچاس، ساٹھ سال تک حرکت کرتے رہے ہوں، پرانے ہو جاتے ہیں اور کسی بھی مشین کی طرح گھس جاتے ہیں۔

۵۔ بعض لوگ الٹے ہاتھ سے کیوں کام کرتے ہیں؟

آپ الٹے ہاتھ سے لکھتے ہیں یا سیدھے ہاتھ سے؟ یا دونوں سے؟ اس کا انحصار آپ کے دماغ کی نشو و نما پر ہے۔ بعض لوگوں کی دماغ کی ایک جانب دوسری جانب کے مقابلے میں زیادہ نشو و نما پاتی ہے یعنی بعض کا دائیں جانب کا حصہ زیادہ بڑھتا ہے اور بعض کا بائیں جانب کا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کے دماغ کا الٹی جانب کا حصہ جسم کے سیدھی جانب کے عضلات کو کنٹرول کرتا ہے اور سیدھی جانب کا حصہ الٹی جانب کے عضلات کو۔ جن لوگوں کے دماغ کی الٹی جانب کا حصہ زیادہ نشو نما پاتا ہے وہ سیدھے ہاتھ سے کام کرتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے دماغ کی الٹی جانب کے مقابلے میں سیدھی جانب کا حصہ زیادہ نشو و نما پا جاتا ہے وہ الٹے ہاتھ سے کام کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر دماغ کے دونوں جانب کے حصوں کی نشو و نما برابر اور یکساں ہو تو دونوں ہاتھوں سے یکساں کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگ دونوں ہاتھوں سے کھیل بھی سکتے ہیں اور لکھ بھی سکتے ہیں ایسے لوگوں کو دو ہتا یا ذوالیمینین کہتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ سیدھے ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔

کیا آپ بھی؟

غرضیکہ انسان کو دوسرے جانداروں پر جو برتری حاصل ہے، اس کی بنیاد ہمارے دماغ کی بناوٹ اور کارکردگی پر ہے۔ یہ ہمارا دماغ ہی ہے جو ہمیں دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے، لیکن ہمارے دماغ کی بناوٹ اور اس کی صلاحیتوں اور کام کرنے کے طریقوں کا سمجھنا ایسے راز ہیں، جن کو حل کر کے ہی ہم یہ جان سکتے ہیں کہ انسان ہونے کا کیا مطلب ہے، یا یہ کہ اصل میں ہم کیا ہیں۔

مختصراً یہ کہ دماغ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ کا اس نعمت پر شکر ادا کرنا چاہیئے۔

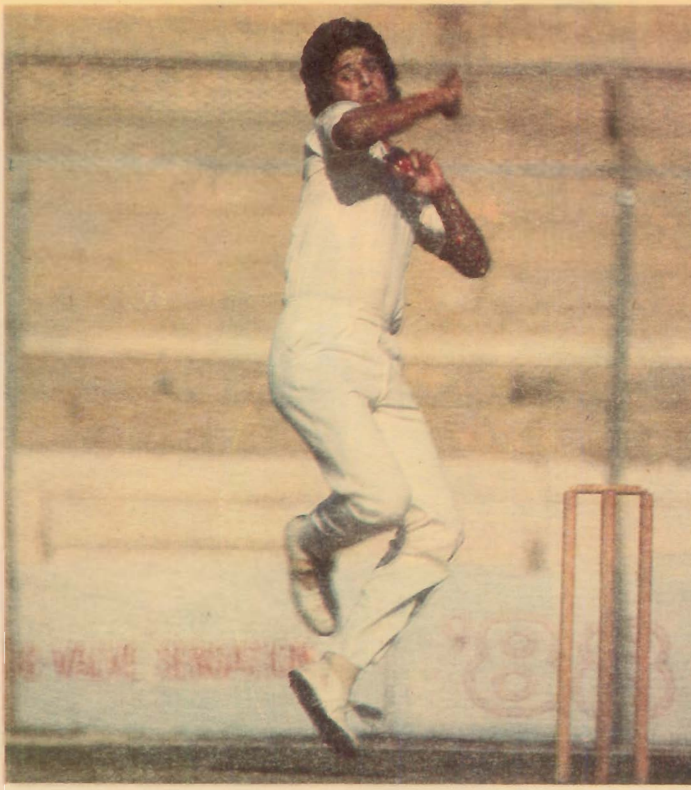

مہارت کی بلندی۔ پی آئی اے کی جستجو
اب فضائی حدود سے بڑھ کر

ہماری خوب سے خوب تر کی جستجو ہماری فضائی کارکردگی کے شعبوں سے لے کر کھیلوں کی دنیا تک وسیع ہے۔
ہم کھلاڑیوں کو تربیت دیکر ان کو عالمی چیمپین بننے میں مدد کرتے ہیں۔ اندرون ملک ہم ایسے ٹورنامنٹ کا انعقاد کرتے ہیں۔ جہاں
وہ اپنی مہارت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر اس مقام تک پہنچاتے ہیں جہاں کھیلوں کے مقابلے منعقد ہو رہے ہوں۔

PIA
پاکستان انٹرنیشنل
باکمال لوگ۔ لاجواب پرواز

میرے دکھ کون بانٹے گا

تحریر: عین عین

"میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ جب کبھی میں آئینہ دیکھتا ہوں مجھے اپنے سامنے ایک ایسا چہرہ نظر آتا ہے جو تمام لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔

مجھے ایک گنجا سر نظر آتا ہے۔ ٹیڑھی میڑھی ناک دکھائی دیتی ہے۔ دانت تو جیسے ہیں ہی نہیں۔ اور تو اور پلکیں بھی غائب ہیں اور بھویں بھی۔ پھر نوکیلے نوکیلے سے کان ہیں، بدن دبلا پتلا سا، اور ٹانگیں مڑی ہوئی۔

یہ ہے میرا حلیہ جو آئینے میں مجھے اور ویسے دوسرے لوگوں کو تو نظر آتا ہی ہے۔ پھر بھی مجھے لوگوں سے توقع ضرور رہتی ہے کہ شاید...... شاید وہ میرے حلیۓ کو نظر انداز کر سکیں اور اس حلیۓ کے پیچھے مجھے دیکھنے کی کوشش کریں۔

میں جو کوئی عجوبہ نہیں ہوں ...... انسان ہوں...... آپ جیسا۔ مجھے بھی اس دنیا سے اس کے نگروں سے، لوگوں سے، پھولوں اور بچوں سے پیار ہے۔ آپ کی طرح۔

میں نے یہ حلیہ یہ شکل و صورت خود تو پسند نہیں کی ہے نا...... یہ تو بس مجھے مل گئی ہے۔"

دوستو!

آپ نے یہ تحریر پڑھی! آپ کو اسے پڑھ کر کیا محسوس ہوا! آپ کو معلوم ہے یہ سب باتیں بالکل سچی ہیں۔ یہ باتیں جیسن کی ہیں۔ ایک ایسے بچے کی جسے ایک بہت انوکھے مرض نے اپنا شکار بنالیا ہے۔ اس مرض سے اس بچے کا حلیہ، اس کی شکل ایسی ہو گئی جیسی آپ اس کی باتوں میں پڑھ سکتے ہیں، ان تصویروں میں دیکھ سکتے ہیں۔

بہت دن یہ بچہ بہت پریشان رہا۔ ہر وقت ایک ہی سوال پوچھتا رہتا۔ آخر میں ہی کیوں؟ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ پھر آہستہ آہستہ اس نے یہ سوال پوچھنا چھوڑ دیا اور زندگی گزارنا سیکھ لی۔ اب اس کی عمر پندرہ سال ہے۔

وہ جانتا ہے کہ دنیا میں وہ اکیلا ہی اس خطرناک بیماری کا شکار نہیں ہے بلکہ بہت سے اور بچے بھی اسی کی طرح اس بیماری سے پریشان ہیں۔

اس بیماری کا نام پراگیریا ہے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہے کہ بیماری سے ہمت نہیں ہارنا ہے اور زندگی کو گزارنا ہے۔ بہادری سے ...... حوصلہ سے۔ اس نے یہ چیلنج قبول کر لیا ہے، مسکراتے ہوئے۔

کبھی کبھار اسے غصہ تو آتا ہے۔ وہ رو بھی پڑتا ہے۔ لیکن ہمت نہیں ہارتا۔ وہ بہت ذہین بھی ہے۔ اس نے معذوروں کے اسکول میں پڑھنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ عام بچوں کے ساتھ اسکول میں داخل ہوا۔ اور ہر سال کلاس میں اول آتا رہا۔

آہستہ آہستہ اس کی بیماری بڑھ رہی ہے لیکن وہ خوفزدہ ہرگز نہیں ہے۔ اسے موت سے ڈر بھی نہیں لگتا وہ کہتا ہے کہ دوسری دنیا زیادہ اچھی ہوگی زیادہ خوبصورت اور وہاں یہ بیماریاں نہیں ہوں گی۔ اس کی بات پر ہمیں بھی یقین ہے۔ آپ کو بھی ہے نا؟

کپڑوں کی ڈرائی کلیننگ میں بہترین

قالین کی صفائی میں اعلیٰ ترین

TIP_TOP

DRYCLEANERS

TOPS IN DRYCLEANING

*

ہیڈ آفس

علامہ اقبال روڈ ـــــ ۴۵۵۰۹۴۳

*

برانچ آفس

* حسن اپارٹمنٹس ـ ۴۹۶۵۰۶۸	* ڈیفنس سوسائٹی ـ ۵۴۲۱۶۳
* کلفٹن ـــــ ۵۳۰۳۶۹	* ناظم آباد ـ ۶۲۳۸۱۳
* ویڈن برن روڈ ـ ۴۹۴۶۶۱۹	* بلوچ کالونی ۴۳۲۹۵۹

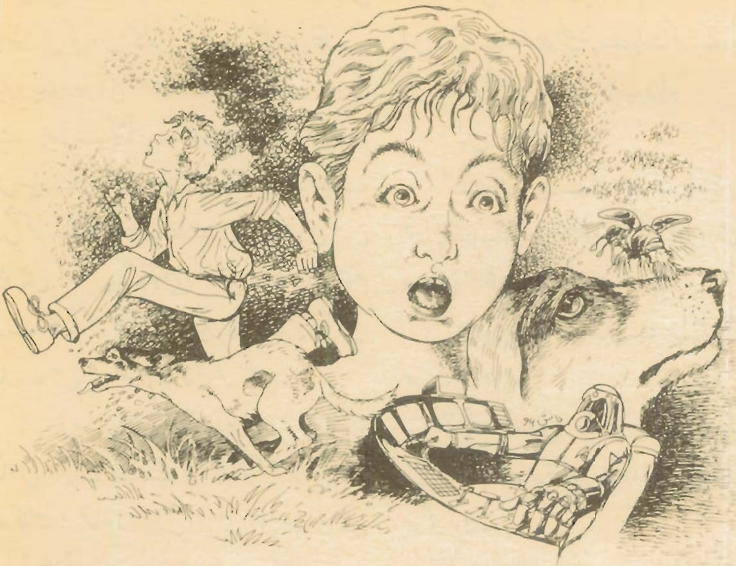

خلائی حملہ آور

سید عرفان علی یوسف

اجنبی سیارے کی مخلوق زمین پر قبضہ کرنا چاہتی تھی۔ عالمی سائنسی ادب سے ایک دلچسپ انتخاب

سر سبز اور شاداب میدان میں ایک لڑکا اور اس کا پالتو کتا ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ لڑکے کی عمر بمشکل دس سال تھی۔ "موتی" اس کا پالتو کتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرتے تھے۔

اسی وقت زمین سے کئی ہزار میل دور خلا میں ایک خلائی جہاز گردش کر رہا تھا۔ اس کا رخ کرۂ ارض کی جانب تھا۔ خلائی جہاز میں سوار عملے میں سے بیشتر مر چکے تھے۔ صرف چار افراد زندہ تھے۔ ان میں جہاز کا کپتان اور اس کے تین نائب شامل تھے۔ وہ کرۂ ارض سے لاکھوں نوری سال دور ایک کہکشاں کے رہنے والے تھے اور ایک نئی سرزمین کی

لاش میں نکلے تھے۔ ان کے آلات نے کرۂ ارض نشاندہی کئی دن پہلے کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہ یارہ جانداروں کی صحت کے لئے بے حد مناسب ہے۔ جہاز کے کپتان نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ ں سیارے کی مخلوق کو اپنا تابع بنا کر پورے سیارے فتح کر لے گا اور جب حالات اس کے پوری طرح ابو میں آجائیں گے تو اپنی کہکشاں سے رابطہ قائم رے گا تا کہ اس کے سیارے کے لوگ اس یارے میں اپنی حکومت قائم کر سکیں۔

سرسبز میدان میں کھیلتا ہوا لڑکا اور اس کا پالتو تا اس خطرے سے بے خبر تھے جو کرۂ ارض سے ھ فاصلے پر تھا اور تھوڑی دیر میں اسی میدان میں رنے والا تھا۔

"موتی! موتی!" لڑکے نے کتے کو پکارا اور کتا ب تتلی کا پیچھا کرتا، بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا اور ں کے قدموں میں لوٹنے لگا۔

لڑکے نے پیار سے کتے کو سہلایا اور پھر دونوں یدان میں بھاگنے لگے۔

خلائی جہاز میں کپتان نے اپنے ماتحت انجینئر سے بطہ قائم کیا۔ اس کے سامنے ڈش بورڈ پر چھوٹے ے بٹن اور روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ ان ں سے بعض روشنیاں بالکل بجھی ہوئی تھیں اور ں بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ عملے کے زیادہ لوگ اس طویل سفر میں بیمار ہو کر فوت ہو چکے ں۔ عملے کے ہر فرد کے زندہ رہنے کی نشاندہی ایک اص روشن بٹن سے ہوتی تھی۔ اور کپتان اس بٹن کو دبا کر اس فرد سے رابطہ قائم کر سکتا تھا۔ جب اس نے اپنے ماتحت انجینئر سے بات کرنے کے لئے بٹن دبایا تو انجینئر نے فوراً جواب دیا۔

"یس سر!"

"مجھے اس سیارے کی رپورٹ چاہئے!!" فوراً کپتان نے کہا۔ انجینئر کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

"میری حالت اچھی نہیں ہے سر! میں بھی شاید مرنے والا ہوں۔"

"مجھے تمہاری حالت جاننے سے دلچسپی نہیں۔ تم مجھے فوراً رپورٹ دو!!" کپتان ناراض ہو کر بولا۔

"ہمارا جہاز اس سیارے کی بیرونی فضا میں جل کر تباہ ہو سکتا ہے۔" انجینئر نے کہا۔

"لیکن ہمیں ہر حال میں اس سیارے کی سطح پر اترنا ہے۔" کپتان بولا۔

"ہمارے تمام ساتھی خلائی سوٹ میں خرابی کی وجہ سے موت کا شکار ہوئے ہیں۔ خلائی جہاز سے باہر نکلنے کے لئے خلائی سوٹ کا ٹھیک کام کرنا ضروری ہے۔" انجینئر بولا۔

"مجھے تمہارا مشورہ نہیں چاہئے۔" کپتان نے کہا۔ "مجھے سیارے کی فضا کے بارے میں تازہ ترین رپورٹ دو۔"

انجینئر کی آواز دوبارہ نہیں سنائی دی۔ ڈش بورڈ پر اس کی زندگی کا روشن بٹن بجھ گیا تھا۔ وہ رپورٹ دینے سے پہلے مر چکا تھا۔

زمین پر سرسبز و شاداب میدان میں لڑکا اپنے کتے کو پکار رہا تھا۔ کتا اس مرتبہ میدان کے کنارے پر اچھلنے والے ایک مینڈک میں دلچسپی لے رہا تھا۔ مینڈک اچھلتا ہوا تھوڑے فاصلے پر واقع جوہڑ کی طرف جا رہا تھا۔ کتا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے مالک کی پکار سن لی تھی لیکن اس کا تجسس اسے مینڈک کے پیچھے لے جا رہا تھا۔ سورج ڈوبنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ سبز درختوں سے ڈھکے ہوئے اونچے پہاڑوں کی ڈھلانوں سے سرمئی دھند اتر رہی تھی۔ خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس میدان کے دوسرے سرے پر سرخ اینٹوں سے بنے ہوئے ایک مکان میں اس لڑکے کی ماں شام کی چائے تیار کر رہی تھی۔ مکان کے دُود کش سے سیاہ اور سرمئی دھواں فضا میں بلند ہو رہا تھا۔ لڑکے کو معلوم تھا کہ ماں چائے پر اس کا انتظار کر رہی ہے اس لئے وہ جلد گھر کی جانب لوٹنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا کتا مینڈک کا پیچھا کرتے ہوئے کافی آگے نکل گیا تھا۔ وہ "موتی" کو ساتھ لئے بغیر گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ماں کچھ دیر اس کا انتظار کرتی رہی پھر گھر سے باہر نکلی۔ گھر سے باہر مٹی کے بند پر چڑھ کر اس نے لڑکے کو آواز دی۔ "سلیم! سلیم!"

"جی جی!" لڑکے نے جواب دیا۔

"بیٹا! تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ جلدی آؤ!!" ماں نے کہا۔

"امی جان!" لڑکے نے کہا۔ "موتی پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے ؟ میں اسے لے کر ہوں۔"

"بیٹا! موتی خود ہی گھر آجائے گا۔ تم چل کر چائے پیو......" ماں نے کہا۔ "اور نے تمہارے لئے انڈوں کا حلوہ بھی بنایا ہے۔

انڈوں کے حلوے کا تذکرہ سن کر سلیم کی ٹپک گئی اور وہ موتی کو چھوڑ کر گھر کی طرف پڑا۔

خلائی جہاز کرۂ ارض کی فضا میں داخل ہ تھا۔ کپتان کے سوا جہاز کے تمام مسافر مر تھے۔ کپتان پوری طرح صحت مند اور ٹھیک اب اسے تمام کام تن تنہا انجام دینا تھا۔ وہ سیٹ سے نکل کر ایک کیپسول میں سوار تھا۔ یہ کیپسول اسے زمین کی سطح پر لے والا تھا۔ اس کیپسول میں وہ تمام آلات جن کی مدد سے وہ زمین پر موجود خطرات کا مقا سکتا تھا۔ مختلف جانوروں اور درندوں سے اپ کرنے کے لئے ہتھیار استعمال کر سکتا تھا۔ اسے دوسرے جانوروں کو اس وقت تک کرنے کی اجازت نہیں تھی جب تک خود ا جان کو خطرہ لاحق نہ ہو جائے۔ اس کیپسول میں ایسے آلات تھے جن کی مدد ان لوگوں کے دماغوں پر قبضہ کر کے انہیں اپ بنا سکتا تھا۔ لیکن ابھی تک اسے یہ معلوم نہ کہ اس جزیرے پر آباد مخلوق کتنی بڑی ہے۔ اس مخلوق کا مقابلہ کر سکتا ہے یا نہیں؟

کیپسول نے اسے چند منٹوں میں زمین پر
نچا دیا۔ وہ زمین کے جس حصے میں اترا تھا وہاں
نچے اونچے درخت اور بڑی بڑی گھاس تھی۔ اس
نے کیپسول میں بیٹھے بیٹھے آس پاس کا جائزہ
۔ یہاں کی فضا زیادہ صاف نہیں تھی۔ چاروں
رف دھند چھائی ہوئی تھی۔ کہر اور شبنم کی وجہ
ے زمین اور گھاس ہر چیز گیلی تھی اور درختوں سے
نم کے قطرے ٹپ ٹپ نیچے گر رہے تھے۔ اس
نے کیپسول کا دروازہ کھولا اور باہر کی فضا میں
نس لیا۔ یہاں کی آب وہوا فرحت بخش اور
نڈی تھی۔ اسے اس ہوا میں سانس لے کر بہت
ف آیا۔ اس کا دل چاہ کہ وہ کیپسول سے
ر کود جائے لیکن ان دیکھے خطرات نے اس کے
م روک لئے۔ اسے دفعتاً ایک عجیب و غریب
م کا جانور نظر آیا جو بڑی بڑی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا
ں کے قریب سے گزرا۔ اس نے ڈر کر
یپسول کا دروازہ بند کر لیا۔ اور اپنے آلات
مدد سے اس جانور کے بارے میں معلومات
ل کرنے لگا۔ اس کے کمپیوٹر نے بتایا کہ یہ
ر پانی اور خشکی دونوں جگہ رہ سکتا ہے۔ یہ جانور
انگوں کی مدد سے چھلانگ لگاتا ہے اور اس کے دو
بھی ہیں۔ اس کے پیروں کے پنجوں میں جھلّی
جو تیرنے میں مدد دیتی ہے۔ ابھی وہ اس جانور
بارے میں پوری معلومات حاصل نہیں کر پایا
۔ اس نے ایک دوسرے بڑے جانور کو دیکھا جو
ہاتھوں اور پیروں سے دوڑ رہا تھا۔ اس کے
کان بے حد لمبے تھے۔ وہ اپنی ناک سے سونگھتا ہوا پہلے جانور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کمپیوٹر نے بتایا کہ پہلا جانور زیادہ ذہین نہیں ہے لیکن دوسرا جانور اس سے زیادہ ذہین ہے۔

وہ کچھ دیر چاروں ہاتھ پیروں سے چلنے والی مخلوق کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس مخلوق کے دماغ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ذرا دیر کے بعد اس کا کیپسول اس مخلوق کے کان کے سوراخ سے اندر داخل ہو چکا تھا۔

○ ـ ○ ـ ○

سلیم نے مزے لے لے کر انڈوں کا حلوہ کھایا۔ گرم گرم چائے پی اور پھر ٹیلی ویژن پر کارٹون پروگرام دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے احساس ہوا کہ موتی ابھی تک گھر واپس نہیں آیا ہے۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ سورج ڈوب چکا تھا اور اندھیرا پھیل رہا تھا۔ موتی رات کے بعد کبھی باہر نہیں رہتا تھا کیونکہ اندھیرا پھیلنے کے بعد پہاڑی بھیڑیئے اور درندے آبادی کے قریب آجاتے تھے۔ سلیم نے بھیڑیوں کا خیال آتے ہی ٹی وی کا سوئچ آف کیا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ دور دور تک موتی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔

"موتی! موتی!" اس نے موتی کو زور زور سے آوازیں دیں۔"

تاریکی کے پھیلتے سایوں میں درخت بھوتوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ رات سے زیادہ اندھیرا اس دھند نے پھیلایا تھا جو سردیوں کی شاموں میں اکثر

پہاڑوں سے نیچے اتر آتی تھی۔ اس دھند کے ساتھ صرف پالا اور کہر ہی نہیں بھیڑیئے بھی ہوتے تھے جو چراگاہوں میں رہ جانے والے کسی اکیلے دکیلے میمنے یا بکری کو شکار بنا لیتے تھے۔

سلیم موتی کو آوازیں دیتا ہوا مٹی کے بند تک پہنچا۔ مٹی کے بند سے چند قدم آگے تاروں کی باڑ تھی جو آبادی کو جنگل سے علیحدہ کرتی تھی۔ اس باڑ میں ایک دروازہ بھی تھا جسے رات کو بند کر دیا جاتا تھا کہ درندے اور اجنبی اندر نہ آسکیں۔

سلیم دھند لکے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر موتی کو تلاش کرنے لگا۔ دفعتاً اس نے موتی کو دیکھ لیا۔ موتی عجیب انداز میں اپنا سر زمین پر پٹخ رہا تھا اور بار بار لوٹ لگا رہا تھا۔

"موتی! موتی!" سلیم نے پھر اسے آواز دی۔ لیکن موتی نے اس کی آواز پر کوئی توجہ نہیں دی۔ حالانکہ وہ اس کی ایک آواز پر دوڑا دوڑا اس کے پاس آتا تھا۔ سلیم باڑ سے باہر نکل کر موتی کے پاس آیا اور اسے پچکارا۔ موتی نے زمین پر لوٹنا بند کر دیا اور سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کے بجائے اجنبیت تھی۔ سلیم کے دل میں خوف کی ایک لہر اٹھی۔ یہ آنکھیں موتی کی آنکھیں نہیں تھیں۔ ان میں درندگی اور اجنبیت تھی۔ سلیم دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ موتی نہیں کوئی بھیڑیا ہے جو اس پر حملے کے لئے تیار ہے۔

○ — ○ — ○

کپتان اپنے کیپسول سمیت اس چار پیروں والی مخلوق کے کان میں داخل ہو کر اس کے دماغ پر قبضہ کر چکا تھا۔ اب وہ اسے جو حکم دے رہا تھا وہ مخلوق اس کی تعمیل کر رہی تھی۔

اس مخلوق نے اپنا سر پٹخ پٹخ کر اس سے چھٹکارا پانے کی بڑی کوشش کی لیکن نا کام رہی۔ دفعتاً اسے سامنے دو پیر والی مخلوق نظر آئی جو اس مخلوق سے بڑی تھی۔ کمپیوٹر نے اس مخلوق کے بارے میں معلومات فراہم کرنا شروع کر دیں۔ جن سے پتہ چلا کہ چار پیروں والی مخلوق اس دو پیر والی مخلوق سے بے حد محبت کرتی ہے اور اس کی وفادار ہے۔ دو پیر والی مخلوق چار پیر والی مخلوق سے زیادہ ذہین ہے۔ جب دو پیر والی مخلوق منہ سے آواز نکالتی ہے تو چار پیر والی مخلوق کے دل اور دماغ میں خاص لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اب کپتان کو احساس ہوا کہ چار پیر والی مخلوق کے دماغ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ غلط تھا۔ اسے چاہئے کہ وہ دو پیر والی مخلوق کے دماغ پر قبضہ کرے۔ لیکن کیسے؟ دو پیر والی مخلوق زیادہ ذہین تھی اور خطرے کا احساس ہوتے ہی واپس لوٹنے کو تیار تھی۔ کپتان نے چار پیر والی مخلوق کو حکم دیا کہ وہ دو پیر والی مخلوق پر حملہ کر دے۔

○ — ○ — ○

سلیم موتی کی آنکھوں میں درندگی اور دہشت دیکھ کر واپس مڑا۔ وہ بھاگ کر خاردار تاروں کی باڑ والے دروازے میں داخل ہو جانا چاہتا تھا جہاں وہ

محفوظ ہوتا۔ لیکن جونہی وہ بھاگنے کے لئے مڑا۔ موتی نے اس پر حملہ کر دیا۔ سلیم کو اس پر یقین نہیں آیا۔ وہ خوف زدہ انداز میں چلایا۔ "موتی! موتی!" یہ میں ہوں سلیم......"

موتی جو کسی بھوکے بھیڑیئے کی طرح غرا رہا تھا اس کی آواز سن کر اچانک دھیما پڑ گیا اور اسے پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔ دفعتاً وہ زمین پر گر گیا اور لوٹنے لگا۔ اس کا پنجہ بار بار کان کی طرف جاتا تھا اور وہ سر کو زمین پر پٹختا تھا۔ سلیم کو یاد آیا ایک دفعہ موتی کے کان میں ایک کیڑا گھس گیا تھا تو وہ اس وقت بھی ایسی ہی حرکت کر رہا تھا۔ سلیم آگے بڑھا اور اس نے موتی کو کان سے پکڑ کر اٹھالیا۔ اور ایک لکڑی کی مدد سے اس کا کان کھول کر دیکھنے لگا۔ دفعتاً موتی کے کان سے ایک سیاہ بھونرا نما کیڑا نکلا اور تیزی سے سلیم کی طرف بڑھا۔ سلیم اگر فوراً ہی نیچے نہ جھک جاتا تو وہ کیڑا سیدھا اس کی ناک میں گھس جاتا۔

کپتان اب انتظار کر رہا تھا کہ دو پیر والی مخلوق اس کے قریب آئے اور وہ چار پیر والی مخلوق کے دماغ کو چھوڑ کر دو پیر والی مخلوق کے دماغ پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔ چار پیر والی مخلوق کے دماغ پر قبضہ رکھنا اسے آسان کام نہیں لگتا تھا کیونکہ جونہی دو پیر والی مخلوق منہ سے آواز نکالتی تھی۔ چار پیر والی مخلوق اپنا سر زمین پر پٹخنے لگتی تھی۔ اس سے صرف ایک ہی مطلب نکلتا تھا کہ چار پیر والی مخلوق دو پیر والی مخلوق کی تابعدار تھی اور پوری کوشش کے باوجود وہ اس کے دماغ پر پوری طرح قبضہ نہیں کر پا رہا تھا۔ گویا اسے اب دو پیر والی مخلوق کے دماغ پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔

دو پیر والی مخلوق اس کے قریب آئی۔ اور چار پیر والی مخلوق کا کان کھول کر اندر جھانکنے لگی۔ گویا وہ وہاں اس کی موجودگی سے باخبر ہو گئی۔ کپتان نے اپنے کیپسول کے جیٹ انجن اسٹارٹ کئے اور پوری رفتار سے دو پیر والی مخلوق کے چہرے پر ناک کے سوراخ سے گھسنے کی کوشش کی۔ دو پیر والی مخلوق اس سے زیادہ پھرتیلی نکلی۔ اس نے تیزی سے جھک کر خود کو بچالیا۔

کپتان کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے تن تنہا اس سیارے کا فاتح بننے کے لالچ میں اپنے سارے ساتھیوں کو مرنے دیا تھا۔ لیکن اکیلے وہ اس سیارے کے ان دو حیوانوں کے دماغ پر قبضہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سیارے کے رہنے والے اس سے زیادہ ذہین تھے۔ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ اور یہ باہمی محبت ہی ان کی اصل طاقت تھی۔

چار پیر والی مخلوق نے اچانک حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے خوفناک پنجوں سے اس کے کیپسول کو دبوچ لیا۔

سلیم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی تیزی سے گھمائی تاکہ موتی کے کان سے نکلنے والے کیڑے سے خود کو بچا سکے۔ اس کی چھڑی کیڑے کو نہیں لگ سکی لیکن موتی اس سے زیادہ پھرتیلا نکلا

اس نے دونوں پنجوں سے کیڑے کو دبوچ لیا۔ رات کے پھیلتے ہوئے دھندلکے میں سلیم کیڑے کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایسا کیڑا پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اس کی بیرونی جلد اسٹین لیس اسٹیل کی چمک دار سطح کی مانند چمک رہی تھی اور اس سے کسی جیٹ انجن کے جیسی سیٹی خارج ہو رہی تھی۔ اس کی سیٹی سے گھبرا کر موتی نے اسے چھوڑ دیا۔ کیڑا کسی راکٹ کی سی تیزی سے زمین سے بلند ہوا۔ سلیم نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو پوری طاقت سے کیڑے پر مارا۔ اس مرتبہ اس کا نشانہ خطا نہیں گیا۔ اس کی چھڑی کیڑے پر کافی طاقت سے پڑی اور وہ چوٹ کھا کر زمین پر گر گیا۔ اب اس سے تیز سرخ روشنی خارج ہو رہی تھی۔ سلیم کے ہاتھ میں اس طرح درد ہو رہا تھا جیسے اس کا ہاتھ کسی سخت چیز سے ٹکرا گیا ہو۔ گھاس میں تیز سرخ روشنی خارج کرتے کیڑے کو اس مرتبہ موتی نے نہیں چھوا اور نہ قریب آنے کی کوشش کی بلکہ دور سے اس پر بھونکتا رہا۔ سلیم نے چھڑی سے ایک مرتبہ پھر کیڑے کو چھوا۔ وہ زمین پر الٹا پڑا تھا لیکن جونہی سلیم نے چھڑی اسے لگائی۔ وہ سیدھا ہو کر رنگ بدلنے لگا۔ سرخ روشنی کی جگہ تیز چمکدار سفید روشنی نے لے لی۔ دفعتاً وہ کسی راکٹ کی طرح فضا میں بلند ہوا۔ اور تیزی سے آسمان کی طرف چلا گیا۔ ذرا دیر میں وہ آسمان کی تاریکیوں میں غائب ہو چکا تھا۔ سلیم اور اس کا پالتو کتا موتی کچھ دیر آسمان کی طرف دیکھتے رہے پھر گھر کی طرف چل دیئے۔

زمین سے ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر واقع ایک کہکشاں کے آباد سیارے میں پیغام وصول ر[ہا] تھا۔

"آپریشن گرین پلینٹ" نا کام رہا۔ عمل[ے] کے تمام افراد ہلاک ہو گئے۔ کپتان سب سے آخ[ر] میں "گرین پلینیٹ" کی مکین مخلوق کے ہاتھو[ں] ہلاک ہو گیا۔ خلائی سیارہ واپس آرہا ہے۔ جب تک اس سیارے کی مخلوق ایک دوسرے سے محب[ت] کرتی رہے گی اس سیارے کو فتح کرنا ممک[ن] نہیں۔"

(مرکزی خیال نیکولس فسک کی ایک کہانی سے ماخوذ)

ٹرک اور زنجیر

آفتاب احمد انصاری، گکھڑ منڈی

آپ نے اکثر ٹرکوں کے پیچھے زنجیریں لٹکتی ہوئی تو ضرور دیکھی ہوں گی اور انہیں بھی ٹرک کی خوب صورتی سمجھا ہو گا۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خاص مقصد کے لئے لگائی گئی ہوتی ہیں۔ جب ٹرک چلتا ہے تو اس کے ٹائروں میں سڑک پر تیزی سے گھومنے کی وجہ سے خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ زنجیریں اس وقت "ارتھ" کا کام دیتی ہیں اور جوں ہی ٹرک کی باڈی میں برقی رو منتقل ہو جاتی ہے وہ ان زنجیروں کے راستے زمیں میں منتقل ہو جاتی ہے اور یوں ٹرک آگ لگنے کے خطرے سے بچ جاتا ہے۔

مانیں یا مت مانیں چچی

حاطبؔ صدیقی

مانیں یا مت مانیں چچی
بات ہے میری بالکل سچی
آپ کہیں گی "گڑیا رانی!
تجھے سناؤں نئی کہانی؟"
شروع کریں گی مجھے سنانا
وہی کہانی، بڑی پرانی
"دور کہیں خوش حال نگر میں
ایک تھا راجا ایک تھی رانی
جنگل میں اک دیو تھا کالا
ایک تھی جادو گرنی کانی
لے گئے دونوں شہزادی کو
چھُٹ گیا اُس کا دانا پانی
کوئی اُن سے جیت نہ پایا
بڑے بڑوں کی مر گئی نانی
ایک چرواہے کے بیٹے نے
آخر دکھلائی جولانی
ان دونوں کو جان سے مارا
مار کے کر دی ختم کہانی"
آپ نے سمجھا ہے کہ جیسے
میں بھی ہوں اک بُدھو بچی

مانیں یا مت مانیں چچی
بات ہے میری بالکل سچی
سن سن کر یہ بور سی باتیں
کالی ہو گئیں میری راتیں
کہیں بھی جادو گرنی دیکھی
اور نہ دیکھیں دیو کی گھاتیں
چرواہا بھی ملا نہ کوئی
کہاں ہیں ایسی ذاتیں پاتیں؟
شاہ تو بس شطرنج میں ہے اب
وہ بھی کھا جاتا ہے "ماتیں"
ملکہ بھی بس لندن میں ہے
پر وہ کہاں پچھلی "اوقاتیں"
شہزادی بھی کہنے کو "ہے"
لیکن جنگل دیو کی باتیں
جادو گرنی کے "چھومنتر"
بھوت پریت کے مکے لاتیں
سب ہیں فرضی، سب ہیں خیالی
غلط سلط ہیں ایسی باتیں
چچا سے گر پوچھوا دوں میں
ہو جائے گی آپ کی کچی
مانیں یا مت مانیں چچی
بات ہے میری بالکل سچی

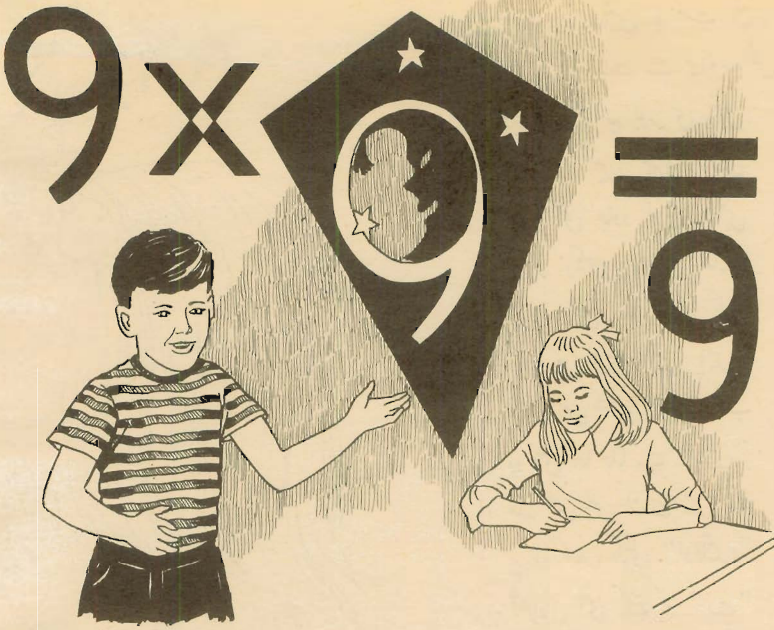

9 کا ہندسہ ایک عجوبہ

مُنیر احمد فردوس

○ 9 کا ہندسہ بھی عجیب ہندسہ ہے اس ہندسہ کو کسی ہندسہ سے بھی ضرب دی جائے لیکن یہ 9 کا 9 ہی رہے گا مثلاً۔

○ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی رقم کے ساتھ 9 کو ضرب دینے اور حاصل ضرب کے اعداد کو جمع کرنے سے نتیجہ اس مثال کی طرح 9 ہی آئے گا۔

○ ۱۸ ـ ۲۷ ـ ۳۶ ـ ۴۵ ـ ۵۴ ـ ۶۳ ـ ۷۲ ـ اور ۸۱ کے اعداد میں دائیں طرف کے ہندسوں کا بتدریج گھٹتے اور بائیں طرف کے ہندسوں کا بتدریج بڑھتے جانا بھی قابل غور عجوبہ ہے جو کسی اور ہندسے کی ضرب میں نہیں پایا جا سکتا۔

○ اگر ایک سے لے کر ۹ تک کے ہندسوں کو جمع کیا جائے تو ان کا حاصل جمع بھی ۹ ہی آئے گا مثلاً ۱۲۳۴۵۶۷۸۹ - ۴۵ (۴۵) - ۹

○ اگر ایک سے لے کر ۹ تک کے ہندسوں میں سے ۸ کے ہندسہ کو نکال دیا جائے اور پھر جس

مفرد ہندسہ کے ساتھ ۹ کو ضرب دی جائے تو پھر ۱۲۳۴۵۶۶۷۹ کے ساتھ حاصل ضرب کی رقم کو ضرب دینے سے اس کے حاصل ضرب میں وہی تمام ہندسے آئیں گے۔ جس مفرد ہندسہ کے ساتھ ۹ کو ضرب دی گئی تھی جس کا عمل اس طرح ہے۔

۱۹ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ -

۱۱۱۱۱۱۱۱۱

۹ ۲ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ

- ۲۲۲۲۲۲۲۲۲

۹ ۳ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ

- ۳۳۳۳۳۳۳۳۳

۹ ۴ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ

- ۴۴۴۴۴۴۴۴۴

۹ ۵ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ

- ۵۵۵۵۵۵۵۵۵

۹ ۶ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ

- ۶۶۶۶۶۶۶۶۶

۹ ۷ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ

- ۷۷۷۷۷۷۷۷۷

۹ ۸ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ

- ۸۸۸۸۸۸۸۸۸

۹ ۹ - کو ضرب دو ۱۲۳۴۵۶۷۹ کے ساتھ

- ۹۹۹۹۹۹۹۹۹

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس
کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں
پہلی پوزیشن
دوسری پوزیشن
یا
تیسری پوزیشن
حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی
ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں
بھجوا دیجئے!
ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سند دیں گے

تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش

ماھنامہ
آنکھ مچولی
1- پی آئی بی کالونی، کراچی۵

کوہ قاف سے واپسی

طارق محمود

رات کے کوئی نو بجے کا عمل ہوگا۔ سب گھر والے گہری نیند سو رہے تھے جبکہ میں اپنے کمرے میں بیٹھا حساب کے پیپر کی تیاری کر رہا تھا۔ صبح حساب کا پیپر تھا جو کافی مشکل تھا۔ میں حساب میں تھوڑا بہت کمزور ہوں اسی لئے ابھی تک تیاری کر رہا تھا۔

پڑھتے پڑھتے مجھے تھکن سی محسوس ہونے لگی تو میں نے کتابیں سمیٹیں اور کرسی سے ٹیک لگا لی۔

مگر ...... یہ کیا! میں نے دیکھا کہ میں ایک خوبصورت سے باغ میں پہنچ گیا ہوں۔ اِدھر اُدھر نگاہ کی تو ہر طرف سر سبز پیڑ ہی پیڑ نظر آئے جو قطاروں کی صورت میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا ہر طرف پھول ہی پھول کھلے ہوئے ہیں۔ زمین پر سبز سبز گھاس بچھی ہوئی ہے۔ ایک طرف دودھ کی ٹھنڈی میٹھی نہر بہہ رہی تھی۔ سچ مچ، نہایت خوبصورت منظر تھا۔ ہر طرف تتلیاں اُڑ رہی تھیں۔

"شاید میں پرستان میں آگیا ہوں۔" میں نے سوچا۔ یکایک میں نے اپنے سامنے ایک بونے کو کھڑے دیکھا۔ وہ مجھے دیکھ کر منہ چڑا رہا تھا، آنکھیں مٹکا رہا تھا اور طرح طرح کی شکلیں بنا رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں ڈر گیا۔

"تت تت تم کون ہو؟" میں نے بونے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ بونے نے عجیب و غریب

لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سر پر سرخ رنگ کی لمبی سی ٹوپی تھی۔ میرے پوچھنے پر وہ آنکھیں مٹکا کر بولا۔ "میں ہوبگولڈن بونا ہوں...... پر چھوٹا سا ہوں۔"
میں حیران تھا۔ "یہ میں کہاں آگیا ہوں، کون سی جگہ ہے یہ؟" میرے پوچھنے پر اس نے بتایا "یہ کوہ قاف ہے طارق بابو، اور مجھے تمہاری رہنمائی کے لئے یہاں بھیجا گیا ہے ...... سیر کرنی ہے؟"
"ہاں ہاں ...... کیوں نہیں۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر اس نے میری انگلی پکڑ لی اور مجھے سیر کرانے لگا۔

وہ آگے آگے اور میں انگلی پکڑائے پیچھے پیچھے چلتے چلتے ہم ایک صاف ستھری جھیل کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں پر میں نے بہت سے سفید سفید بگلے دیکھے جو جھیل کا شفاف پانی پی رہے تھے۔ تھوڑے بہت جنگلی ہرن بھی موجود تھے۔ میں نے اوپر نگاہ کی، درخت آموں اور پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا۔ اس کی روشنی درختوں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔

"میرے اللہ کتنی خوبصورت جگہ ہے یہ ...... میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھی!!" میں دم بخود رہ گیا۔ بونا آنکھیں مٹکانے لگا اور جیب سے ایک ناشپاتی نکال کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

ہم چلتے چلتے ایک نیلی جھیل کے پاس آکر رک گئے۔ میں نے آنکھیں جھپکائیں، لگ رہا تھا جیسے میں جھیل کے قریب آگیا ہوں، میں نے بہت سی گڑیائیں دیکھیں جو سفید سفید فراک پہنے اُڑ رہی تھیں۔ "یہ کون ہیں؟" میں نے بونے سے پوچھا۔ اس نے اپنی طوطے جیسی ناک سکیڑ کر بتایا۔ "یہ ننھی پریاں ہیں چاندنی رات کو یہاں آتی ہیں۔"

"اچھا!!" میں حیران رہ گیا۔

میں نے یہاں پر اور بھی بہت سے بونے دیکھے، جو سیر کر رہے تھے، اُچھل کود کر رہے تھے، شرارتیں کر رہے تھے۔ جھیل کے اس پار خوبصورت جنگلی گلاب کھلے ہوئے تھے۔ جن میں خوبصورت سا مکان گھرا ہوا تھا۔ مکان کی چھت سرخ رنگ کی تھی جب کہ کھڑکیاں روشن روشن تھیں۔ میں نے تو آنکھیں میچ لیں۔ آپ خود سوچیں، ایک پیاری سی جھیل ہو، آسمان پر خوبصورت سا چاند نکلا ہو، پھولوں اور چاند کا عکس نیلی جھیل میں پڑ رہا ہو، ارد گرد خوبصورت پریاں اور بونے اُڑ رہے ہوں، تو پھر آپ کی ذہنی کیفیت کیا ہو سکتی ہے۔

"میں اس مکان کے اندر جانا چاہتا ہوں۔" میں نے بونے سے کہا۔

"ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔" اتنا کہتے ہی ہوبگولڈن بونے نے جو میرا دوست بن چکا تھا، تالی بجائی۔ اس کے تالی بجاتے ہی ایک خوبصورت سی پری نمودار ہوئی۔ یہ پری دوسری پریوں سے کافی مختلف تھی اور اس کے سر پر سنہری تاج تھا۔ "جی فرمایئے! کیا کام ہے؟"

اس نے کہا۔
"ایک کشتی حاضر کی جائے۔" بونے نے بڑے شاہانہ انداز میں کہا۔ فوراً ہی ایک کشتی جھیل میں پہنچ گئی اور کنارے آ لگی۔ "تشریف رکھئے، طارق بابو۔" بونے نے مجھ سے کہا۔ میں حیران پریشان کشتی میں سوار ہو گیا ہوبگولڈن بھی اس میں بیٹھ گیا اور کشتی چل پڑی۔ کشتی ہچکولے کھا رہی تھی جیسے جھولا جھلا رہی ہوں۔ "میرے اللہ، کتنا مزا آرہا ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ آخر کشتی جھیل کے اس پار پہنچ گئی۔ ہم پھولوں کی کیاریوں سے گزرتے ہوئے اس مکان میں پہنچ گئے۔

اندر کا منظر عجیب و غریب تھا۔ یہاں بہت سے چھوٹے قد کے بونے خوبصورت خوبصورت کپڑے پہنے ایک گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ میز کھانے پینے کی مزیدار چیزوں سے سجی ہوئی تھی۔ درمیان میں کیک رکھا ہوا تھا جس کے گرد تین موم بتیاں جل رہی تھیں۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے ہوبگولڈن سے پوچھا۔

"یہاں پر ببلو برجیبزی کی سالگرہ ہو رہی ہے۔" بونے نے مختصر لہجے میں بتایا۔ ہمیں دیکھتے ہی سارے بونے کھڑے ہو گئے۔ "آیئے آیئے طارق بابو...... آپ بھی ہماری سالگرہ میں شامل ہو جائیں۔" ببلو برجیبزی نے کہا۔ میں ڈرتے ڈرتے میز کے پاس آ گیا۔ تمام بونے "ہیپی برتھ ڈے ٹو مُنّا" گانے لگے۔ پھر کھانے کا دور چلا۔ سب نے میز پر پڑی پلیٹیں اُٹھائیں اور کیک کھانے لگے۔ سیر کرتے رہنے کی وجہ سے میری بھوک تیز ہو گئی تھی چنانچہ ایک پلیٹ میں نے بھی اُٹھالی، اور سارا کیک کھا گیا لیکن پھر بھی بھوک باقی تھی میں نے ایک پلیٹ اور اُٹھالی اور بچا کھچا کیک کھانے لگا۔

اس لمحے میں نے دیکھا ہوبگولڈن کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے۔ میں نے دوسرے بونوں کی طرف دیکھا۔ سب نے اپنی اپنی پلیٹیں رکھ دی تھیں اور غصے سے مجھے دیکھنے لگے تھے۔ "یہ اپنے حصّے سے زیادہ کھاتا ہے۔" ببلو برجیبزی نے چیخ کر کہا۔ "بہت بدتمیز ہے یہ مارو مارو۔" ہوبگولڈن نے کہا۔ بونے مجھے مارنے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔ مارے خوف کے کیک کی پلیٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس پر بونے آپے سے باہر ہو گئے اور ہاتھوں میں بڑے بڑے ڈنڈے لے کر میری طرف دوڑے۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔

وہ بونے بڑے جنّات میں تبدیل ہو رہے تھے۔ پھر وہ میری طرف لپکے جب میں نے بچاؤ کی کوئی صورت نہ دیکھی تو واپس دوسرے کمرے میں بھاگا۔ اس کمرے میں جہاں تھوڑی دیر پہلے کہانیوں کی کتاب "پریاں اور بونے" پڑھتے پڑھتے میری آنکھ لگ گئی تھی!!! ■

واقعی سہولت تو حبیب بناسپتی کی ہے

صارفین کی سہولت کے لئے آسانی سے کھلنے اور بند ہونے والا ڈھکنا اور اس کے نیچے نرم فوائل کی سیل جس کی بدولت **حبیب** بناسپتی کی اعلیٰ کوالٹی اور تازگی آخر تک برقرار۔

بہتر تو تھا ہی اب سب سے بہترین

MASS

عرفان اور وارث کی شوخ لکیریں

عبدالوارث

دو بھائی
دو کارٹونسٹ

طاہر مسعود

فرقان

اس روز موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ تین لڑکے بارش میں بھیگتے ہوئے دفتر میں گھس آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں چھتری بھی تھی لیکن تین افراد کو بارش کی بوچھاڑ سے بچانے کے لئے ایک چھتری نہایت ناکافی تھی۔ انہوں نے پہلے چھتری بند کی، اپنے حلیے کو درست کیا اور پھر ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے عبدالوارث کہتے ہیں۔"

"اور میرا نام فرقان وہاب ہے۔"

میں نے تیسرے نوجوان کو خاموش پا کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔

"میں ان دونوں کا بھائی ہوں۔"

"لیکن آپ کا بھی کوئی نام تو ہو گا۔"

جی ہاں! فیصل وہاب، اصل میں وارث اور فرقان تو آپ کے ہاں کارٹون وغیرہ بناتے رہتے ہیں۔ ان کو تو آپ پہلے سے جانتے ہوں گے؟"

"ہم اسی سلسلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔ آنکھ مچولی نے ہماری بڑی حوصلہ افزائی کی ہے۔"

عبدالوارث نے کہا۔

"بھئی شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہئے۔ ماشاء اللہ آپ دونوں تو بہت ہی باصلاحیت ہیں لیکن آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں۔ بیٹھ جائیے۔" میں نے کہا۔

"صلاحیت کے ساتھ حوصلہ افزائی بھی تو ضروری ہے۔" فرقان وہاب بیٹھتے ہوئے بولے۔ یہ صاحبزادے دیکھنے میں تو بہت ہی چھوٹے معلوم ہو رہے تھے۔ تینوں بھائیوں سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور یہ دلچسپ انکشاف بھی ہوا کہ پورا گھرانا آرٹسٹ ہے۔ چلتے ہوئے فرقان میاں نے اپنی قمیض کے اندر سے ایک بڑا سا

لفافہ نکالا اور کہا "یہ میں نے آنکھ مچولی کے خاص نمبر کے لئے ٹائیٹل بنایا تھا۔ اگر پسند آئے تو چھاپ دیجئے گا۔"

ٹائیٹل خاصا خوبصورت تھا۔ خصوصاً رنگوں کا انتخاب تو بہت اچھا تھا، البتہ لکیریں کہیں کہیں کمزور تھیں۔ میں نے کہا۔ "بھئی اسے آپ نے قمیض کے اندر کیوں چھپا رکھا تھا۔"

"بارش کی وجہ سے۔" فرقان نے ہنس کر کہا۔

میں ان لوگوں کی تہذیب و شائستگی سے بہت متاثر ہوا۔ لڑکے اگر باصلاحیت اور مہذب ہوں تو کسے اچھے نہیں لگتے۔ میں نے ان سے کہا کہ کسی دن فرصت میں آئیں تو ذرا تفصیل سے بات چیت ہو اور آنکھ مچولی کے پڑھنے والوں سے آپ کا تعارف کرا دیا جائے۔ انہوں نے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔

چند روز بعد دونوں بھائی وعدے کے مطابق آ گئے۔ ان سے جو بات چیت ہوئی۔ وہ قارئین آنکھ مچولی کے مطالعے کے لئے پیش خدمت ہے،

سوال: بھئی سب سے پہلے تو آپ لوگ اپنے بارے میں بتایئے۔

عبدالوارث: میں نے فرسٹ ائیر کامرس کا امتحان دیا ہے۔

فرقان وہاب: میں شاہین سیکنڈری اسکول میں پڑھتا ہوں۔ آٹھویں جماعت کا امتحان دیا ہے۔

سوال: یہ مصوری کا شوق کیسے ہوا؟

عبدالوارث: ہمارے بڑے بھائی جمال عبدالناصر شوقیہ آرٹسٹ ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ہم لوگوں کو بھی دلچسپی ہوئی۔ بھائی صاحب نے حوصلہ افزائی کی۔ ان کی ہمت بڑھانے سے شوق بڑھا اور باری باری ہم سب تصویریں بنانے لگے۔

فرقان وہاب: جی ہاں جمال بھائی نے بہت مدد کی۔ وہ مجھے کومکس وغیرہ لا کر دیتے تھے۔ اس میں ڈونلڈ ڈک اور مکی ماؤس وغیرہ کے کارٹون دیکھ دیکھ کر میں نے بنانا شروع کیا۔ جمال بھائی رہنمائی کرتے تھے۔ کہیں غلطی وغیرہ ہو جاتی تو بتاتے تھے کہ یوں نہیں یوں بناؤ۔

سوال: آپ لوگ تصویریں بھی بناتے ہیں اور کارٹون بھی۔ لیکن زیادہ دلچسپی کس میں ہے؟

فرقان وہاب: مجھے تو کارٹون بنانا اچھا لگتا ہے۔ وارث بھائی کو تصویریں بنانے میں مزہ آتا ہے۔

سوال: ہم نے سنا ہے، کہ بگڑا ہوا مصور کارٹونسٹ بن جاتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

عبدالوارث: سنا تو ہم نے بھی ہے لیکن ہمیں کچھ بننے تو دیجئے۔ ابھی تو ہم لوگ کچھ بھی نہیں بنے ہیں۔ ابھی تو سیکھنے سکھانے کے دن ہیں۔

سوال: آپ لوگ جو کارٹون بناتے ہیں اس کا آئیڈیا کہاں سے لیتے ہیں؟

عبدالوارث : آئیڈیا تو ہمارا اپنا ہوتا ہے۔ گرد و پیش میں جو واقعات پیش آتے رہتے ہیں ان سے کارٹونسٹ متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً ٹریفک کے مسائل ہیں، ظاہر ہے ہمیں آئے دن اس مسئلے کا سامنا رہتا ہے اس مسئلے سے کسی کارٹون کا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔

سوال : انگریزی رسائل وغیرہ سے تو آئیڈیا نہیں اڑاتے ہیں؟

فرقان وہاب : انگریزی رسائل وغیرہ ہم لوگ دیکھتے رہتے ہیں اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے کومکس وغیرہ دیکھ کر ہی کارٹون وغیرہ بنانا سیکھا۔ لیکن انگریزی رسائل سے کارٹون کا آئیڈیا ہم نہیں اڑاتے ہاں یہ ہوتا ہے کہ کوئی لطیفہ سنا تو اس کو کارٹون کی شکل دے دی۔

سوال : کبھی کسی سے لڑائی ہو جائے تو غصے میں اس کا کارٹون بنانے کا جی تو نہیں چاہتا۔

عبدالوارث : (ہنس کر) ایسا ممکن تو ہے لیکن کبھی ایسا ہوا نہیں۔

سوال : اگر کبھی ایسا ہوا تو کارٹون کیسا بنے گا؟

فرقان وہاب : غصے میں کارٹون بنایا تو کارٹون ہیبت ناک ہو جائے گا۔

سوال : پاکستان کا کون سا کارٹونسٹ پسند ہے؟

عبدالوارث : جاوید اقبال۔ ویسے زیدی بھی اچھے کارٹون بناتے ہیں لیکن جاوید اقبال کی لائینیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔

فرقان وہاب : جاوید اقبال کے کارٹون بہت مزیدار ہوتے ہیں۔

عبدالوارث : وہ چہرے کے تاثرات عمدہ بناتے ہیں بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔

سوال : ایک اچھے کارٹون کی آپ کیا تعریف کریں گے؟

فرقان وہاب : جسے دیکھ کر ہنسی آ جائے۔

عبدالوارث : کسی بھی موضوع پر چند لکیروں کو دلچسپ انداز میں کھینچ دینے سے کارٹون وجود میں آ جاتا ہے۔

سوال : کوئی تصویر اگر خراب ہو جائے تو کیا اسے کارٹون کہیں گے؟

فرقان وہاب : تصویر اگر "خراب" ہو جائے تو میں اسے دوبارہ بناتا ہوں کیونکہ تصویر اور کارٹون دو الگ چیزیں ہیں۔

سوال : یہ بتائیے کہ آپ دونوں میں سے کون زیادہ اچھا کارٹونسٹ ہے؟

عبدالوارث : کارٹون تو فرقان کے اچھے ہوتے ہیں میں تصویر زیادہ اچھی بناتا ہوں۔

فرقان وہاب : کارٹون میں وارث بھائی کی لائنیں مجھ سے زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔

سوال : آپ لوگ انکساری سے تو کام نہیں لے رہے ہیں؟

عبدالوارث : نہیں فرقان کے کارٹون واقعی اچھے ہوتے ہیں۔

سوال : آپ لوگوں نے اب تک کتنی تصویریں اور کارٹون بنائے ہیں؟

فرقان وہاب: میں نے تقریباً ڈیڑھ سو کارٹون بنائے ہیں اور تیس پینتیس تصویریں بنائی ہیں۔

عبدالوارث: میں نے اسّی کے قریب تصویریں بنائی ہیں اور پچّیس تیس کارٹون۔

سوال: دوستوں اور عزیزوں میں تو آپ لوگوں کے فن کی بڑی دھوم ہوگی۔

عبدالوارث: جی ہاں! پریکٹیکل شروع ہوتے ہی دوستوں کے جرنلز آنے لگتے ہیں بلکہ ہمارے بنائے ہوئے ڈائی گرام وغیرہ پر کئی دوستوں کو انعام بھی مل چکا ہے۔

فرقان وہاب: میں نے کارڈ شیٹ سے فیصل مسجد کا ایک خوبصورت سا ماڈل بنایا تھا وہ میرے پرنسپل صاحب کو اتنا پسند آیا کہ وہ اپنے گھر لے گئے۔ مجھے اسکول میں یومِ دفاع اور یومِ آزادی کے موقع پر تصویریں بنانے پر مسلسل دو سال سے انعام مل رہا ہے۔

عبدالوارث: ہمارے کالج میں سائنسی نمائش ہوئی تھی۔ اس میں میں نے انسان کے نظام ہضم کا ڈائی گرام بنایا تھا اس پر مجھے انعام ملا تھا۔

سوال: آپ لوگ پڑھنے لکھنے میں بھی دلچسپی لیتے ہیں یا ہر وقت کارٹون اور تصویریں بناتے رہتے ہیں؟

عبدالوارث: مصوری یا کارٹون بنانا ہمارا مشغلہ ہے۔ اس شوق کو ہم نے اپنے اوپر حاوی نہیں کیا ہے۔ پڑھنے لکھنے کو ہم پورا وقت دیتے ہیں۔ میٹرک میں میرے ٦٤ فیصد نمبر آئے تھے۔ اب میں کامرس پڑھ رہا ہوں۔ مستقبل میں میرا سی اے کرنے کا ارادہ ہے۔

سوال: آپ کتنے بھائی بہن ہیں؟

فرقان وہاب: سات! جمال عبدالناصر، نغمہ پروین، فرحان وہاب، فیصل وہاب، روبینہ پروین، پھر عبدالوارث آخر میں میری باری آتی ہے۔ ہم چار بھائی آرٹسٹ ہیں۔ فرحان اور دونوں بہنوں کو بھی آرٹ سے دلچسپی ہے اور وہ بھی کچھ نہ کچھ بنا لیتے ہیں۔ گھر میں اتنے آرٹسٹ ہونے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی تصویروں کی خامیوں کا فوراً پتہ چل جاتا ہے۔

سوال: آپ کے ابو امی اس مشغلے سے خوش ہیں؟

عبدالوارث: جی ہاں جب ہمارے کارٹون وغیرہ چھپتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

سوال: اچھا بھئی آپ لوگوں سے مزے مزے کی باتیں ہوگئیں۔ خدا کرے آپ لوگ اچھے مصور اور اچھے کارٹونسٹ کی حیثیت سے نام پیدا کریں۔ ابھی تو آپ لوگ بہت نوعمر ہیں۔

عبدالوارث: جی ہاں میری عمر سترہ برس ہے اور فرقان پندرہ سال کے ہیں دعا کیجئے کہ ہم لوگ آپ کی امیدوں پر پورے اتر سکیں۔

گھر یا چڑیا گھر

پروفیسر عنایت علی خان

بچہ اک چڑیا گھر آیا
سارے چڑیا گھر میں گھوما
گھوم کے اک اک جنگلا دیکھا
پھر آ کر اک لان میں بیٹھا
پھر اپنے ابو سے بولا
ابو رتیا یہ رتلیا دَھل اے؟
اول اَدل یہ رتلیا دَھل اے
رتلیا پھل بتلائیں تدھل اے
باپ نے دور اک چڑیا دیکھی
جو اک جنگلے پر بیٹھی تھی
بولا دیکھو وہ ہے چڑیا
بچے نے چڑیا کو دیکھا
دیکھا پھر کچھ سوچ کے بولا
ایچھی تو اپنے بی دھل اے
رپھل رتیا وہ بھی رتلیا دَھل ہے؟

۱۔ ابو کیا یہ چڑیا گھر ہے
۲۔ اور اگر یہ چڑیا گھر ہے   چڑیا پھر بتلائیں
کدھر ہے
۳۔ ایسی تو اپنے بھی گھر ہے
۴۔ پھر کیا وہ بھی چڑیا گھر ہے

عاشی بی

ارشاد محمد

یہ جو عاشی بی تھیں ناں ...... یہ بڑی ہی معصوم تھیں اور معصومیت میں ایسی ایسی باتیں کرتیں تھیں کہ امی تو امی ڈیڈی بھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتے اور کبھی عاشی بی کو گھورتے، کبھی ڈانٹتے اور کبھی پیار سے سمجھاتے۔ مگر عاشی بی بھی بھولپن میں اپنا ثانی نہ رکھتیں تھیں۔ البتہ ان کی ایک نانی تھیں، وہ جب دیکھتیں کہ عاشی بی کے سوالات سے ڈیڈی اب بُری طرح زچ ہو چکے ہیں، تو وہ عاشی بی کو جلدی سے گود میں اٹھالیتیں اور ہلکے سے ان کے لال لال گال پر چپت مارتے ہوئے کہتیں: "دیکھو بیٹا! ڈیڈی کو تنگ نہیں کرتے، انہیں کام کرنے دو۔ آؤ ہم تمہیں اچھی سی کہانی سناتے ہیں۔" یوں ڈیڈی کے سر سے بلاٹل جاتی اور وہ سکون کا سانس لیتے۔

ایک دن ڈیڈی دفتر سے واپس آئے تو پتا چلا عاشی بی کو ان کے ماموں اپنے ہاں لے گئے ہیں۔ ڈیڈی بڑے خوش ہوئے کہ چلو آج تو اطمینان سے اخبار پڑھ سکوں گا۔ پھر انہوں نے کپڑے بدلے، نہائے اور کھانے کی میز پر آگئے۔ مگر آج کھانے میں انہیں مزا نہیں آیا۔ حالانکہ عاشی بی کی امی بہت اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ نانی بھی بڑی خاموشی سے کھانا کھارہی تھیں۔ عاشی بی کی امی نے جو یہ دیکھا تو بولیں: "کیا بات ہے، آج آپ کچھ خاموش نظر

آرہے ہیں؟" خدانخواستہ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" "ہنھ ...... ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" عاشی بی کے ڈیڈی چونک سے گئے۔ "پھر کیابات ہے ...... اتنی خاموشی پہلے تو کھانے پر کبھی نہیں ہوتی تھی۔" عاشی بی کی امی بولیں۔ "بھائی خاموشی کیوں نہ ہو...... آج ہماری گڑیا باتوں کی پڑیا تو ہے نہیں، بات کون کرے!" نانی اماں نے کہا۔ "ہاں اماں آپ ٹھیک کہتیں ہیں ...... عاشی نہیں ہے تو کھانا ہی نہیں کھایا جارہا۔" ڈیڈی نے اداس لہجے میں کہا۔ "بھئی آپ کھانا تو کھائیں، عاشی کو اس کے ماموں لے گئے ہیں، کل واپس آجائے گی۔" عاشی کی امی نے انہیں اداس دیکھ کر کہا۔

دوسرے دن جب ڈیڈی دفتر سے واپس آئے تو عاشی بی دوڑ کر ان کی گود میں چڑھ گئیں۔ ڈیڈی نے فوراً بریف کیس نیچے رکھ کر انہیں لپٹالیا، اور چٹاخ چٹاخ انہیں چومنا شروع کر دیا۔ اچانک عاشی بی نے اپنی چھوٹی چھوٹی ہتھیلیاں ڈیڈی کے گالوں پر رکھیں اور ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں۔ "ڈیڈی! یہ چڑیا بچے کیوں نہیں دیتی؟ انڈے دے کر انتظار کیوں کراتی ہے؟" "بھئی عاشی! بس اللہ میاں نے چڑیا سے یہی کہا ہے کہ وہ انڈے دیں۔" "اچھاتو پھر اللہ میاں نے مانو بلی سے انڈے کیوں نہیں دلائے، وہ تو بچے دیتی ہے۔" عاشی بی اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے بولیں۔ اور ڈیڈی کے کانوں میں خطرے کے سائرن بجنے لگے کہ میاں ظفر صاحب! اب تمہاری خیر نہیں...... ڈیڈی نے عاشی بی کو لاکر کرسی پر بٹھایا اور بولے۔ "گڑیا! تم یہاں بیٹھو، ہم نہا کر آجائیں پھر تمہیں بتائیں گے کہ بلی بچے کیوں دیتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ باتھ روم میں گھس گئے۔ نہاتے ہوئے بھی ظفر صاحب یہی سوچ رہے تھے کہ آخر یہ بلی بچے کیوں دیتی ہے؟ کیوں کہ انہیں عاشی بی کو مطمئن کرنا تھا، اور یہ ان کے نزدیک دنیا کا سب سے مشکل کام تھا۔

کھانے کی میز پر ڈیڈی نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو عاشی بیٹا! اللہ میاں نے ہر جاندار کے ذمے ان کی صلاحیت کو دیکھتے ہوئے کام لگائے ہیں۔ دیکھو بھئی ہاتھی گنا کھاتا ہے، کتا ہڈی بڑے شوق سے کھاتا ہے، حالانکہ انسان ہڈی پھینک دیتا ہے۔ بکری گھاس کھاتی ہے اور شیر گھاس کے قریب ہی نہیں جاتا، وہ گوشت کھاتا ہے۔ اسی طرح ...." "ڈیڈی!" عاشی بی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے ان کی بات کاٹی...... "یہ تو ہمیں بھی پتا ہے۔" "بیٹا! میں تمہیں یہی بتارہا ہوں کہ بالکل اسی طرح کوئی جانور بچے دیتا ہے، اور کوئی انڈے۔ جس طرح شیر گھاس نہیں کھا سکتا اور بکری گوشت، اسی طرح چڑیا بچے نہیں دے سکتی اور بلی انڈے۔" ڈیڈی نے اپنی دانست میں عاشی کو سمجھایا مگر مطمئن وہ خود بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ "مگر ڈیڈی! ہم تو یہ پوچھ رہے تھے کہ بلی انڈے کیوں نہیں دیتی؟" عاشی بی نے وہی مُرغے

کی ایک ٹانگ کے مصداق اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کرسی سے نیچے اُتریں اور ڈیڈی کے پاس آکر ان کے پہلو سے لگ کر کہنے لگیں:

"ڈیڈی! آپ بڑے ہیں، مانو آپ کی بات مان جائے گی، آپ اسے ڈانٹیں اور اس سے کہیں کہ وہ چڑیا سے بات کر کے ادلہ بدلہ کر لے اور انڈے دے۔" اور ڈیڈی نے غصے سے تلملا کر عاشی بی کے گال پر زور سے ایک چانٹا مار دیا۔ بس پھر کیا تھا عاشی بی تو لگیں زور زور سے رونے۔ نانی اماں نے لپک کر انہیں اٹھالیا اور پُچکارتے ہوئے ڈیڈی سے بولیں: "بچوں کو ایسے نہیں مارتے، پیار سے سمجھاتے ہیں، ایسے تو بچے ڈر کی وجہ سے سوال کرنا ہی چھوڑ دیں گے۔" "تو پھر آپ ہی بتائیں میں اسے کیسے سمجھاؤں۔" ڈیڈی نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں سمجھانے کی، میں خود ہی سمجھا لوں گی۔ بھلا بتاؤ! پھول جیسی بچی کو کہیں مارا جاتا ہے!" نانی اماں نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔ اور عاشی بی کو اٹھائے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

پھر جوگُر کی بات نانی اماں نے عاشی بی کو بتائی، اسے سن کر تو عاشی بی خوشی سے نہال ہو گئیں اور اچک کر نانی اماں کی پپّی لے لی ۔پھر بھاگی بھاگی امی کے پاس پہنچیں اور کہنے لگیں ۔"امی امی جی..... نانی اماں کہتی ہیں "جتنے بھی پرندے ہیں سب انڈے دیتے ہیں اور جتنے بھی پرندے نہیں ہیں سب بچے دیتے ہیں ۔" عاشی بی نے تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔ "اور امی ..... نانی اماں یہ بھی کہتی ہیں کہ جن جانوروں کے کان باہر ہوتے ہیں ناں وہ بچے دیتے ہیں اور جن کے کان دِکھتے نہیں ہیں وہ انڈے دیتے ہیں۔" عاشی بی نے مسلسل بولتے ہوئے کہا۔ "اور نانی اماں"..... عاشی بی سانس لینے کو رکیں تو امی نے مسکرا کر انہیں گود میں اُٹھالیا اور اپنے دوپٹے سے ان کے منہ پر آیا ہوا پسینا پونچھنے لگیں۔ بھاگ کر آنے اور جلدی جلدی بولنے کی وجہ سے ان کا چہرہ لال بھبھو کا ہو گیا تھا۔ ڈیڈی بھی کرسی پر بیٹھے مسکرا مسکرا کر انہیں دیکھ رہے تھے، اور سوچ رہے تھے کہ اتنی چھوٹی سی بات اس وقت ان کے ذہن میں کیوں نہ آئی۔

شام کو سب لوگ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اچانک عاشی بی اٹھیں اور کیاری کے کنارے سے ایک ڈبا اٹھا کر قریب پڑے ہوئے پائپ سے اس میں پانی بھرنے لگیں اور وہیں سے چلائیں ...... "ڈیڈی! کتنا پانی ڈالتے ہیں" ......؟ "کاہے میں بھئی" ......! ڈیڈی حیرانی سے بولے۔ "ڈیڈی میں نے بیج بویا ہے ناں اس میں پانی ڈال رہی ہوں۔" عاشی بی نے وہیں سے جواب دیا۔ "ارے گڑیا بہت تھوڑا سا پانی اس میں رہنے دو۔" پھر انہوں نے ڈبا کیاری کے کنارے رکھا اور واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ "کس چیز کا پودا لگایا ہے میری بٹی نے ......؟" امی نے ٹشو سے ان کے ہاتھ خشک کرتے ہوئے کہا۔ "سیب کا۔" عاشی بی بولیں۔ اور امی ان کی سادگی پر مسکرانے

لگیں کہ کہیں درخت بھی ڈبوں میں لگتے ہیں۔
"ڈیڈی!" عاشی بی بدستور ڈبے کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں...... "کتنی دیر میں پودا نکلے گا؟" اب تو ڈیڈی کا ماتھا ٹھنکا!! "کیا مطلب ہے عاشی؟ پودا اتنی جلدی تھوڑی نکلا کرتا ہے، اس میں تو کئی دن لگیں گے۔" "جی نہیں...... جی نہیں......" عاشی بی فوراً بولیں۔ "کل جو ٹی وی پر فلم آئی تھی اس میں تو پودے جلدی جلدی نکل رہے تھے...... دیکھ لینا ڈیڈی...... جب آپ چائے پی چکیں گے تو پودا نکل آئے گا۔" یہ سن کر تو ڈیڈی پریشان ہو گئے کہ آخر اس عاشی کو کیسے سمجھایا جائے۔ "دیکھو بٹیا ہماری بات سنو!" نانی اماں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جو ٹی وی پر فلمیں آتی ہیں نا...... یہ سب تو سائنس کا کمال ہے، جب ہماری عاشی بڑی ہو جائے گی تو تمہیں خود پتا لگ جائے گا۔" نانی اماں نے ان کے بالوں میں لگے ہیر پن ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ نانی اماں کی بات سن کر پہلے تو عاشی بی خاموش ہو گئیں پھر بولیں: "نانی اماں! ہم بڑے کب ہوں گے......؟" اور پھر نانی اماں کا جواب سننے سے پہلے ہی بول پڑیں۔ "نانی اماں آپ نے کہا تھا کہ اللہ میاں ہر کچھ کر سکتے ہیں، بس اللہ میاں سے سچے دل سے دعا کرنی چاہئے۔" نانی اماں نے جواب دیا۔ "سچا دل کیسا ہوتا ہے نانی اماں......؟" عاشی بی نے انتہائی بھولپن سے دوسرا سوال داغ دیا۔ ایک لمحے کو تو نانی اماں گھبرا گئیں۔ دوسری طرف عاشی بی کی امی اور ڈیڈی اس گفتگو سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ پھر نانی اماں فوراً ہی سنبھل کر بولیں۔ "بٹیا جب دعا مانگتے مانگتے آنکھوں میں آنسو آ جائیں تو سمجھ لو وہی سچے دل کی دعا ہے۔" نانی اماں کا جواب سن کر عاشی بی بڑی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

رات جب نانی اماں نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر سونے کے لئے لیٹنے لگیں تو حسب معمول وہ عاشی بی کے کمرے میں جھانکنے گئیں۔ اندر جو منظر نظر آیا وہ انہیں پریشان کرنے کے لئے کافی تھا۔ عاشی بی اپنے بیڈ پر بیٹھی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھیں۔ نانی اماں تو ایک دم گھبرا گئیں اور فوراً اندر داخل ہو کر جھٹ عاشی بی کو گود میں اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور انہیں چپ کراتے ہوئے بولیں: "کیا ہوا، بٹیا، ڈیڈی نے کچھ کہا ہے؟" "نہیں۔" عاشی بی نے جواب دیا۔ "پھر کیا ہوا...... کہیں پیٹ میں درد تو نہیں؟" "نہیں"...... عاشی بی نے پھر جواب دیا۔ "تو کیا ہوا نانی کی جان! رو کیوں رہی ہو؟" نانی اماں نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "ہم تو اللہ میاں سے سچے دل سے دعا مانگ رہے تھے۔" عاشی بی نے جواب دیا تو نانی اماں کو ایک دم ہنسی آ گئی۔ "آپ ہنس کیوں رہی ہیں نانی اماں!! عاشی بی رونا دھونا بھول کر حیرانی سے نانی اماں کو تکنے لگیں۔ "بھئی تم رو رہی ہونا...... اسی لئے ہم ہنس رہے ہیں۔" "یہ تو بری بات ہے نانی اماں...... آپ نے تو کہا تھا کسی کو روتے دیکھ کر ہنستے نہیں......!!" عاشی بی نے اور زیادہ حیران ہوتے ہوئے

کہا۔ "بھئی غلطی ہو گئی بیٹا ...... ہمیں معاف کر دو!" نانی اماں نے کہا، پھر عاشی بی کی پیشانی چوم کر انہیں کندھے سے لگا کر سُلانے کی کوشش کرنے لگیں۔

دوسرے دن حسبِ معمول سب لوگ لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ عاشی بی اندر سے دوڑتی ہوئی آئیں اور نانی اماں کی گردن میں دونوں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولیں۔ "نانی اماں آپ نے ہم سے جھوٹ بولا تھا ناں ...... ؟" "کیسا جھوٹ بیٹا!!" نانی اماں حیرانی سے بولیں۔ "عاشی بڑوں سے ایسے بات کرتے ہیں کہیں!!" امی نے انہیں ڈانٹا۔ "تم چپ رہو بھئی!" نانی اماں نے امی کو ڈانٹ دیا۔ "ہاں بھئی عاشی! بولو تم کیا کہہ رہی تھیں؟" "نانی اماں آپ نے کہا تھا ناں کہ جتنے بھی پرندے ہوتے ہیں وہ انڈے دیتے ہیں اور جتنے بھی پرندے نہیں ہوتے وہ بچے دیتے ہیں!!" "ہاں بھئی کہا تو تھا۔" نانی اماں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ کیوں کہ انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ عاشی بی کو کوئی نئی بات پتا چلی ہے۔ "تو نانی اماں! وہ جو ٹی وی میں آنٹی بیٹھی ہیں ناں ...... (عاشی بی نے بڑے ڈرامائی انداز میں کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) وہ کہتی ہیں کہ چمگادڑ پرندہ ہے لیکن بچے دیتا ہے۔" عاشی بی نے فرفر بولتے ہوئے کہا ...... اور امی، ڈیڈی جو بڑے غور سے عاشی بی کی باتیں سن رہے تھے انہیں ایک دم ہنسی آ گئی، ڈیڈی کے کپڑوں پر تو گرم گرم چائے بھی گر گئی۔ پھر تو سبھی خوب زور زور سے ہنسنے لگے۔ اور عاشی بی حیرانی سے باری باری سب کی طرف دیکھنے لگیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سب لوگ کیوں ہنس رہے ہیں۔ پھر اچانک وہ نانی اماں کی گود سے اُتریں اور کیاری کے قریب ڈبے کے پاس پہنچ گئیں اور ایک دم خوشی سے چلااُٹھیں۔ "ہائے اللہ...... نانی اماں پودا نکل آیا ...... پودا نکل آیا ......" عاشی بی وہیں کھڑی کھڑی خوشی سے جھومنے لگیں اور ڈبا اٹھا کر چائے کی ٹیبل پر لا کر رکھ دیا۔ ڈبے میں واقعی ایک چھوٹا سا ننھا منا پودا اگا ہوا تھا اور عاشی بی اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہوئی جا رہی تھیں۔

"دیکھا ڈیڈی! ہم نے رات کو سچے دل سے دعا جو مانگی تھی ...... جبھی تو اللہ میاں نے اتّی جلدی پودا اُگا دیا۔ پتا ہے امی!" عاشی بی نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اللہ میاں سب کچھ کر سکتے ہیں۔" "ہاں بھئی اللہ میاں واقعی سب کچھ کر سکتے ہیں۔" امی نے انہیں گود میں اٹھا کر چومتے ہوئے کہا۔

پھر دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں گزرتے گئے۔ اور آخر ایک دن وہ بھی آیا جب عاشی بی کی شادی ہو گئی۔ اور وہ امی، ڈیڈی اور نانی اماں کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے ساتھ سات سمندر پار میکسیکو جا بسیں۔ عاشی بی کی رخصتی کے وقت ڈیڈی کیسا پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ اتنا تو ان کی امی بھی نہیں روئی تھیں۔ عاشی بی کے سہرے کے کئی نوٹ ان کے آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔ عاشی بی

بھی ڈیڈی کے کندھے سے لگ کر خوب ہی روئی تھیں۔ اور جب ان کی امی نے انہیں گلے لگایا تو گویا دریا ہی بہہ نکلے۔ وہاں موجود سبھی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ سب رشتے داروں کو پتا تھا کہ عاشی بی کیسی پٹر پٹر باتیں کرتیں تھی۔ اب ڈیڈی سے کون باتیں کرے گا؟ کس کی باتوں پر ڈیڈی قہقہے لگائیں گے؟ کس سے خفا ہوں گے؟ ان کی ایک ہی تو پیاری بیٹی تھی ...... وہ بھی رخصت ہو گئی۔

عاشی بی کی شادی کو پورے پانچ سال گزر چکے تھے۔ اور عاشی بی کی ایک پیاری سی گڑیا بھی ہو گئی تھی جس کی کئی تصویریں انہوں نے میکسیکو سے گھر بھجوائی تھیں۔ عاشی بی نے اپنی گڑیا کا نام "مہک" رکھا تھا۔ وہ بالکل اپنی امی کی فوٹو کاپی تھی۔ کوئی شناخت ہی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ عاشی بی ہیں یا ان کی بیٹی مہک۔ ڈیڈی نے تو سب تصویریں فریم کرا کے گھر کی دیواروں پر لگا دیں تھیں اور بار بار انہیں دیکھتے تھے۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عاشی بی کے جانے سے گھر میں ایسی ویرانی، ایسی خاموشی ہو جائے گی۔ ڈیڈی نے تو بولنا ہی کم کر دیا تھا۔ بس سارا دن کتابوں میں ہی کھوئے رہتے۔ اور کتابیں تو دھوکا تھیں۔ ...... وہ تو نانی اماں اور امی کے سوالات سے بچنے کے لئے ایسا کرتے تھے ورنہ تو اکثر و بیشتر کتابوں میں عاشی بی کی تصویریں ہوتی تھیں۔ پھر جب کتابوں سے دل بھر جاتا تو ٹیپ لگا کر عاشی بی کی ریکارڈ شدہ بھولی بھالی باتیں سنتے اور بجائے ہنسنے کے رونے لگتے!! امی نے تو کئی دفعہ کیسٹیں چھپا دی تھیں لیکن ڈیڈی کو عاشی بی سے ایسی محبت تھی کہ آخر کار امی کو کیسٹیں واپس کرنی پڑتیں۔

سردیوں کے دن تھے ...... گیارہ بجے کا وقت ...... ڈیڈی لان میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ نوکر ایک خط لئے آگیا۔ "یہ خط ڈاکیا دے گیا ہے صاحب۔" "اچھا تم جاؤ۔" ڈیڈی نے خط اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ خط عاشی بی کا تھا۔ بھلا ڈیڈی اپنی جان عاشی بی کی ہینڈ رائٹنگ نہیں پہچانتے تو اور کون پہچانتا۔ پھر اس پر عاشی بی کا نام اور پتا بھی لکھا تھا۔ خط پڑھ کر تو ڈیڈی مارے خوشی کے ناچنے لگے۔ عاشی بی نے مستقل پاکستان آنے کی نوید جو سنائی تھی۔ اس لئے ڈیڈی خوشی سے دیوانے ہونے میں بالکل حق بجانب تھے۔ انہوں نے چلّا چلّا کر امی اور نانی اماں کو وہیں بلالیا اور پھر تو سب ہی خوشی سے دیوانے ہو گئے۔ وہ رو بھی رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔ نوکر دور کھڑا بڑی حیرانی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس بیچارے کو کیا معلوم کہ انہیں کتنی بڑی خوشی ملی ہے، ابھی اسے ملازمت کئے ایک ماہ ہی تو ہوا تھا!!

عاشی بی کیا آئیں، گویا زندگی لوٹ آئی۔ امی، نانی، ڈیڈی، سب ایسے بولنے لگے تھے جیسے چابی بھر دی گئی ہو۔ ڈیڈی تو عاشی بی کی فوٹو کاپی مہک کو اٹھائے اٹھائے پھرتے۔ وہ باتیں بھی اپنی امی کی

عجیب و غریب مرغ

جاپان میں ایسے مرغ پائے جاتے ہیں جن کی دم ۸ سے ۲۵ فٹ تک طویل تک ہوتی ہے ان کا شمار دنیا کے نہایت قیمتی پرندوں میں ہوتا ہے۔

طرح ہی کرتی اور ڈیڈی اسے بار بار چومتے۔

ایک دن ڈیڈی نے عاشی بی کو ان کے بچپن کی ریکارڈ کی ہوئی باتیں سنائیں تو عاشی بی کو ہنسی بھی آئی اور شرمندگی بھی ہوئی کہ وہ بھی کیسی عجیب عجیب باتیں کرتی تھیں عاشی بی کے شوہر سہیل میاں نے تو ان کا خوب ہی مذاق اڑایا جس سے وہ ان سے ناراض ہو گئیں۔

ایک دفعہ مہک نے بالکل وہی حرکت کی جو برسوں پہلے عاشی بی کر چکیں تھیں۔ یعنی انھوں نے بھی گملے میں مالٹے کا بیج بو دیا۔ اور لگیں اللہ میاں سے دعا مانگنے۔ عاشی بی پہلے تو انہیں دیکھتی رہیں لیکن جب ان کا دعا مانگنا ختم ہی نہ ہوا تو وہ انہیں ڈانٹنے لگیں۔ "مہک! یہ کیا بدتمیزی ہے؟ ایسے بھی کہیں پودے اگتے ہیں؟" اچانک ڈیڈی بیچ میں بول پڑے۔ "ہاں بھئی عاشی پودے اصل میں اگتے ہی ایسے ہیں ......" ڈیڈی نے مسکراتے ہوئے کہا تو عاشی بی کی امی اور نانی بھی مسکرا دیں......

"کیا مطلب ڈیڈی!!" عاشی بی حیرانی سے بولیں۔ "آپ بھی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔" سہیل میاں بھی حیرانی سے ڈیڈی کی دیکھنے لگے "ہاں بھئی میں بچوں جیسی باتیں کر رہا ہوں۔" ڈیڈی نے کہا، پھر نانی اماں کو مخاطب کر کے بولے، "اماں! ذرا عاشی کو بتانا میں بچوں جیسی باتیں کیوں کر رہا ہوں۔" تو نانی اماں مسکراتے ہوئے بولیں: "ہاں بھئی عاشی تمہارے ڈیڈی ٹھیک کہہ رہے ہیں ......اب سے کئی سال پہلے جب تم بالکل مہک جتنی تھیں، تم نے بھی بالکل یہی حرکت کی تھی اور مہک نے بیج گملے میں بو کر پانی بھی اس میں ذرا سا ڈالا ہے، تم نے بیج ڈبے میں بویا تھا اور اسے پانی سے بھر دیا تھا۔ اور عاشی بی! اس میں دوسرے دن ہی پودا بھی نکل آیا تھا۔ کیونکہ تم نے بھی رات کو رو رو کر دعا مانگی تھی۔" نانی اماں نے بتایا تو عاشی بی اور ان کے شوہر دونوں حیرانی سے انہیں تکنے لگے۔

"لیکن نانی اماں! ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ دوسرے دن ہی پودا نکل آئے۔" عاشی بی اب تک حیران تھیں!! "میں بتاتا ہوں کیسے نکل آتا ہے ......" ڈیڈی دوبارہ بول اٹھے۔ "جب تم نے رو رو کر دعا کی تو تمہاری نانی اماں نے رات ہی مجھ غریب کو دوڑایا اور میں رات کو کئی گھنٹے ادھر ادھر نرسریاں ڈھونڈتا رہا، پھر ایک بند نرسری کے سوئے ہوئے مالک کو بڑی مشکل سے اٹھا کر رات ہی پودا لا کر تمہارے ڈبے میں لگا دیا جسے دیکھ کر تم دوسرے دن خوشی سے ناچنے لگی تھیں۔" ڈیڈی نے جلدی جلدی کہا تو عاشی بی سخت شرمندہ ہوئیں اور مہک کو اٹھا کر چومنے لگیں۔ پھر ان کے شوہر نے ہنستے ہنستے ان کا جو ریکارڈ لگایا تو عاشی بی مہک کو گود میں اٹھائے جلدی سے اپنے کمرے میں بھاگ گئیں۔

قابلِ اعتماد۔ غذائیت سے بھرپور
دیسی گندم کا آٹا
کپڑے اور کاغذ کے تھیلوں میں
ممتاز اسٹورز اور یوٹیلٹی اسٹورز
پر دستیاب ہے۔
کراچی میں
کپڑے کے
تھیلوں میں دیسی گندم
کا آٹا پیش کرنے کا سب سے
پہلا شرف ہمارے ادارے
کو حاصل ہے۔
اشرفی برانڈ
آٹا سے پکائی ہوئی روٹی نرم
اور ملائم رہتی ہے کیونکہ ہم
خودکار مشینوں پر اعلیٰ درجے
کی دیسی گندم سے آٹا تیار
کرتے ہیں۔ انہیں میدہ اور
سوجی پوری مقدار میں شامل
ہوتے ہیں جو کہ آٹے میں
غذائیت کا جزو اعظم ہیں
اب انٹرنیشنل کاغذ کی پیکنگ
میں بھی دستیاب ہے
اشرفی
برانڈ آٹا ۲۵ سال سے
اعلیٰ معیار کی ضمانت
کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو
ہم نے تمہیں
عطا کی ہیں۔ (القرآن)
ماہانہ گھریلو خریداری میں سرفہرست
اشرفی برانڈ آٹا
اسپیشل
اشرفی
عبداللہ ماڈرن پلانٹ
ناظم آباد کراچی-۱۸
اچھی صحت، خدا کی نعمت

سوال یہ ہے

ایاز محمود

سائنسی معلومات کا کالم

سوال ...... بحرِ مردار سمندر کیا ہے؟ تفصیل سے بتائیں!!

پرنس افضل شاہین، بہاولنگر۔

جواب ...... پرنس افضل صاحب! یہ بحرِ مُردار سمندر کیا ہوتا ہے؟ سمجھ لیجئے! بحر کا مطلب ہی سمندر ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے کوئی کہہ دے آبِ زم زم کا پانی یا شبِ برات کی رات۔ ہمارے پڑھنے والوں کو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ انہی باتوں سے آدمی سیکھتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔

اب آیئے بحرِ مُردار کی طرف۔ اسے انگریزی میں Dead Sea کہتے ہیں اور وہ اس لئے کہ اس سمندر میں مچھلیاں وغیرہ زندہ نہیں رہ سکتی اور اس لحاظ سے یہ ایک زندگی سے بھرپور سمندر نہیں بلکہ ایک مُردہ سمندر ہے۔ اور سمندر بھی یہ کہاں ہے۔ یہ تو دراصل ایک بڑی جھیل ہے جو ۳۹۴ مربع میل پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا شمالی حصہ اُردن کے پاس ہے جب کہ اس کا جنوبی حصہ مشترکہ طور پر اُردن اور اسرائیل سے لگتا ہے۔

بحرِ مُردار نامی اس جھیل کے مردہ ہونے کا راز کیا ہے؟ قصہ یہ ہے کہ اس میں بے تحاشہ نمک اور دیگر معدنیات ملے ہوئے ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس کے پانی میں ساڑھے گیارہ ارب ٹن سے زیادہ

نمک ملا ہوا ہے تو بھائی اتنے نمکین بلکہ کڑوے پانی میں کون زندہ رہ سکتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک مُردہ جسم ہے اور اسی لحاظ سے اسے بحر مُردار کہتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس جھیل میں ڈوبنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ بھی پانی میں موجود نمکیات کی بدولت ہے۔ لہٰذا اگر آپ کو تیرنا نہیں بھی آتا تو فکر نہ کیجئے۔ بحرِ مُردار کا پانی آپ کو ڈوبنے نہیں دے گا۔ ہم نے ایک رسالے میں بحرِ مُردار کی تصویر دیکھی جس میں ایک صاحب پانی میں کرسی رکھے مزے سے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ نہ کرسی ڈوبتی ہے اور نہ ہی وہ صاحب۔

سوال ...... اینٹی بائیوٹک ادویات کیا ہوتی ہیں؟ مہرین مسعود، کراچی۔

جواب ...... اینٹی بائیوٹک ادویات کی دریافت بلاشبہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس نے طب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ اور اگر کوئی ہم سے پوچھے تو ہم پورے یقین کے ساتھ یہ کہیں گے کہ یہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین دریافت ہے۔

اینٹی بائیوٹکس دراصل ایسے مادے ہیں جو ننھے مُنے جرثوموں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ جراثیم اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ انسانی آنکھ انہیں صرف طاقتور خردبینوں کی مدد ہی سے دیکھ سکتی ہے۔ یہ جراثیم ایک خاص قسم کا کیمیاوی مادہ پیدا کرتے ہیں جو کہ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور یوں ہمارے جسم جنگ و جدل کا میدان بن جاتے ہیں۔

اینٹی بائیوٹک کا باوا آدم پینسلین کو کہا جاتا ہے۔ اس دوا نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران لاکھوں ایسے فوجیوں کی جان بچائی جو عام حالات میں زخموں کے گلنے سڑنے سے شاید جانبر نہ ہونے پاتے۔

اینٹی بائیوٹک ادویات کو ڈاکٹر کی تشخیص اور مشورے پر ہی استعمال کرنا چاہئے۔ ایسا نہ کرنے پر صحت کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔

سوال: ہم جانتے ہیں کہ ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے۔ پھر جب ہم زمین پر کھڑے ہوتے ہیں تو زمین رد عمل کے طور پر اوپر کیوں نہیں اچھالتی۔ محمد عحش انصاری، مخدوم پور۔

جواب: ہمارا زمین پر کھڑا ہونا ایک عمل ہے لیکن اس کا رد عمل ہوا میں اچھلنا نہیں۔ کسی بھی جسم کو حرکت میں لانے کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے اور جب تک مطلوبہ قوت فراہم نہیں کی جائے گی وہ جسم اپنی جگہ پر ساکت ہی رہے گا اس لئے ہم زور لگا کر تھوڑا سا اوپر اچھل سکتے ہیں لیکن کشش ثقل جسے قوتِ تجاذب بھی کہتے ہیں، جلد ہی ہمیں زمین کی طرف کھینچ لے گی۔ اور اوپر جانا ہو تو میکانیکی طریقے استعمال کرنے پڑیں گے اور ہوائی جہاز اور راکٹ وغیرہ کی مدد لینی پڑے گی۔ ان سب باتوں کے لئے قوت درکار ہے۔

تجربہ کے طور پر ربر کی گیند کو زمین پر ماریں۔ آپ جتنی قوت لگائیں گے، رد عمل کے طور پر گیند اتنی ہی اوپر اچھلے گی۔ گیند کو آہستہ سے زمین پر رکھ دیں تو اس کا نہ ہونے کے برابر رد عمل ہو گا اور گیند وہیں ساکت پڑی رہے گی جہاں آپ نے اس کو رکھا تھا۔

سوال: ٹیلی ویژن کی نشریات ہم تک کیسے پہنچتی ہیں؟ شبّر علی چنگیزی، کراچی۔

جواب: آپ یہ بات تو جانتے ہی ہوں گے کہ روشنی، آواز وغیرہ لہروں کی صورت میں سفر کرتی ہیں۔ ٹیلی ویژن کیمرہ، اشیاء اور افراد کے عکس کو اور مائیکروفون ان کی آوازوں کو برقی، مقناطیسی (برقاطیسی) لہروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ان لہروں کو براڈ کاسٹنگ اسٹیشن کا ٹرانسمیٹر اپنے اونچے انٹینا کے ذریعے فضا میں چاروں طرف نشر کر دیتا ہے۔ آپ کے گھر میں موجود ٹیلی ویژن اینٹینا ان کو محسوس کر کے ان کا برقاطیسی سگنل آپ کے ٹیلی ویژن سیٹ تک پہنچا دیتا ہے جو انہیں دوبارہ روشنی اور آواز کی لہروں میں تبدیل کر کے تصویر اور آواز کی صورت میں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

سوال: دھواں کیسے پیدا ہوتا ہے؟ روبی کلثوم، کراچی۔

جواب: جلنا ایک کیمیائی عمل ہے جس میں ایندھن (جلنے والی شے) ہوا میں موجود آکسیجن کے ساتھ مل کر جلتا ہے۔ اس عمل میں مختلف گیسیں پیدا ہوتی ہیں جو گرم ہونے کی وجہ سے فضا میں بلند ہو جاتی ہیں۔ یہ گیسیں ان جلے ٹھوس مادے کے ذرّات کو ہوا میں لے جاتی ہیں اور اسی ملغوبے کو ہم دھواں کہتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دھواں جلنے کے نامکمل عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر یہ عمل مکمل ہو تو صرف مختلف گیسیں خارج ہوں گی جن کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ دوسرے لفظوں میں دھواں ہمیں نظر ہی اس لئے آتا ہے کہ اس میں جلنے والی شے کے ٹھوس ذرات موجود ہوتے ہیں۔ اسی لئے بسوں سے نکلنے والا دھواں سفید کپڑوں کو سیاہی مائل کر دیتا ہے۔

دھواں ماحولیات کے لئے بہت بڑی تباہی کا باعث ہے۔ یہ ہر قسم کی زندگی کے لئے موت کا پیغام ہے۔ اس سے ہر قیمت پر اجتناب کرنا چاہئے۔

ستاون ہزار ڈالر کا کبوتر

بیلجئم میں ایک برطانوی شخص نے دسمبر ۱۹۸۶ء میں ۵۷ ہزار ڈالر (۴۱ ہزار پونڈ) سے نسل کشی کے لئے ایک کبوتر خریدا۔ یہ کبوتر تقریباً ۴۶ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۶۰۰ میل تک اُڑ سکتا تھا۔

مرسلہ...... یاسر بن نثار، راولپنڈی

نئی بائیسکل کی ایجاد آلودگی سے نجات

فیصل مسعود

امریکی کمپنی نے یہ نئی طرح کی بائیسکلیں بنائی ہیں۔ انہیں اصطلاح میں HPV یعنی HUMAN POWERED VEHICLES کہا جاتا ہے یہ پرانی بائیسکلوں کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار اور آرام دہ ہیں۔ پرانی بائیسکلوں میں سائیکل سوار کی ٹانگیں نیچے لٹکتی رہتی تھیں اور اسے پیڈل پر پیر مارنے کیلئے زیادہ طاقت استعمال کرنا پڑتا تھا لیکن ان نئی بائیسکلوں میں پیڈل بالکل سامنے ہوتا ہے اور سوار کو کسی آرام کرسی پر جیسے بیٹھ کر سائیکل چلانے کا لطف آتا ہے، فی الحال یہ بائیسکلیں خاصی مہنگی ہیں اور انہیں امریکہ میں سائیکل دوڑ میں حصہ لینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن توقع ہے کہ ان کی قیمت کم ہو جائے گی اور کمپنیاں ان میں ایسی تبدیلی لائیں گی کہ انہیں سڑکوں پر عام استعمال کے قابل بنایا جاسکے گا۔ یہ بھی خیال ظاہر کیا جارہا ہے کہ اگر یہ بائیسکلیں مقبول ہوگئیں تو کاروں کا استعمال کم ہو جائے گا اور آلودگی کے مسئلے سے کسی حد تک چھٹکارا مل جائے گا۔

جھوٹ کے پاؤں

منیر احمد راشد

روپ نگر اور خوش حالی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ یہاں ہر فرد اپنے اپنے ہنر میں ماہر اور اپنے اپنے کام میں مگن تھا۔ سب مِل جُل کر رہتے اور ایک دوسرے کے لئے زندگی گزارنے کا سامان مہیا کرتے تھے۔ کسان غلہ اگاتا، مزدور محنت کرتا، جولاہا کپڑا بنتا، درزی کپڑے سیتا، چمار چمڑا رنگتا، موچی جوتے گانٹھتا، تیلی کولہو چلاتا، دکاندار روز مرّہ کی اشیاء فراہم کرتا، مولوی صاحب نہ صرف نماز پڑھاتے بلکہ مدرسے میں بچوں کو قرآن بھی سکھاتے۔ چوہدری سب کی سنتا اور عدل سے کام لیتا۔ اوّل تو یہاں کے لوگ کبھی جھگڑا کرتے ہی نہیں تھے اور اگر کبھی کبھار کوئی معمولی تنازعہ ہو بھی جاتا تو چوہدری بڑی خوش اسلوبی سے اسے ختم کرا دیتا تھا۔ بستی والوں کی ہر مشکل کا حل چوہدری کے پاس تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بستی کے تمام لوگ چوہدری پیچ شاہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور

اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

جب ہر طرف ہریالی ہو، بستی میں خوشحالی ہو اور لوگوں میں اتنی محبت ...... تو ایسی جگہ خوشی کو ڈیرے ڈال دینے چاہئیں۔ مگر روپ نگر میں حساب کچھ الٹا تھا۔ زندگی کی ہر نعمت حاصل ہونے کے باوجود بستی کے ہر فرد کے چہرے پر ایک عجیب سی اداسی پھیلی رہتی تھی۔ ایسی اداسی جیسی اس بچے کے چہرے پر ہوتی ہے جس کا پسندیدہ کھلونا ٹوٹ گیا ہو اور اس اداسی کی ایک ہی وجہ تھی۔ بستی کے چہیتے چوہدری کے ہاں کوئی اولاد نہیں تھی۔ چوہدری کو اولاد کا غم تھا۔ اس لئے وہ خوش حال ہونے کے باوجود خوش نہیں تھا۔ جب چوہدری خوش نہیں تھا تو بھلا اسے چاہنے والے لوگ کیسے خوش ہوتے۔ وہ دن رات دعائیں مانگتے کہ اے اللہ! ہمارے چوہدری کو بیٹا عطا کر۔

بالآخر اللہ نے ان کی سن لی اور چوہدری کو ایک بیٹا ہی نہیں، ایک بیٹی بھی عطا کی۔ دو خوبصورت، گول مٹول اور سرخ و سفید جڑواں بہن بھائی۔ ساری بستی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب نے رب کا شکر ادا کیا اور خوب جشن منایا۔ بستی کے مولوی صاحب، دینو بابا نے بچوں کے نام امن اور آشتی رکھے۔ امن اور آشتی ساری بستی کے چہیتے تھے۔

محبتوں اور شفقتوں اور خوشیوں کے سائے تلے پل کر، امن اور آشتی چار برس کے ہوئے تو اللہ نے ایک بار پھر چوہدری سچ شاہ پر کرم کیا۔ اس بار بھی اسے جڑواں بچے عطا ہوئے اور دونوں لڑکے۔ دینو بابا نے ان کے نام چین اور سکون رکھے۔ یوں چین، سکون، امن اور آشتی کی وجہ سے روپ نگر کا روپ اور بھی نکھر آیا۔

وقت اپنی رفتار سے رینگتا رہا۔ لمحے دنوں میں، دن مہینوں میں، مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ زندگی کی گاڑی چلتی رہی اور امن و آشتی، بچپن کی دہلیز پار کر کے نوجوانی کے سنہرے دور میں داخل ہوئے۔ بستی والے آج بھی ان پر جان چھڑکتے تھے اور انہیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

چین بہن بھائیوں میں سب سے خوبصورت تھا۔ اس کے پاس ایک خوبصورت بنسی بھی تھی۔ وہ اس بنسی پر مسرت کے نغمے گاتا۔ وہ جب بنسی بجاتا تو خوشی لہروں کی صورت میں چاروں طرف بکھر جاتی۔ چین چونکہ اچھا بچہ تھا، اس لئے اپنی چیزوں سے دوسروں کو بھی کھیلنے دیتا تھا۔ لہٰذا بستی کا جو آدمی جب چاہتا اس سے بنسی لے لیتا تھا۔ یوں بستی کے سبھی لوگ چین کی بنسی بجاتے تھے۔

چین کا ایک بہت اچھا دوست بھی تھا اور اس کا نام تھا راجو...... راجو بہت سیدھا سادا اور بھولا بھالا بچہ تھا چالاکی اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ وہ تو بس پیار کرنے والا اور دوسروں کے کام آنے والا بچہ تھا اور چین اس کا سب سے اچھا دوست۔

ایک دن راجو بستی سے باہر ایک چٹان پر بیٹھا چین کی بنسی بجا رہا تھا کہ اس نے ،، آدمیوں کو

دیکھا، جو نجانے کب اس کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ تعارف کے بعد پتا چلا کہ ان میں سے ایک کا نام جھوٹ اور دوسرے کا نام دھوکہ ہے۔ انہوں نے راجو سے کھانے کو مانگا۔ مہمان نواز راجو دوڑ کر گھر سے ان کے لئے ساگ اور گھی لگی روٹی لے آیا۔ یوں جھوٹ اور راجو کی دوستی کی ابتدا ہوئی۔ راجو اسے جھوٹ چاچا کہنے لگا۔ جھوٹ وہیں بستی سے باہر جھونپڑی بنا کر رہنے لگا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے اپنی لچھے دار باتوں سے راجو کو ایسا الجھایا کہ راجو اس کا بے دام کا غلام بن کر رہ گیا۔ اب جھوٹ چاچا جو بھی کہتا، راجو بے چون و چرا وہ مان لیتا تھا۔ ایک دن اس نے راجو کو بتایا کہ کسان لوگ بہت عظیم ہوتے ہیں۔ انہیں دوسرے کم ذات لوگوں کو منہ نہیں لگانا چاہئے۔ مثال کے طور پر موچی، جولاہا، تیلی وغیرہ۔

دھوکہ نے بھی جھوٹ کی ہاں میں ہاں ملائی اور مذاق اڑانے کے انداز میں بولا۔

"لو بھئی راجو تم تو ہوئے کسان ...... اور موچی بے چارا کیا ہوتا ہے ...... دن رات جوتوں میں رہ رہ کر خود بھی جوتا بن جاتا ہے۔" پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "صحبت کا اثر تو ہوتا ہی ہے ناں!"

"اور تیلی کیا ہوتا ہے؟ ...... کولہو کا بیل۔" جھوٹ نے کہا۔

"تو جولاہا، سوت کی انٹی "ہوا ...... اور کمہار ایک گدھا۔" راجو نے مزے لیتے ہوئے کہا اور تینوں زور زور سے ہنسنے لگے۔

جھوٹ اور دھوکہ کی محفل سے رخصت ہو کر راجو اپنے گھر کی طرف چلا تو یہ باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ شفیع جولاہے، تاجے نائی، پھجے تیلی اور کاکا موچی کو چھیڑے گا۔ تو کتنا مزا آئے گا یہ سب اس کے ہم عمر تھے۔ اور ساتھ ہی مدرسے میں پڑھتے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں ان کی چڑ بھی بنالی تھی۔ شفیع چرخا، تاجو استرا، پھجا کولہو، کاکا پمپی۔

ایک خیال یہ بھی اس کے دل میں پیدا ہوا کہ چونکہ وہ کسان ہے اس لئے اس کی دوستی بڑے اور خوبصورت لوگوں سے ہے۔ جیسے چین، جیسے جھوٹ اور دھوکہ۔

راجو اتنا سادا تھا کہ آج تک جھوٹ اور دھوکہ کے چہروں پر چڑھی نقابوں کو نہیں پہچان سکا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ جھوٹ بظاہر خوبصورت نظر آتا ہے۔ دراصل تو اس کا چہرہ بہت مکروہ ہے۔ خیر وہ جلدی جلدی چلتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔

اگلے دن مدرسے میں، شفیع، تاجے، پھجے اور کاکا کی چڑیں مشہور ہو چکی تھیں۔ شروع شروع میں تو ان لوگوں نے اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دی لیکن جب سب لوگ ان کا اصل نام بھول کر انہیں انہیں ناموں سے پکارنے لگے تو وہ سب چڑ گئے اور ایک دن سب نے مل کر راجو کی ایسی پٹائی کی کہ بالکل اُدھ مُوا کر کے ہی چھوڑا۔

روپ نگر میں ایسے واقعات کم ہی ہوتے تھے۔ اب جو یہ لڑائی ہوئی تو ہر طرف پریشانی کی لہر دوڑ

گئی۔ خاص طور پر چوہدری سچ شاہ تو بہت ہی فکر مند تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر بچوں کی یہ لڑائی بڑوں تک جا پہنچی تو روپ نگر کا روپ بگڑ جائے گا۔ اس نے سخت قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اگلے دن بستی کے بڑے میدان میں پنچائیت کرنے کا اعلان کر دیا۔

میدان میں سبھی لوگ جمع تھے۔ کچھ چار پائیوں پر بیٹھے تھے، کچھ زمین پر اور کچھ کھڑے تھے۔ ایک طرف راجو بھی پٹیوں میں لپٹا پلنگ پر پڑا تھا۔ دوسری طرف وہ چاروں مجرم کھڑے تھے جنہوں نے راجو کو اس حالت تک پہنچایا تھا۔

چوہدری نے گفتگو کا آغاز کیا اور چاروں بچوں سے پوچھا۔

"ہاں بھئی! تم نے کیوں مارا تھا راجو کو؟"

بچے ڈر گئے ...... انہوں نے خوف زدہ نظروں سے پہلے چوہدری کو دیکھا پھر ایک دوسرے کو۔

"ڈرو نہیں ...... ساری بات صاف صاف بتاؤ شاباش۔" چوہدری بولا۔

چاروں نے پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا ...... پھر اپنے والدین کی طرف ...... آخر کاکا نے ہمت کر کے کہا۔

"چوہدری جی یہ ہمیں چھیڑتا ہے۔"

"کیوں ...... کیا چھیڑتا ہے؟"

"یہ مجھے کاکا پپی کہتا ہے۔" کاکا نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "اسے شفیع چرخا ...... اسے تاجو استرا ...... اور اسے پھجا کولہو۔"

اس نے باری باری سب کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ یہ مزاحیہ سے نام سن کر وہاں موجود کئی بچوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ بعض بڑے بھی مسکرائے لیکن جلد ہی سنجیدہ ہو گئے۔ راجو حالانکہ زخمی تھا ...... لیکن یہ سن کر اس کا قہقہہ نکل گیا۔ ہلنے سے اس کے سر میں درد ہوا تو کراہنے لگا۔

"چوہدری نے اسے گھور کر دیکھا پھر پوچھا۔

"ہاں تو راجو ...... تم کیوں چھیڑتے ہو انہیں؟"

"چوہدری جی میں اکیلا تھوڑی چھیڑتا ہوں ...... سبھی چھیڑتے ہیں۔"

"چڑ تو تم نے ہی بنائی تھی ناں۔" پھجا کولہو چڑ کر بولا۔

"میں نے چڑ تھوڑی بنائی تھی ...... یہ تو سچی بات ہے۔" راجو نے اسے دیکھتے ہوئے سادگی سے کہا۔

"سب جانتے ہیں کہ صحبت کا اثر تو ہوتا ہی ہے ...... اس لئے موچی جوتوں میں رہ رہ کر جوتا ہو جاتا ہے ...... اور تیلی کولہو چلا چلا کر بیل۔" اس نے جھوٹ چاچا کی بات دہرا دی اور خیال کیا کہ سب لوگ اس کی عقل مندی کی داد دیں گے۔ مگر وہاں تو سب اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کی ہو۔

"تم بھی تو ہر روز گدھے پر چارہ لاد کر لاتے ہو ...... تمہیں کیا کہا جائے۔" دینو بابا نے پوچھا تو راجو پریشان سا ہو گیا۔

"خیر ...... تمہیں یہ باتیں کس نے سکھائی ہیں؟" چوہدری سچ شاہ نے راجو سے پوچھا۔

"جھوٹ چاچا نے۔" راجو نے بے ساختہ کہا اور پھر جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا جیسے وہ بتانا نہ چاہتا ہو بلکہ غلطی سے یہ بات منہ سے نکل گئی ہو۔

"یہ جھوٹ چاچا کون ذات شریف ہے؟" چوہدری نے حیرت سے دینو بابا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو ایک بہت گندا آدمی ہے ...... لیکن یہ راجو کو کہاں ملا؟" دینو بابا خود حیران تھے۔

انہوں نے سوالیہ نظروں سے راجو کو دیکھا۔ بستی کے سارے لوگ بھی راجو کو دیکھ رہے تھے راجو ان نظروں کا مقابلہ نہیں کر پا رہا تھا کیونکہ وہ تو ایک بھولا بھالا بچہ تھا۔اس نے گھبرا کر جھوٹ اور دھوکہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ حالانکہ جھوٹ چاچا نے اسے منع کیا تھا کہ وہ کسی کو بھی ان کے بارے میں نہ بتائے۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" دینو بابا سمجھ جانے والے انداز میں بولے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے، ایک عجیب و غریب بات ہوئی۔ چودہ برس کا امن، جو بہن بھائیوں میں سب سے بڑا اور سب سے عقل مند تھا، اچانک کھڑا ہوا اور آشتی کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"چلو بہن، اب ہمارا یہاں گزارا نہیں۔"

"کیا مطلب ...... کہاں چلے؟" سب لوگوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ امن نے دینو بابا کی طرف دیکھا پھر سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔

"ہم لوگ اس بستی سے جا رہے ہیں ...... کیونکہ جہاں جھوٹ آ جائے وہاں امن و آشتی نہیں رہ سکتے۔"

"ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔" چین نے کہا۔ "جہاں امن و آشتی نہ ہوں وہاں چین اور سکون کا کیا کام؟"

وہ چاروں لوگوں کے روکنے کے باوجود وہاں سے چلے گئے۔ ایک دینو بابا کے علاوہ ہر شخص پریشان تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ وہ سب لوگ ان چاروں بچوں کو اپنے بچوں بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ چاہتے تھے۔ وہ بچے اس بستی کی رونق تھے اور بہت منتوں اور مرادوں کے بعد انہیں ملے تھے اور اب ایک راجو کی حماقت کی وجہ سے بستی سے رخصت ہو گئے تھے۔ سب لوگ راجو پر بگڑنے لگے۔ راجو بے چارے کو کیا پتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا وہ تو لگا رونے۔

پنچائیت ختم ہو گئی۔لوگ افسردہ سے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لیکن چوہدری، دینو بابا، راجو اور راجو کا باپ وہیں رہے۔ راجو رو رو کر ان سے معافی مانگ رہا تھا اور آئندہ کے لئے بھی توبہ کر رہا تھا۔اس کی تو یہ سوچ سوچ کر ہی جان نکلی جا رہی تھی کہ اس کی وجہ سے اس کا سب سے اچھا دوست چین بستی سے رخصت ہو گیا ہے۔

راجو کی حالت دیکھ کر دینو بابا [illegible] آ گیا۔

انہوں نے راجو کو بتایا کہ اس کا دوست واپس بستی میں آ سکتا ہے۔ لیکن اس کی ایک شرط ہے۔

"میں ہر شرط ماننے کے لئے تیار ہوں۔" راجو نے جلدی سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے...... شرط یہ ہے کہ تم اپنے جھوٹ چاچا کے ساتھ ان چاروں کو لینے کے لئے خود جاؤ گے۔"

"میں ضرور جاؤں گا لیکن وہ ہیں کہاں۔" راجو بولا۔

دینو بابا کو پتہ تھا کہ وہ لوگ کہاں گئے ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے راجو کو ان کا پتہ دے دیا۔ اور راجو اسی وقت ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

راجو کے جانے کے بعد چوہدری نے دینو بابا سے پوچھا کہ آخر سارا چکر کیا ہے؟ تب دینو بابا نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے کہا۔

"یہ جھوٹ بُری بلا ہے۔ فساد کی جڑ ہے میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اس سے پیچھا چھڑانا بہت مشکل ہوتا ہے اس نے معصوم راجو کو بھی ورغلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب اس کا علاج ہو جائے گا...... وہ اس طرح کہ میں نے جو پتہ راجو کو دیا ہے وہاں تک جانا بہت محنت کا کام ہے اور میں جانتا ہوں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے وہ زیادہ دور اور زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ لہٰذا وہ راجو کے ساتھ نہیں چل سکے گا۔ بلکہ کہیں راستے میں ہی رہ جائے گا۔ اس طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جھوٹ سے راجو کا پیچھا چھوٹ جائے گا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن بچے وہاں تک گئے کیسے؟ چوہدری کو اپنے بچوں کی فکر تھی۔

"بچے کہیں بھی نہیں گئے۔" دینو بابا نے کہا۔ "وہ بستی سے باہر میرے پہاڑ والے گھر میں ہیں۔ کیونکہ امن نے جاتے جاتے مجھے اشارہ کیا تھا۔" دینو بابا نے بتایا تو چوہدری بھی اپنے بیٹے کی ذہانت پر خوش ہو گیا۔

دوسری طرف راجو جھوٹ اور دھوکہ کے پاس پہنچا رو رو کر ساری بات بتائی۔ اور پھر ساتھ چلنے کے لئے کہا دھوکہ تو یہ بات سنتے ہی مُکر گیا کہ بھائی میری طبیعت خراب ہے میں تو نہیں جا سکوں گا۔ لیکن جھوٹ نے راجو کے ساتھ چلنے کا وعدہ کر لیا۔ اس نے سوچا کہ آئندہ بھی تو راجو سے کام پڑ سکتا ہے۔ لیکن وہ دینو بابا کی چال سے واقف نہیں تھا۔ پھر ہوا بھی یہی کہ وہ بغیر پاؤں کے زیادہ دور تک نہ چل سکا۔ راجو نے جب اسے رکتے دیکھا تو نفرت سے منہ پھیر کر خود آگے بڑھ گیا کیونکہ اسے تو جانا ہی تھا اور امن و آشتی اور چین و سکون کو واپس لانا تھا۔

یاک

یاک ایک ایسا پالتو جانور ہے جس کا سر گائے جیسا، دم گھوڑے کی مانند، بال بھیڑ کی طرح، جسم سور کی طرح اور سینگ بھینسے جیسے ہوتے ہیں یہ تبت کے علاقے میں پایا جاتا ہے۔

مرسلہ...... یاسر بن نثار، راولپنڈی

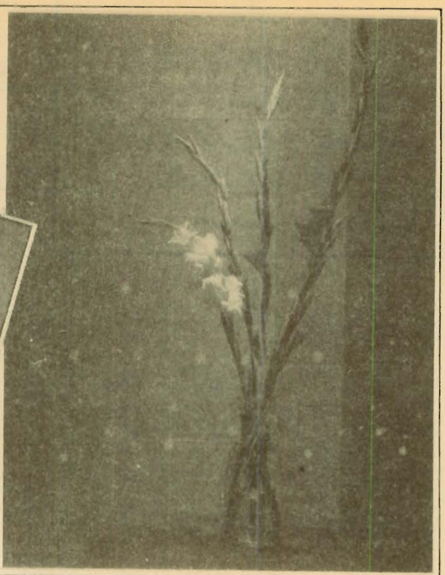

- دیدہ زیب شادی کارڈز
- بزنس وزیٹنگ کارڈز
- کیلنڈرز
- عید کارڈز
- پروفیشنل پرنٹنگ

ہر قسم کی اعلیٰ اور معیاری پرنٹنگ کے لیے

شاداب پرنٹرز

دھرم داس بلڈنگ (نزد ایس ایم لاء کالج) ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ کراچی فون نمبر: ۲۱۳۸۴۱

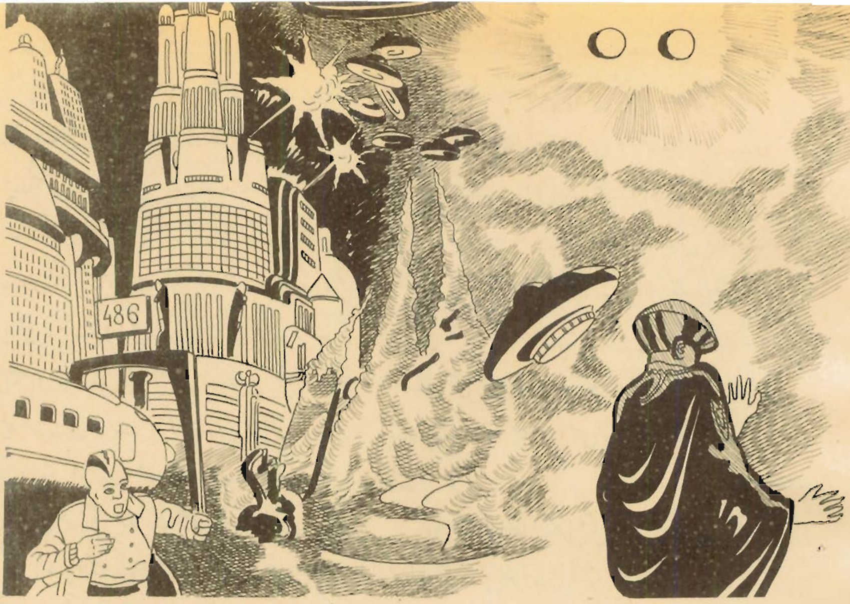

مستقبل کا سفر

احمد ظہیر قریشی

تمام سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ رات کے قریباً ڈھائی بج چکے تھے۔ لوگ بڑے لحافوں میں دُبکے اپنی نیندیں پوری کر رہے تھے۔ اس وقت شہر کی مرکزی سڑک پر ایک آدمی اپنی گاڑی کے آلات ٹھیک کر رہا تھا۔ یہ گاڑی کوئی عام گاڑی نہ تھی بلکہ یہ مستقبل کا سفر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی رفتار عام گاڑیوں کی رفتار سے کہیں زیادہ تھی اور شاید بجلی کی رفتار سے بھی زیادہ...... اس کی مشینری کا ایک ایک آلہ خاص قسم کی دھات سے تیار کیا گیا تھا......

یہ ایک ٹائم مشین تھی۔ اس کا موجد حیران کن ذہن اور صلاحیتوں کا مالک تھا۔

تین بجنے میں کچھ ہی منٹ تھے۔ ٹائم مشین کا موجد اس میں بیٹھ چکا تھا اور اس کا انجن اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اس کی منزل سال دو ہزار پچانوے (۲۰۹۵) تھی۔ اس نے اپنا سفر شروع کر دیا۔

ٹائم مشین سڑک پر رینگنے لگی۔ اس کی رفتار لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس میں سے شعلے نکلنے لگے۔ عجیب قسم کا شور ہونے لگا اور پھر ایک زور دار دھماکہ ہوا۔ آس پاس کے تمام لوگ جو سو رہے تھے، دھماکے کی آواز سن کر اٹھ بیٹھے اور دھماکے کی آواز کی طرف لپکے لیکن اب وہاں شعلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس روز اخبار کی شہ سرخی یہ تھی:

"پاک لینڈ کے مشہور سائنس دان پروفیسر غفور حیرت انگیز طور پر لاپتہ ہو گئے۔"

پروفیسر غفور کی ٹائم مشین کے سامنے ایک لمحے کے لئے اندھیرا چھا گیا اور پھر وہ ایک جھٹکے سے رکی۔ وہ ٹائم مشین سے باہر نکل آئے۔ان کی ٹائم مشین ایک تنگ سی گلی میں رکی تھی اور سڑک کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ انہوں نے اوپر نظر اٹھائی تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان کے اوپر ہی اوپر بے شمار اڑن کھوٹے اڑ رہے تھے۔ آس پاس انوکھی طرز کی عمارات تھیں جو آسمانوں کو چھو رہی تھیں۔ پروفیسر کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ انہوں نے ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا۔ وہ گلی سے باہر نکل آئے۔ یہاں پر لوگ آجا رہے تھے اور پروفیسر کو ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ کیونکہ ان کے کپڑوں اور پروفیسر کے کپڑوں میں کافی فرق تھا۔ ان لوگوں نے ایک ہی طرح کے لباس زیب تن کئے ہوئے تھے جن سے وہ سر سے لے کر پیر تک چھپے ہوئے تھے لیکن پروفیسر نے معمولی لباس یعنی پینٹ شرٹ پہن رکھا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ ایک عمارت میں داخل ہوئے یہ ایک کپڑوں کی دکان تھی جہاں بہت سے نئے طرز کے ملبوسات سجائے گئے تھے۔ انہوں نے استقبالیہ پر بیٹھے آدمی کو سلام کیا تو اس نے پہلے تو ان کو سر سے پیر تک دیکھا اور پھر بہت مہذب طریقے سے سلام کا جواب دیا پھر انہوں نے اس سے غفور لیبارٹری کا راستہ پوچھا۔ اس شخص نے ان کو غفور لیبارٹری کا راستہ بتا دیا۔ اس کا شکریہ ادا کر کے وہ باہر نکل آئے اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے لگے۔ شہر کا پورا کا پورا نقشہ بدل چکا تھا۔ راستوں میں صفائی اتنی تھی کہ ذرا سی گندگی بھی نظر نہ آتی تھی۔ اب غفور لیبارٹری کی عمارت ان کے سامنے تھی لیکن اب وہ کافی بدل چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ عمارت میں داخل ہوتے ایک شور بلند ہوا۔

کوئی کہہ رہا تھا کہ مریخ کی مخلوق نے دنیا پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ فضا میں موجود بہت سے اڑن کھٹولے بھی زمین پر اترے آئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ نکل کر ان عمارتوں میں چھپ گئے۔ پھر آسمان پر بہت سی اڑن طشتریاں نمودار ہوئیں جو پہلے سے موجود اڑن کھٹولوں کی نسبت بہت بڑی تھیں۔ ان میں سے پے در پے ایسی شعاعیں نکلتیں جو جہاں گرتیں وہاں آگ لگا دیتیں۔ اب پروفیسر کو اپنی فکر ہوئی وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے اور اپنے زمانے میں واپس آنا چاہتے تھے۔ وہ جلدی سے اپنی ٹائم مشین کی طرف دوڑے اور اس کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اچانک ان کے منہ سے نکلا "اوہ!!" ان سے زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو گئی تھی کیونکہ یہ گاڑی صرف مستقبل کا سفر کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

گھر بیٹھے دولت کمائیے

زوار حسین بجلانی

میرا نام یونس رقیب ہے۔ میں ایک بے روزگار شخص ہوں لیکن اس میں میرا کیا قصور ہے؟

ہر طرف نوکری پر پابندی لگی ہوئی ہے۔ حالانکہ میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایف ہوں۔ آپ حیران نہ ہوں۔ یعنی میں میٹرک بار بار فیل ہوں۔ رشوت کی رقم میرے پاس نہیں ہے۔۔۔کہ اس کے ذریعے نوکری حاصل کی جاسکے۔میرے لئے کوئی سفارشی خط لکھنے کو بھی تیار نہیں ہے۔ اباجی بھی مجھ سے بہت تنگ ہیں۔ اور اماں جی تو کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ اباجی تو روز کہتے ہیں کہ کوئی کام دھندہ کرو ورنہ میرے گھر سے نکل جاؤ۔ لیکن میں اکثر یہی کہتا ہوں اباجی تھوڑا انتظار کرلیں۔ پھر دیکھئے گا آپ کے گھر پر روپوں کی بارش ہوگی۔ تو ابا جان جھٹ جواب دیتے "اور اس روز اولے بھی ضرور پڑیں گے" ان کو میں کیسے سمجھاتا کہ خالص روپوں کی بارش ہوگی۔ میں ہر وقت منصوبے بناتا اور بگاڑتا رہتا۔ میں ہر وقت سوچوں میں گم رہتا۔ جس کی وجہ سے مجھے میرے دوست فلسفی کہتے تھے۔ ان کی یہ بات مجھے زہر لگتی۔ ان کو میں کیسے سمجھاتا کہ اس ذہن میں امیر بننے کے ہزاروں منصوبے بنتے ہیں۔ پھر میں یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ وہ دن ضرور آئے گا جب میرے پاس دولت ہی دولت ہوگی تب ہی ان لوگوں سے پوچھوں گا۔

ایک صبح میں ناشتہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک

میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور میں ناشتہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اماں جی سے کچھ رقم طلب کی۔ اماں ایسی غصہ ہوئیں جیسے کوئی بخیل بھیک مانگنے والے پر غصہ ہوتا ہے۔ "چل ہٹ نہ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ کون سی کمائی لا کر دی ہے جو تو یوں پیسے مانگ رہا ہے!!" اماں جی نے ڈانٹ پلائی۔ میرے پاس ایک ریڈیو تھا جو تنہائی میں میرا ساتھ دیتا تھا۔ ایک چھوٹی سی گھڑی تھی جس کے ساتھ سونے کی زنجیر لگی ہوئی تھی۔ اور کچھ تھوڑا بہت سامان۔ میں نے اماں کی جھڑکیاں کھا کر ان سب چیزوں کو بازار میں جا کر فروخت کر دیا۔ اور پھر اس رقم سے قریبی ڈاکخانے میں پوسٹ بکس نمبر لیا۔ پھر میں نے بیٹھ کر ایک اشتہار بنایا جو میرے منصوبے کا سب سے اہم حصہ تھا۔ اور پھر بعد میں ملک کے ایک مشہور اخبار کے دفتر گیا۔ وہاں میں نے اشتہار شائع ہونے کے لئے دیا۔ اور اس کی رقم ادا کر دی اشتہار کی رقم ادا کرنے کے بعد میری جیب خالی ہو چکی تھی۔

اگلے دن چیختا چنگھاڑتا ہوا اشتہار شائع ہوا "گھر بیٹھے لاکھوں روپے کمائیے۔ مشورہ مفت۔ لیکن ہر لفافے کے ساتھ ایک روپیہ آنا ضروری ہے۔ اس نادر موقع سے فائدہ اٹھائیے۔ لاکھوں روپے آپ کی جیب میں ہوں گے۔" اشتہار پر پوسٹ بکس نمبر تھا۔ کچھ روز بعد جب میں پوسٹ بکس کھولنے گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ پوسٹ بکس خالی تھا۔ اور اس میں صرف ایک رقعہ پڑا تھا۔ جو پوسٹ آفس کی طرف سے تھا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ آپ کی ڈاک بہت زیادہ ہے۔ جو پوسٹ بکس میں نہیں سما سکتی۔ لہٰذا پوسٹ ماسٹر سے اپنی ڈاک لے جائیے۔ میں بہت خوش ہوا اور پوسٹ ماسٹر کے کمرے میں گیا۔ وہاں ایک بوری پڑی ہوئی تھی۔ پوسٹ ماسٹر نے ڈاک میرے حوالے کر دی۔ اور میں جلد سے گھر لوٹ آیا۔ بوری کھولی یہاں میرے جیسے ہزاروں بے روزگار۔ لاکھوں خواہشمند مشورہ طلب کرنے کے لئے حاضر تھے۔ سب لفافوں میں ایک ایک روپیہ موجود تھا۔ میں نے ایک ایک کر کے ساری رقم نکالی پہلے دن اتنا منافع ہو گا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد تو خطوط کی بارش ہو گئی۔ اور ساتھ ہی روپوں کی بارش بھی۔ اس کے بعد یہ روزانہ کا معمول ہو گیا۔ ایک مہینے بعد جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ خطوط آنے تقریباً بند ہو گئے ہیں۔ تو دل چاہا کہ اب مشورہ مانگنے والوں کو مشورہ دے دینا چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی میری طرح گھر بیٹھے لاکھوں روپے کمانے کے لئے منتظر بیٹھے تھے۔ لہٰذا میں نے مشورہ دینے کیلئے اسی ملک گیر شہرت رکھنے والے اخبار سے رجوع کیا۔ دوسرے دن اپنا اشتہار شائع ہونے سے پہلے ہی میں رفوچکر ہو گیا۔ اشتہار جلی حروف میں شائع ہوا "جس طرح میں نے اپنی ذہانت سے لاکھوں روپے کمائے۔ آپ بھی یہی کلیہ استعمال کیجئے۔ شائد آپ کے حصے میں بھی لاکھوں روپے آئیں۔"

سورج کا ٹکڑا

نعیم مشتاق نومی

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ ایک گھونگا (سنی) اور ایک سیہہ (ہاگ) باغ میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔ ہر روز وہاں اکٹھے ہوتے تھے اور پورا دن وہیں ہنستے کھیلتے گزار دیتے۔

آج موسم بہار کا پہلا دن تھا۔ باغ کے تمام درخت، پودے اور پھول، نکھرے نکھرے، جاگے جاگے اور مسکراتے دکھائی دے رہے تھے۔

سورج کی کرنیں ہر شے پر پڑ رہی تھیں۔

"میری خواہش ہے، سورج اسی طرح چمکتا رہے، اور ہم پہ اپنی روشنی ڈالتا رہے۔" سنی نے کہا۔

"میری بھی خواہش ہے، خدا کرے یہ سورج اسی طرح ہم پہ چمکتا رہے۔" ہاگ نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اور کیا چاہئے! صرف اور صرف سورج کا ٹکڑا ...... جو صرف اور صرف ہمارے لئے ہو۔"

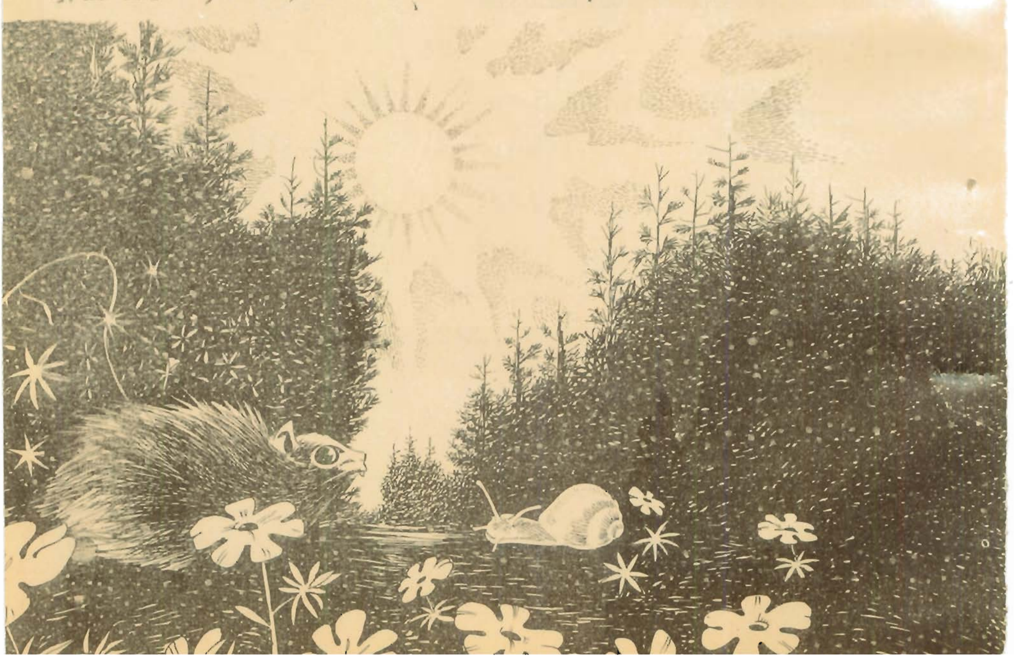

"ہاں یار!" ہاگ نے اثبات میں سر ہلایا۔
"سورج کا ٹکڑا۔"
لیکن وہ تو لگتا ہی ایک ٹکڑا ہے، وہ تو ہے ہی ایک ٹکڑا، ٹکڑے کا ٹکڑا کیا ہوا؟" سنی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ "ذرا غور سے اس کی طرف دیکھو تو سہی!" اس نے چمکتے سورج کی طرف اشارہ کیا۔
ہاگ نے ایک لمحے کے لئے سورج کی طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے آنکھیں بند کر کے جھکالیں۔ وہ اسے بہت قریب محسوس ہوا تھا۔
چند لمحے بعد آنکھیں کھول کر تائیدی لہجے میں بولا۔ "ہاں یار! ہے تو یہ واقعی ایک ٹکڑا۔"
"ایک آئیڈیا ہے میرے ذہن میں!" سنی اچانک اچھلا۔
"کیسا آئیڈیا؟" ہاگ نے پوچھا۔
"ہم اگر سورج کا یہ ٹکڑا اتار کر اپنے پاس رکھ لیں تو کیسا رہے گا؟" وہ تائید طلب نگاہوں سے ہاگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔
"ارے واہ میرے یار!" ہاگ نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "یہ تو بہت خوبصورت آئیڈیا ہے۔"
"ہاں!" سنی نے کہا۔ "ہمیں جب بھی روشنی کی ضرورت ہوگی، حرارت کی ضرورت ہوگی، اسے نکال لیا کریں گے۔"
"بالکل ٹھیک ہے!" ہاگ خوش ہو گیا۔
"مگر ایک بات ہے!" سنی پریشان سا ہو کر بولا۔
"وہ کیا؟" ہاگ نے پوچھا۔
"ہم سورج کو پکڑیں گے کیسے؟"
"ہاں یار!" ہاگ نے پُرخیال انداز میں سر کو ہلایا۔ "یہ تو واقعی مسئلہ ہے۔" پھر مسکرا کر بولا۔ "فکر کیوں کرتے ہو؟ ...... دونوں مل کر سوچیں گے تو کوئی نہ کوئی ترکیب ذہن میں آہی جائے گی......"
"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" سنی نے تائید میں سر ہلایا۔
تب دونوں مل کر سوچنے لگے۔
کچھ ہی دیر بعد ہاگ خوشی اور جوش سے اچھل پڑا۔
"ایک ترکیب آئی ہے ذہن میں!" ہاگ چلّاتے ہوئے بولا۔
"اچھا!!!" سنی بھی خوش ہو گیا۔
"ہاں!" ہاگ نے اثبات میں سر ہلایا۔
"جلدی سے بولو پھر......" سنی بے تابی سے بولا۔
"یہ سورج میرا خیال ہے کہ زیادہ بلندی پر نہیں۔" ہاگ بولا۔
"لگتا تو یہی ہے۔" سنی نے تائید کی۔
"پھر یوں کرتے ہیں، میں نیچے بیٹھتا ہوں، تم میرے اوپر چڑھ کر اسے پکڑ کر نیچے اتار لو۔" ہاگ نے کہا۔
سنی خوش ہو کر تالی بجاتے ہوئے بولا۔
"بہت اچھا آئیڈیا ہے۔"
یوں ہاگ نیچے بیٹھا۔ اور سنی اس کی پشت پر

چڑھ گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح سورج کو پکڑ لے، مگر ہر بار ناکام رہا۔

"یہ کام تو بہت مشکل لگتا ہے؟" سنی مایوس ہو کر بولا۔

"یار مایوس کیوں ہوتا ہے!"

ہاگ نے تسلی دی۔ "کوئی اور ترکیب سوچتے ہیں۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے۔" سنی کی آنکھوں میں امید کی کرن پھر سے جاگ اٹھی۔

وہ ایک بار پھر سے کوئی ترکیب سوچنے کے لئے سوچ کے سمندر میں غوطے لگانے لگے۔

ہاگ نے کہا۔ "اگر ہم سورج پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو اسے چھپا کر رکھیں گے۔ اس کی روشنی اور حرارت کسی کو بھی نہیں دیں گے۔"

"مگر یار! یہ تو سراسر خود غرضی ہے۔" سنی نے کہا۔

"خود غرضی تو ہے، مانتا ہوں۔" ہاگ نے سمجھایا۔ "مگر یہ بھی تو دیکھو، ہم کتنی محنت کر رہے ہیں۔"

"بات تو تمہاری درست ہے یار!" وہ قائل ہو کر بولا۔ "محنت کا پھل تو ملنا چاہئے۔"

وہ دھوپ میں لیٹے سوچتے رہے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ سنی جوش سے اچھلا۔ اس نے چلا کر کہا۔ "وہ مارا!!!"

"مجھے بھی تو بتاؤ کیا سوجھا ہے؟" ہاگ اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"میرا خیال ہے، یہ درخت اس باغ کا سب سے بڑا درخت ہے۔" اس نے ایک قریبی درخت کی طرف اشارہ کیا۔

اس درخت کے اوپر سورج نظر آرہا تھا۔ چمکتا، دمکتا، مسکراتا ہوا۔ لگتا تھا وہ درخت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ قریب، بہت ہی قریب۔

"ہاں تمہارا خیال درست ہے۔" ہاگ نے تائید میں سر ہلایا۔

"ذرا غور سے دیکھو!" سنی جوشیلے انداز میں بولا۔ "سورج اس درخت کے کتنا قریب ہے۔"

"ارے واہ!" ہاگ خوش ہو گیا۔ "یہ تو سارا مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ اب تو ہم بڑے آرام سے اس درخت پر چڑھ کر، سورج کو نیچے اتار لیں گے۔" اس نے سنی کے ہاتھ ملا کر تھپکی دی۔ پھر اچانک فکر مند سا ہو کر بولا۔ "لیکن مجھے تو درخت پر چڑھنا آتا ہی نہیں۔"

"فکر مند کیوں ہوتے ہو؟" سنی مسکرا کر بولا۔ "تمہیں درخت پر چڑھنا نہیں آتا تو کیا ہوا؟ مجھے تو آتا ہے ناں!"

"اس کا مطلب ہے ہم سورج کو پکڑنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔" وہ پھر سے خوش ہو گیا۔

تب سنی درخت تک پہنچا۔ اور اوپر چڑھنے لگا۔ کافی دیر بعد بالآخر وہ اس درخت کی سب سے اونچی شاخ پر پہنچ گیا۔

اس وقت تک وہ سخت تھک چکا تھا۔ اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

"شاباش، شاباش!" ہاگ اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بس تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا ہے۔ ہمت کرو!"

"تھوڑا سا آرام کر لوں، پھر پکڑتا ہوں۔" سنی نے سانس اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد سنی نے اور اوپر کی جانب رینگنا شروع کر دیا۔ آخر کار وہ اس درخت کی چوٹی تک پہنچ گیا۔

وہ اب بہت زیادہ پُر جوش تھا۔ اسے منزل بہت قریب محسوس ہو رہی ہے۔

ہاگ خوشی سے اچھلتے ہوئے بولا۔ "شاباش میرے یار! اب ہاتھ بڑھا کر پکڑ لو اسے۔"

سنی نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ مگر سورج ہاتھ نہ آیا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی، مگر پھر ناکام رہا۔

"یار! یہ تو اب بھی دور ہے۔" سنی مایوس سا ہو گیا۔

"پھر کوشش کرو میرے یار!" ہاگ نے ہمت بندھائی۔ "پھر کوشش کرو۔"

سنی خود بھی منزل کے اتنا قریب آکر ناکام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لہٰذا دوست کے کہنے پر اس نے ایک بار پھر کوشش شروع کی۔ اس نے ہاتھ اونچا کیا۔ اور شاخ پر آہستہ آہستہ تن کر کھڑا ہو گیا۔

جہاں ہاگ کھڑا تھا، وہاں سے اسے سورج کے ساتھ سنی کے ہاتھ مس ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ لہٰذا وہ بہت پُر جوش تھا۔ اور جوشیلے انداز میں اچھل اچھل کر کہہ رہا تھا۔ "تھوڑا سا اوپر...... اور...... تھوڑا سا اور...... شاباش!"

سنی نے ہاتھ اور بلند کیا...... اور بلند کیا...... اور بلند کیا...... اس کے بعد اگلی کوشش میں اس کا توازن بگڑا۔ اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش، مگر توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اور دھڑام سے زمین پہ آگرا۔ ...... اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "ہائے!"

وہ چونکہ گھاس والی زمین پہ گرا تھا، اس لئے اسے زیادہ گہری چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ مگر اتنی ضرور آئیں کہ وہ کافی دیر تک اپنی جگہ سے ہِل تک نہ سکا۔

وہ جیسے ہی زمین پر گرا۔ ہاگ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

"کیا ہوا؟" وہ تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ "زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟"

"میرا خیال ہے کچھ بچت ہی ہو گئی ہے......" سنی نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

ہاگ نے اسے وہاں سے اٹھایا اور دھوپ میں لا کر لٹا دیا۔

"کیا تمہارے ہاتھ سورج کو نہیں لگے تھے؟" ہاگ نے پوچھا۔

نہیں......!" سنی نے نفی میں سر ہلایا۔

"ذرا سے بھی نہیں؟" ہاگ نے کہا۔

"نہیں!" اس نے دوبارہ نفی میں سر ہلایا۔

"اچھا......!!!" ہاگ کے چہرے پر حیرت تھی۔

اسی وقت ان کی دوست بلبل (نائٹی) کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ ہاگ اور سنی کو دیکھ کر رک گئی۔

سنی کو کراہتے دیکھ کر نائٹی نے پوچھا۔ "سنی بھائی! کیا ہوا؟ کراہ کیوں رہے ہو؟"

جواب میں ہاگ نے تفصیل سے، اسے پوری بات بتائی کہ وہ سورج کا ٹکڑا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کوشش میں ان کے ساتھ کیا ہوا؟

"تم دونوں بہت ہی بے وقوف ہو، اور بہت ہی خود غرض ثابت ہوئے ہو۔" نائٹی نے مسکرا کر کہا۔

"وہ کیسے؟" دونوں نے چونک کر پوچھا۔

"بے وقوف اس طرح کہ سورج تو یہاں سے بہت دور ہے......" نائٹی نے بتایا۔ "دور بہت دور...... دور، بہت دور...... دور بہت دور۔"

"تمہارے گھر سے بھی دور......؟" ہاگ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! میرے گھر سے بھی دور......بہت دور......" نائٹی بولی۔ "میری امی نے مجھے بتایا تھا، سورج ہمارے یہاں سے اتنا زیادہ دور ہے کہ اگر

ملاوٹ

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ چار مکھیاں بہت بھوکی تھیں۔ کئی روز سے انہوں نے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ آخر تنگ آ کر وہ چاروں اڑیں اور بازار میں پہنچ گئیں ان میں سے ایک نے پہل کی اور مٹھائی پر بیٹھ گئی۔ پیٹ بھر کر مٹھائی کھائی اور ابھی اڑنے کے لئے پر تول ہی رہی تھی کہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ مٹھائی میں زہریلا رنگ ملا ہوا تھا۔

دوسری مکھی نے اپنی سہیلی کا یہ حال دیکھا تو مٹھائی والی دکان سے منہ موڑا اور میدے کی ایک دکان پر پہنچی اس کا خیال تھا کہ میدہ تو خالص ہی ہوتا ہے اس نے خوب سیر ہو کر میدہ کھایا۔ فوراً ہی اس کے معدہ میں شدید درد اٹھا اور وہ بھی تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ اس لئے کے میدے میں پھٹکری کی ملاوٹ تھی۔

تیسری کو شدید پیاس لگ رہی تھی۔ وہ ایک حلوائی کی دکان پر پہنچی اور جی بھر کر دودھ پیا لیکن دودھ پیتے ہی اس کے پیٹ میں تشنج ہوا اور وہ بھی ڈھیر ہو گئی اس لئے کہ دودھ میں چاک ملا ہوا تھا۔ تین سہیلیوں کو یوں مرتے دیکھ کر چوتھی کو بہت دکھ پہنچا اور کہنے لگی۔ "دوستوں کے بغیر دنیا دوزخ سے بھی بد تر ہے۔ جتنی جلدی چل بسیں اچھا ہے۔"

ایک جگہ زہر آلود کاغذ آویزاں تھے مکھی نے سوچا خودکشی کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ اڑ کر ایک زہر آلود کاغذ پر جا بیٹھی اور زہر چوسنے لگی۔ جوں جوں وہ زہر چوستی جاتی تھی تندرست ہوتی جاتی تھی بڑی مایوس ہوئی اور پھر یہ کہہ کر اڑ گئی۔

"برا ہو ان ملاوٹ کرنے والوں کا ظالموں نے زہر میں بھی ملاوٹ کر دی اور اب تو مرنا بھی آسان نہیں رہا۔" مرسلہ: محمد ذیشان شریف، کشمور

ہم پوری زندگی اس کی طرف اڑتے ہیں، سفر کرتے ہیں تو پھر بھی سورج تک نہیں پہنچ سکیں گے ...... ہماری زندگی ختم ہو جائے گی، مگر یہ سفر ختم نہیں ہو گا۔"

"کیا واقعی ......؟؟؟" دونوں حیرت زدہ تھے۔

"ہاں!" نائٹی نے کہا۔ "میری امی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ سورج بہت زیادہ گرم ہے، بہت ہی زیادہ گرم ......"

"کیا آگ سے بھی زیادہ گرم ہے؟" سنی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں! آگ سے بھی زیادہ گرم ...... بہت زیادہ گرم! ......" نائٹی نے کہا۔ "اتنا زیادہ گرم کہ اگر ہم اس کے قریب جائیں تو پل بھر میں جل کر راکھ بن جائیں ......"

اس کی بات سن کر وہ دونوں نہایت ڈر گئے۔

"اس کا مطلب ہے، اگر میں اسے پکڑ لیتا تو فوراً جل کر مر جاتا؟" سنی پھریری لے کر خوف زدہ لہجے میں بولا۔

ہاں! اگر تم پکڑ لیتے تو واقعی جل کر راکھ بن جاتے!" نائٹی لفظ "اگر" پر زور دے کر ہنستے ہوئے بولی۔

"شکر ہے خدا کا!" سنی آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تم نے ہماری بے وقوفی کے متعلق تو بتا دیا۔" ہاگ نے کہا۔ "اب ذرا سا خود غرضی کے بارے میں بتاؤ۔ ہم خود غرض کیسے ہوئے؟"

"یہ جو سورج ہے ناں! ......" نائٹی نے بات شروع کی۔ "اسے خدا تعالیٰ پوری دنیا کے لئے چمکاتا ہے ...... جس طرح تمہیں ...... روشنی کی ضرورت ہے، حرارت کی ضرورت ہے ...... بالکل اسی طرح ان چیزوں کی دوسرے جانداروں کو بھی ضرورت ہے...... جب کہ تم لوگ چاہتے تھے کہ وہ صرف تمہارے پاس رہے ...... کیا یہ تمہاری خود غرضی نہیں ہے؟ ......بولو! ......"

"سوری!" دونوں شرمندہ سے ہو کر بولے۔

"اچھا بھائی! اب مجھے اجازت دو ...... ورنہ مجھے دیر ہو جائے گی ......" نائٹی نے کہا۔

"تمہاری اچھی اچھی اور مفید باتوں کے لئے تمہارا بہت بہت شکریہ!" دونوں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

تب نائٹی نے انہیں خدا حافظ کہا۔ اور پھُر سے اڑ گئی۔

اس دن کے بعد دونوں دوستوں نے کبھی بھی کوئی بے وقوفی نہ کی۔ اور نہ ہی کبھی خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔

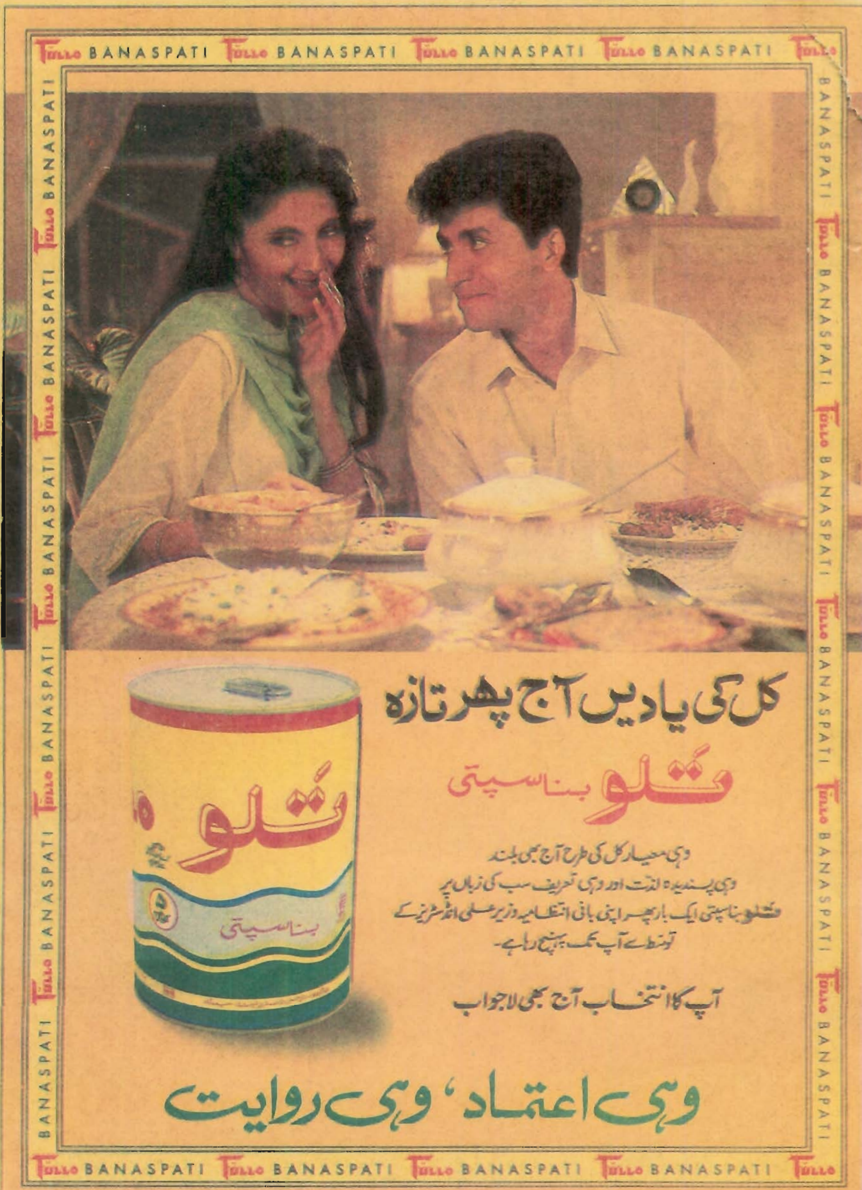
TULLO BANASPATI
کل کی یادیں آج پھر تازہ
تلو بناسپتی
وہی معیار کل کی طرح آج بھی بلند
وہی پسندیدہ لذت اور وہی تعریف سب کی زباں پر
تلو بناسپتی ایک بار پھر اپنی بانی انتظامیہ وزیر علی انڈسٹریز کے
توسط سے آپ تک پہنچ رہا ہے۔
آپ کا انتخاب آج بھی لاجواب
وہی اعتماد، وہی روایت

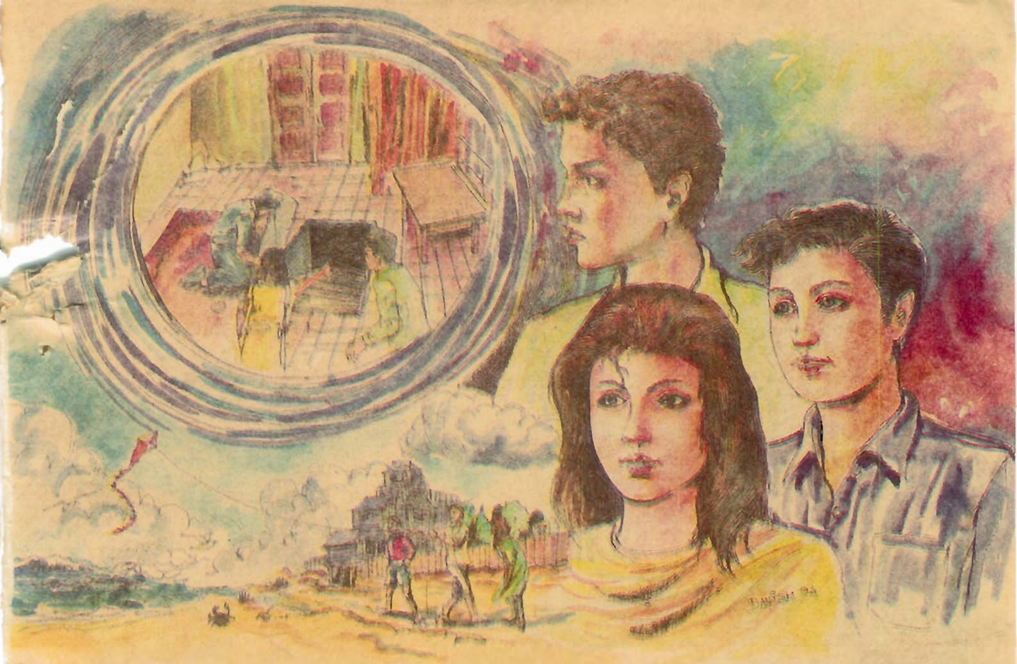

خفیہ غار

اینیڈ بلیٹن — ترجمہ: نگہت سرور

خفیہ غار کی مہم کا آغاز اس دن ہوا تھا جب فاطمہ اور میرا بڑا بھائی عمر ہم سب ساتھ تھے۔ عمر بھائی ہم دونوں سے بڑے ہیں۔ میں اور فاطمہ جڑواں بہن بھائی ہیں۔ ہمارا مکان سمندر کے کنارے واقع ہے۔ ہمارے مکان کے قرب و جوار میں کوئی اور مکان نہیں ہے اس لئے ہم لوگ بہت تنہائی محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیلہ ہے جس پر ایک بہت بڑا سا مکان بنا ہوا ہے۔ وہ ہمارے مکان کے علاوہ واحد مکان ہے جو اس علاقے میں نظر آتا ہے مگر افسوس کہ وہ مکان بھی خالی ہے۔ ہم تینوں بہن بھائی اکثر سوچتے ہیں کہ کاش اس مکان میں بہت سارے بچے ہوتے تو ہم سب مل کر کھیلتے۔ مگر چوں کہ ایسا نہیں ہے اس لئے ہم تینوں آپس میں ہی کھیل کود کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے ابو اپنے ایک بزنس ٹرپ پر ایک مہینے

کے لئے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ امی بھی ان کے ساتھ گئی تھیں۔ امی کے بغیر تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ اس لئے ہم سب نہایت بوریت محسوس کر رہے تھے تنگ آ کر ہم تینوں پتنگ اڑانے سامنے ٹیلے پر چلے گئے۔ گھر پر صرف دادا جان تھے جو ہمیں کسی بات سے منع نہیں کرتے تھے۔ (میرے خیال میں سب بچوں کے دادا جان ایسے ہی ہوتے ہوں گے)

امی نے جانے سے پہلے ہمیں ایک بہت ہی خوبصورت سی پتنگ لا کر دی تھی چنانچہ جب امی ابو کی گاڑی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ہم لوگوں نے اپنی نئی پتنگ نکالی اور اسے اڑانے کے لئے ہم نے سامنے والے ٹیلے پر جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہاں ہوا خوب تیز ہوتی تھی۔ عمر بھائی نے اس پتنگ کو فوراً اوپر اٹھا کر اڑانا شروع کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان پر چڑیا اڑ رہی ہے لیکن اچانک ہوا کم ہو گئی اور پتنگ نیچے کی طرف گرنے لگی۔ بھائی نے بہت کوشش کی کہ پتنگ نہ گرے مگر وہ ناکام رہے۔ پتنگ نیچے سے نیچے ہوتی گئی اور آخر کار درختوں کے پیچھے جا کر چھپ گئی۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ چلو چل کر دیکھتے ہیں کہ پتنگ کہاں گری ہے۔

ہم لوگ بھاگتے ہوئے ٹیلے کی طرف گئے کیونکہ ٹیلے پر وہ درخت تھا جس میں ہماری پتنگ پھنسی تھی۔ وہاں جا کر ہم لوگوں نے دیکھا ہماری پتنگ کا دھاگا ٹیلے پر واقع گھر کی دیوار کے اوپر نظر آ رہا ہے۔ عمر بھائی نے کہا کہ ہماری پتنگ یقیناً اس گھر کے باغ میں گر گئی ہوگی۔ فاطمہ نے مشورہ دیا کہ چلو ہم لوگ دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں ہو سکتا ہے کہ کوئی چوکیدار وغیرہ گھر میں ہو۔ ہم لوگ کافی دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتے رہے مگر کوئی بھی نکل کر نہیں آیا۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ دیوار پھلانگ کر اپنی پتنگ لے آتے ہیں۔ عمر بھائی نے کہا۔ "یہ بہت بُری بات ہوگی کہ ہم بغیر کسی کی اجازت لئے گھر کے اندر گھس جائیں۔" فاطمہ نے یہ سن کر کہا۔

"عمر بھائی جب گھر میں کوئی ہے ہی نہیں تو اجازت کون دے گا۔"

ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنی اتنی اچھی پتنگ کو ضرور لے کر آئیں گے اگر بعد میں کوئی اس گھر میں نظر آیا تو ہم جا کر اس کو بتا دیں گے کہ ہم ان کے گھر میں بغیر اجازت لئے چلے گئے تھے۔

عمر بھائی سب سے پہلے دیوار پھلانگ کر دیوار کی دوسری سمت اتر گئے وہاں جا کر انہوں نے چاروں سمت کا جائزہ لے کر کہا کہ یہاں سب کچھ ٹھیک ہے، تم لوگ بھی آ جاؤ۔ لہٰذا میں اور فاطمہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہاں جا کر ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ایک بہت بڑا باغ ہے لیکن اس باغ کی حالت دیکھ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سالوں سے کوئی اس طرف نہیں آیا۔ باغ کی گھاس بہت بڑھ چکی تھی اور گھاس کے چاروں طرف بچی روشں پر سبز کائی جمی ہوئی تھی۔

فاطمہ نے کہا کہ ہماری پتنگ تو نظر نہیں آ رہی ہے

آخر وہ کہاں چلی گئی اچانک عمر بھائی نے چلا کر کہا کہ دیکھو سامنے پتنگ کی ڈوری نظر آ رہی ہے۔ ہم یقیناً اس کے ذریعہ پتنگ تک پہنچ جائیں گے۔ ڈوری کے ذریعہ ہم لان کے پچھلے حصہ میں پہنچ گئے جہاں پر صرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔جھاڑیوں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو دور سے بالکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ عمر بھائی نے کہا کہ دیکھو کمرہ کی دیوار کے اوپر پتنگ لٹکی ہوئی ہے جب ہم لوگوں نے پتنگ اوپر سے کھینچ کر اتاری تو وہ اس حالت میں نہیں تھی کہ ہم اسے استعمال کر سکتے وہ بری طرح پھٹ چکی تھی۔ ہم تینوں بہت بور ہوئے کہ اب ہم آج کا سارا دن کس طرح گزاریں گے۔

فاطمہ نے کہا۔ "کیوں نہ ہم لوگ اس باغ کی صفائی کر دیں اِس طرح باغ بھی خوبصورت نظر آئے گا اور ہمارا وقت بھی اچھا گزر جائے گا۔ پھر ہم لوگ روز یہاں آکر کھیلا کریں گے۔"

عمر بھائی نے اس بات سے اتفاق کیا کیونکہ وہ ہم دونوں سے بڑے ہیں اس لئے ان کی اجازت کے بغیر ہم لوگ کوئی کام نہیں کرتے۔ ہم تینوں باغ کی صفائی میں مشغول ہو گئے ابھی ہمارا تھوڑا سا کام باقی ہی تھا کہ اچانک بارش شروع ہو گئی۔

ہم لوگ بارش میں بری طرح بھیگ گئے۔عمر بھائی نے کہا۔ "ہمیں کہیں بیٹھ کر ہوا میں کپڑے سکھا لینے چاہئیں کیونکہ اس طرح گیلے ہو کر ہم لوگ گھر جائیں گے تو دادا جان بہت ناراض ہوں گے۔"

میں نے بھائی کو مشورہ دیا کہ کیوں نے ہم اس چھوٹے سے کمرہ میں چلیں جہاں ہماری پتنگ لٹکی ہوئی تھی۔ جب ہم وہاں گئے تو دیکھا کہ اس کمرے کا دروازہ بند ہے ہم لوگ بڑے مایوس ہوئے کہ اب کیا کریں اچانک فاطمہ نے کہا۔ "دیکھو بھائی اس کمرہ کی کھڑکی کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی ہے۔"

ہمارے ہاتھ لگاتے ہی چٹخنی کھل گئی اور ہم لوگ اندر کمرے میں کود پڑے۔ اندر ہم لوگوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔

جب ہم لوگ کمرے کے اندر گئے تو دیکھا کہ اس کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا ہوا ہے اور دروازہ کی چابی ایک لاک میں لگی ہوئی ہے۔ بھائی نے کہا۔ "یہ تو بہت پراسرار سی بات ہے کیونکہ اگر کسی شخص نے اس کمرے کو اندر سے بند کیا تھا تو اس کو بھی اس کمرے میں ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ تمام کھڑکیاں بھی اندر سے بند ہیں لیکن اس کمرے کے اندر تو کوئی موجود نہیں ہے۔"

اس کمرے میں آکر ہم لوگ اس قدر خوش ہوئے کہ جلد ہی اس چابی کے چکر کے بارے میں بھول گئے۔ یہ جگہ یقیناً بہترین تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی جھولے والی کرسی تھی جس کی ٹانگ تھوڑی سی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایک کارنر میں الماری اور دو چھوٹے چھوٹے اسٹول بھی تھے۔ ایک شیلف بھی تھا لیکن وہ بہت گرد آلود اور گندہ سا تھا۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ آج کل بارشوں کا موسم ہے اس لئے یہ کمرہ ہمارے کھیلنے کے لئے بہترین جگہ

ثابت ہو سکتا ہے ہم سب مل کر اس کی صفائی کر لیں گے اور اس کا ٹوٹا ہوا اسٹول اور کرسی بھی مرمت کر کے ٹھیک کر لیں گے۔

فاطمہ نے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ "امی نے مجھے ایک اورنج رنگ کا کپڑا دیا تھا، اس کپڑے سے ان دونوں کھڑکیوں کا پردہ بنالوں گی اور اس کمرے کو بھی صاف ستھرا کر لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس کمرہ میں موجود شیلف پر اپنی چیزیں لاکر رکھ دوں گا ہم لوگ اپنی کتابیں یہاں لاکر رکھ دیں گے تاکہ یہاں سکون سے بیٹھ کر مطالعہ کریں اور کچھ پھل اور بسکٹ بھی یہاں لاکر رکھ دیں گے افوہ! کس قدر مزہ آئے گا مگر ہم لوگ یہ سب باتیں راز میں رکھیں گے ورنہ ہو سکتا ہے کہ دادا جان ہمیں یہاں آنے سے منع کر دیں۔"

عمر بھائی نے کہا۔ "ہم یہاں کوئی غلط کام نہیں کریں گے یہ تو ہمارے کھیلنے کی جگہ ہے ہم اس جگہ کو کیسے نقصان پہنچا سکتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ جس شخص کا بھی یہ مکان ہے اور وہ شخص جو کوئی بھی ہے جب وہ یہ دیکھے گا کہ ہم نے اس جگہ کو کس قدر صاف کر دیا ہے اور کتنا کار آمد بنا دیا ہے تو وہ بہت خوش ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "بھائی اب بارش رک چکی ہے اب ہمیں گھر چلنا چاہئے۔ ورنہ دادا جان رات کے کھانے پر ہمارا انتظار کرتے رہیں گے۔" ہم لوگوں نے اپنی ٹوٹی ہوئی پتنگ اٹھائی اور گھر کی طرف دوڑ پڑے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ اپنے گھر کے لان میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کرنے لگے کہ ہمیں اس ٹیلہ والے مکان پر کیا کیا چیزیں لے کر جانا ہے چیزوں کی تعداد کافی تھی لہٰذا ہم سب نے یہ فیصلہ کیا کہ دو تین چکر لگا کر سب چیزیں وہاں پہنچا دیں میں نے ایک چھوٹی سی قالین نکالی جو اسٹور میں رکھی ہوئی تھی اور اسے گھر میں کوئی استعمال نہیں کرتا تھا۔ کچھ جوس کے ڈبے بھی ہم لوگوں نے لئے ایک بوتل میں کچھ خشک میوے بھی ڈال لئے۔ گھر میں کچھ سیب بھی رکھے ہوئے تھے انہیں بھی ایک پیکٹ میں رکھ لیا۔ عمر بھائی نے کہا۔ "اگر کوئی چیز اور یاد آئی تو ہم بعد میں آکر لے لیں گے۔"

اگلی صبح سب سے پہلے ان تمام چیزوں کو ہم لوگوں نے اپنے پسندیدہ کمرے تک پہنچایا پھر وہاں کی خوب صفائی ستھرائی کی۔ کمرے کو خوب دھویا۔ شیلف پر کاغذ بچھا کر سب چیزیں سیٹ کیں فاطمہ نے کھڑکیوں کے لئے پردے بھی سی لئے تھے میں نے اور عمر بھائی نے مل کر اسٹول اور کرسی کی بھی مرمت کر لی۔ میں نے اپنی کچھ کتابیں بھی شیلف میں لاکر سجا دیں۔

وہ سخت سردیوں کے دن تھے لہٰذا ہم اپنے اس چھوٹے سے کمرے میں اتنے زیادہ مزے کرتے تھے کہ شاید لفظوں میں بیان نہ کر سکیں۔ فاطمہ کو اپنے پردے بہت پسند تھے اس کا خیال تھا کہ ان پردوں

کی وجہ سے یہ کمرہ بہت خوبصورت لگتا ہے جبکہ عمر بھائی کا خیال تھا کہ اس نے جو قالین یہاں لاکر بچھا دی ہے اس کی وجہ سے یہ کمرہ گرم ہو گیا ہے۔ ورنہ تو ٹھنڈے فرش پر پاؤں بھی رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم لوگ اپنا زیادہ تر وقت یہاں گزارتے تھے۔ ہمارے دادا جان بھی ہم تینوں سے بہت خوش رہتے تھے کیونکہ ہم ان کو بالکل تنگ نہیں کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہم لوگ سمندر کے کنارے بیٹھ کر کھیل کود کرتے ہیں۔

لیکن ہماری اس کہانی کا حیرت انگیز پہلو تو ابھی سامنے آیا ہی نہیں ہے،جو ہماری زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ ہے میں اس کے بارے میں آپ کو بتاتا ہوں۔

ہم لوگ اپنی اس چھوٹی سے جنت میں مگن تھے کہ ایک دن (تقریباً تین ہفتوں کے بعد) میرے بھائی کا ایک سکہ قالین پر گر گیا وہ سکہ قالین پر گرا اور لڑھکتا ہوا کہیں گم ہو گیا ہم لوگوں نے سوچا کہ یہ قالین کے نیچے ہو گا اس لئے قالین اٹھا کر سکہ تلاش کرنے لگے۔ جب ہم لوگوں نے قالین اٹھایا تو کیا دیکھا کہ فرش پر ایک جانب سے کریک سا پڑ گیا ہے اور اس پر بچھا ٹائل تھوڑا سا ڈھیلا ہو گیا ہے عمر بھائی نے کہا کہ شاید میرا سکہ اس کریک میں چلا گیا ہے فاطمہ نے کہا کہ ہمیں یہ ٹائل اٹھا کر دیکھنا چاہئے۔ ہم لوگوں نے لوہے کے تار کی مدد سے اس بڑے سے ٹائل کو اوپر اٹھالیا اور ایک سائیڈ پر کھڑا کر دیا ٹائل اوپر اٹھاتے ہی ہم سب کی نظریں حیرت سے پھٹی رہ گئیں ٹائل کے نیچے ایک بڑا سا سوراخ تھا جب اس سوراخ سے نیچے کی جانب دیکھا تو نیچے کی طرف سیڑھیاں نظر آئیں۔ ہم سب بہت حیران ہوئے اور ایک دم ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

عمر بھائی نے کہا۔ "شاید یہ خفیہ راستہ ہے۔" میں نے کہا۔ "چلیں عمر بھائی اندر جاکر دیکھتے ہیں۔" لیکن فاطمہ ڈری سی گئی تھی اس نے کہا۔ "پتا نہیں اندر کیا ہو؟"

میں نے کہا۔ "چلو ہم اپنا ٹارچ ساتھ لے لیتے ہیں۔" یہ راستہ دیکھ کر ہمیں اس کمرے میں دروازے پر لگی چابی کا راز سمجھ میں آگیا۔ کوئی آدمی اس کمرے کو اندر سے لاک کر کے اس خفیہ راستہ کے ذریعہ کہیں جاتا ہو گا یہ راستہ یقیناً کسی اور طرف نکلتا ہو گا۔ کس قدر حیرت انگیز بات ہے۔

ہم لوگوں نے اپنا ٹارچ شیلف پر سے اٹھایا اور اس کی مدد سے سیڑھیوں سے نیچے اترے نیچے اتر کر یہ راستہ کافی تنگ ہو گیا اور آگے جاکر ایک غار میں تبدیل ہو گیا جب ہم لوگوں نے اس غار سے نیچے کی جانب دیکھا تو ہمیں سامنے سمندر کا کنارہ نظر آرہا تھا۔ عمر بھائی نے کہا کہ دیکھو سامنے جو ٹیلہ ہے اس میں پتھریلے غار نظر آرہے ہیں۔ وہ یہ غار ہیں جو کہ ہم اکثر بورڈنگ کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ میں نے اور فاطمہ نے عمر بھائی کی اس بات سے اتفاق کیا۔

ہم لوگ فوری طور پر یہ نہیں جان سکے کہ یہ واحد راستہ ہے اس غار میں آنے کا یا اس کے علاوہ سمندر کے کنارے سے بھی کوئی راستہ اس غار کی

طرف نکلتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھنے پر ہم لوگوں نے دوسرا راستہ تلاش کر ہی لیا۔ یہ انتہائی چھوٹا سا سوراخ تھا جس کے ذریعہ بمشکل ایک وقت میں ایک آدمی اندر آسکتا تھا۔

اس غار میں چاروں طرف مختلف سائز کے بڑے بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ ہم لوگ اسے دیکھتے ہی چیخ اٹھے کہ شاید یہ اسمگلروں کا غار ہے ہم تینوں نے مل کر جلدی جلدی بکس کھولے۔ ان بکسوں میں پرانے زمانے کے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ سارے کپڑے انتہائی قیمتی اور خوبصورت تھے فاطمہ تو خوشی سے جھوم اٹھی کہ میں یہ سب قیمتی کپڑے لے جاؤں گی میں نے اس میں سے ایک بہت خوبصورت سی ٹوپی نکالی اور پہن کر باقاعدہ رقص کرنے لگا۔

فاطمہ نے کہا۔ ''چلو جلدی سے یہ سب چیزیں لے کر دادا جان کو دکھاتے ہیں۔'' ہم لوگ اپنا سامان لے کر گھر سے نکل ہی رہے تھے کہ سامنے سے دو آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ہم سب ایک دم خاموش ہو گئے ان میں سے ایک آدمی ہمارے قریب آ گیا۔ اس وقت ہم سب سناٹے میں آ گئے تھے۔ ہمیں کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم نے کوئی غلط کام کیا ہے۔ اس آدمی نے ہمارے قریب آکر کہا۔ ''تم لوگ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

فاطمہ نے کہا کہ ''اچھا تو آپ اس گھر کے مالک ہیں'' اس آدمی نے کہا۔ ''ہاں لیکن اب میں اس گھر کو بیچنا چاہتا ہوں اور میرے ساتھ جو آدمی ہے وہ اس مکان کو خریدنے آیا ہے۔''

اس آدمی نے کہا۔ ''لیکن تم لوگوں نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا ہے کہ تم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے؟'' اب وقت آ گیا تھا کہ ہم لوگ اس آدمی کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتے ہم نے اسے بتایا کہ ہم لوگ کس طرح ٹیلہ پر موجود اس خالی گھر تک آئے اور لان میں موجود جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے اس کمرے کو حادثاتی طور پر دریافت کیا اور کس طرح اس کو صاف ستھرا کر کے اپنے کھیلنے کی جگہ بنائی۔

اور آخر میں ہم نے انہیں اس خفیہ غار کے بارے میں بھی بتایا جو کے ہم نے آج ہی دوپہر کو دریافت کیا تھا۔ یہ بات سن کر وہ آدمی تو حیرت سے چلا اٹھا۔ ''کیا! تمہارا مطلب ہے کہ تم نے غار کا خفیہ راستہ تلاش کر لیا ہے؟ یہ راستہ تو سالوں سال سے نامعلوم تھا۔'' اس آدمی نے کہا۔

''میں اس گھر میں اس وقت سے رہتا ہوں۔ جب کہ میں نہایت کم عمر تھا۔ مجھے تو یہ خفیہ راستہ کبھی بھی نہیں ملا حالانکہ میں نے اسے بہت تلاش کیا تھا۔'' جب ہم نے انہیں غار میں موجود سامان کے بارے میں بتایا تو وہ شخص بہت زیادہ حیران ہوا یہاں تک کہ ہمیں یہ ڈر محسوس ہوا کہ آدمی کہیں بے ہوش نہ ہو جائے۔ جب ہم لوگوں نے ان سے اس قدر پریشان ہونے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا۔

غفلت کی سزا

محمد بلال، مینگورہ سوات

حضرت جنید بغدادی کے پاس کسی شخص نے ایک پرندہ بطور تحفہ بھیجا آپ نے اسے قبول فرماکر پنجرے میں بند کر دیا اور کچھ مدت اپنے پاس رکھ کر ایک دن اسے آزاد کر دیا۔ کسی نے پوچھا حضرت آپ نے اسے آزاد کیوں کر دیا آپ نے فرمایا مجھے اس پرندے نے بڑی منت سے کہا تھا کہ

"اے جنید! افسوس کہ تو اپنے دوستوں کے ساتھ ملاقات کا لطف اُٹھائے اور مجھے میرے دوستوں کی ملاقات سے یوں دور رکھے اور پنجرے میں بند رکھے۔" مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا۔

اُڑتے وقت وہ کہنے لگا کہ پرندہ یا جانور جب تک اللہ کے ذکر میں مصروف رہتا ہے آزاد رہتا ہے۔ اور جہاں اس پر غفلت طاری ہوتی ہے۔ قید میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

"بہت عرصے پہلے میرے دادا اس مکان کو خریدنے یہاں آئے تھے۔ میرے دادا نے اپنی تمام زندگی ملک سے باہر گزار دی تھی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی اولاد کس طرح اپنے ملک و ثقافت سے ناواقف ہوتی جارہی ہے تو انہوں نے واپس آنے کا سوچا اور اسی ارادے سے یہ مکان خریدا وہ اکیلے ہی سارا ساز و سامان یہاں لے کر آئے اور اس ارادے سے کہ یہ مکان خالی ہے کوئی چور اچکا چیزیں نہ لے جائے تمام قیمتی چیزیں اور سونا چاندی اس غار میں رکھ کر چلے گئے۔

بدقسمتی سے جب میرا خاندان پانی کے جہاز کے ذریعہ یہاں آرہا تھا تو جہاز سمندر میں طوفان آنے کی وجہ سے ڈوب گیا تمام افراد اس میں غرق ہو گئے میں واحد خوش قسمت تھا جو زندہ بچ گیا تھا۔ میں اب تک یہ سمجھتا رہا کہ میرے آبا و اجداد کا تمام مال ہمیشہ کے لئے غائب ہو چکا ہے میں تم بچوں کا بہت شکر گزار ہوں کہ تم نے میرے اس خفیہ خزانے کا پتہ لگایا ہے۔ آج کل میرے معاشی حالات سخت خراب ہیں میں نے سوچا تھا کہ اس مکان کو بیچ کر کوئی کاروبار شروع کروں گا لیکن تم لوگوں کی وجہ سے میرے دادا کی نشانی میرے پاس ہی رہے گی۔ اب میں ہمیشہ کے لئے یہاں آجاؤں گا۔"

فاطمہ نے کہا۔ "انکل آپ کے کتنے بچے ہیں؟" انہوں نے کہا۔ "میرے ماشاء اللہ چھ بچے ہیں۔"

"واہ!" یہ سن کر تو ہم سب خوشی سے اُچھل پڑے۔ یہ تو ہماری دیرینہ آرزو تھی کہ ہمارے ساتھ کھیلنے کے لئے اور بچے بھی ہوں وہ دن ہمارے لئے انتہائی خوشی و مسرت کا تھا جس دن مسٹر کامران اپنے بال بچوں کے ساتھ ٹیلے پر واقعہ اس گھر میں شفٹ ہو گئے۔

اب ہم ان کے چھ بچوں کے ساتھ مل کر کھیلتے کودتے ہیں۔

NAI LIFE

INSURANCE LINKED UNITS

نئی لائف اسکیم کے تحت بیمۂ زندگی اب منافع بخش سرمایہ کاری۔ این آئی ٹی اور اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن نے اپنے صارفین کی سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نادر موقع فراہم کیا ہے جس کے تحت این آئی ٹی یونٹ کے ساتھ ساتھ بیمۂ زندگی میں سرمایہ کاری کر کے دوہرا فائدہ حاصل کریں۔

صرف پہلا پریمیم ادا کرنے پر این آئی ٹی نہ صرف آپ کو ۲۱ سالہ انشورنس پالیسی مہیا کرے گا بلکہ بقیہ تمام پریمیم بھی ادا کرے گا جبکہ آپ اپنے یونٹس پر منافع بھی حاصل کرتے رہیں گے۔

اِس شاندار موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے این آئی ٹی کے کسی بھی دفتر سے رجوع کریں۔

NIT

نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ

صدر دفتر : نیشنل بینک آف پاکستان بلڈنگ (چھٹی منزل) آئی آئی چندریگر روڈ، پوسٹ بکس نمبر ۵۶۷۱، کراچی
فون: ۲۴۱۲۰۵۶-۵۹ ٹیلیکس: ۲۱۴۷۶ این آئی ٹی-پی کے فیکس: ۲۴۳۰۶۲۳
شاخیں: کراچی (آئی آئی چندریگر روڈ ۲۴۱۷۷۱، طارق روڈ ۴۵۵۲۵۸، سوک سینٹر ۴۹۳۶۲۲۹، نیکون ہاؤس ۵۶۸۶۷۰۶، حیدرآباد ۶۱۵۴۹۲، سکھر/لاڑکانہ ۶۰۶۳۰، لاہور (الفلاح ۶۳۰۱۸۱۰، گلبرگ ۸۷۵۲۷۹) گوجرانوالہ ۲۵۸۰۵۵، سیالکوٹ ۸۸۴۴۸، راولپنڈی ۵۶۷۲۱۷، اسلام آباد ۸۲۱۸۱۱، ملتان ۷۴۲۱۵، فیصل آباد ۵۶۳۸۸، ایبٹ آباد ۶۲۰۰، پشاور ۸۴۴۸۴۸، کوئٹہ ۶۱۷۴۴، میرپور (آزاد کشمیر) ۲۲۲۴

PID ISLAMABAD-1/94

LASER DOT Prestige

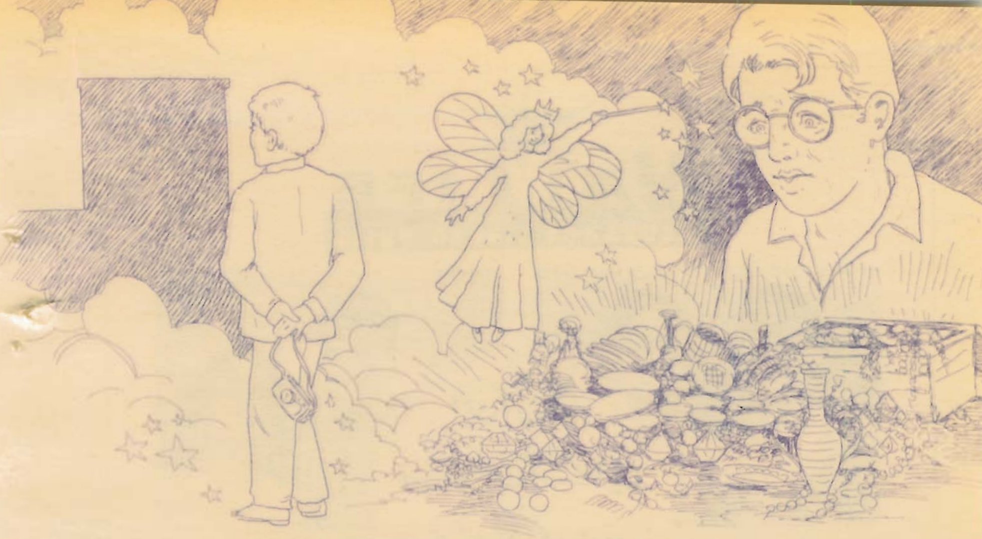

قارون کا خزانہ

عبدالقادر

پوچھو نہ حال میرا، دل گیر ہے فسانہ
اک جھونپڑا زمیں پر ہے میرا آشیانہ
مجھ کو نہیں میسر دنیا میں آب و دانہ
دن رات کھا رہا ہوں میں غم کا تازیانہ
اک انقلاب آئے، تبدیل ہو زمانہ
مل جائے کاش مجھ کو قارون کا خزانہ

لوگوں میں سب سے اونچا میرا مقام ہو گا
ہر گوشۂ زمیں پر میرا ہی نام ہو گا
جس راستے سے جاؤں مجھ کو سلام ہو گا
محلوں میں، کوٹھیوں میں میرا قیام ہو گا
ہر محل میرا ہو گا رنگیں نگار خانہ
مل جائے کاش مجھ کو قارون کا خزانہ

میرے ملازموں کی لمبی قطار ہو گی
جب میں سفر کروں گا، چمکیلی کار ہو گی
جو صبح میری ہو گی، وہ پُر بہار ہو گی
ہو گا نہ غم کا سایہ، راحت ہزار ہو گی
خوشیوں کا میرے لب پر ہو گا سدا ترانہ
مل جائے کاش مجھ کو قارون کا خزانہ

بے روز گار انساں پھرتے ہیں راستوں پر — روٹی کے چند لقمے جن کو نہیں میسّر
محرومیاں جہاں میں ان کا بنیں مقدر — جوہر چھپے ہوئے ہیں، ہوتے نہیں اُجاگر
ان کے لئے لگاؤں ہر سمت کار خانہ
مل جائے کاش مجھ کو قارون کا خزانہ

لاکھوں یتیم بچے، جن کا نہیں سہارا — لوگوں کو بات کرنا ان سے نہیں گوارا
حالت ہے ان کی خستہ، دامن ہے پارہ پارہ — اس آسماں کے نیچے ہوتا نہیں گزارہ
ہر شہر میں بناؤں، میں اک یتیم خانہ
مل جائے کاش مجھ کو قارون کا خزانہ

تعلیم کی کمی ہے اب تک مرے وطن میں — شمعیں بجھی ہوئی ہیں افسوس انجمن میں
غنچے اداس ہو کر کہتے ہیں اس چمن میں — تبدیل ہو نہ جائے یہ گلستاں دمن میں
میں علم سے منور کر دوں گا ہر گھرانہ
مل جائے کاش مجھ کو قارون کا خزانہ

ویران سر زمیں کو گلزار میں بناؤں — غربت کو دور کر کے خوشیوں کے گُل کھلاؤں
لوگوں کو ہر طرح کے امراض سے بچاؤں — بہبودیٔ وطن پر میں سیم و زر لٹاؤں
ہر ایک پر رہے گا فیضان منصفانہ
مل جائے کاش مجھ کو قارون کا خزانہ

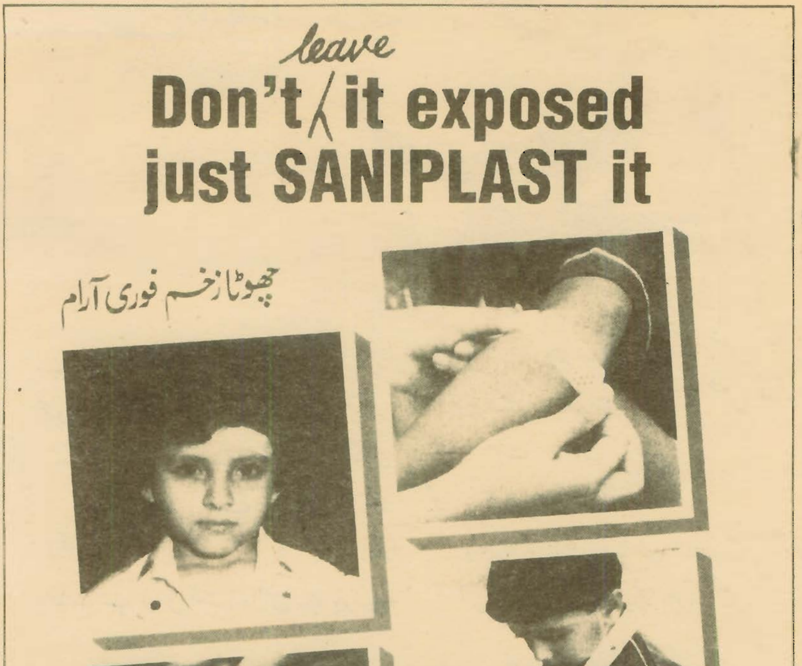
leave
Don't it exposed
just SANIPLAST it
چھوٹا زخم فوری آرام
ہر زخم پہ سنی پلاسٹ نہیں
خریدتے وقت اس بات کا
اطمینان کریں کہ دوکاندار نے
آپکو سنی پلاسٹ ہی دیا ہے
SANIPLAST
Marketed by
UNIFEROZ

بے وقت کام کا انجام

اعجاز احمد فاروقی

یہ آواز مسلسل آرہی تھی

"ٹماٹر لے لو تین روپے کلو۔"

"ٹماٹر تین روپے کلو۔"

"لال ٹماٹر تین روپے کلو، سوہنے ٹماٹر تین روپے کلو۔"

"پھر نہیں ملیں گے ٹماٹر، تین روپے کلو۔"

"لے جاؤ ٹماٹر تین روپے کلو۔"

گھروں سے لوگ ٹماٹر لینے کے لئے بے تابانہ نکل رہے تھے اور سبزی فروش سے ٹماٹر خریدتے جا رہے تھے۔ سبزی فروش اپنی ریڑھی پر آج صرف ٹماٹر ہی لئے ہوئے تھا۔ یہی ٹماٹر کوئی دو مہینے قبل بیس، تیس روپے کلو بھی بمشکل ملتے تھے اور اب ان کے دام ایسے گرے تھے کہ وہ تین روپے کلو بک رہے تھے۔

گلنار بیگم اس وقت قرآن مجید کی تلاوت کر

رہی تھی اور یہ آواز سن رہی تھی۔ اس کو بھی خیال آیا کہ ایک دو کلو ٹماٹر لینا اچھا ہی ہے۔

گلنار ...... "اشفاق بیٹا ذرا ایک دو کلو ٹماٹر تو لے آؤ۔"

اشفاق ...... "امی میں نہانے لگا ہوں آپ یاسر سے کہیں وہ لے آئے۔"

امی نے یاسر سے کہا تو اس نے بھی معذرت کرتے ہوئے کہ وہ شیو کر رہا ہے۔ آپ راجا سے کہیں وہ لے آئے۔"

اور جب راجا سے کہا گیا کہ وہ ٹماٹر لے آئے تو اس نے کہا۔

"بی بی جی میں ناشتہ بنا رہا ہوں، تین چولہے جل رہے ہیں اگر میں ذرا بھی اِدھر اُدھر ہوا تو کوئی نہ کوئی چیز جل جائے گی۔"

"راجا چولہے بند کر کے لے آ۔"

"اچھا بی بی جی۔"

"نہیں راجا رہنے دے ناشتے میں دیر ہو جائے گی۔"

"اچھا بی بی جی۔"

اب گلنار نے سلیمہ سے کہا۔

"بیلی! ذرا کھڑے کھڑے ایک کلو ٹماٹر تو لے آ۔"

بیلی ...... "امی میں فون کر رہی ہوں، کیسے جاؤں؟"

گلنار ...... "تو پھر ٹماٹر کون لائے گا؟"

ٹماٹر کون لائے گا؟ یہ سن کر بارہ سالہ جاوید نے کہا کہ اسے پیسے دیئے جائیں تو وہ ٹماٹر لے آتا ہے۔ لیکن اس کی امی نے کہا کہ جاوید تو ٹماٹر نہیں لائے گا اس لئے کہ ریڑھی والا ڈنڈی مارے گا اور سیر کے تین پاؤ ٹماٹر دے گا۔

یہ سن کر جاوید چپ ہو گیا۔

اب گلنار نے اپنے شوہر محسن کی طرف دیکھا

گلنار ...... "ذرا ہمت کریں اور ٹماٹر لے آئیں۔"

محسن ...... "میں ٹماٹر لے آؤں!"

گلنار ...... "جی ہاں۔"

محسن ...... "کیوں؟"

گلنار ...... "اور جو کوئی نہیں لا رہا۔"

محسن ...... "میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔"

گلنار ...... "تو کیا ہوا۔ ٹماٹر لے آئیں پھر اخبار پڑھتے رہئے گا۔"

محسن ...... "بھئی تم خود لے آؤنا۔"

گلنار ...... "واہ سبحان اللہ کیا بات ہے آپ کی۔ آپ اخبار پڑھنا نہیں چھوڑ سکتے اور میں تلاوت کرنا چھوڑ کر باہر ٹماٹر لینے جاؤں۔"

گلنار بیگم نے بہتیرا کہا لیکن محسن صاحب معلوم نہیں اخبار سے کون سی خبر یا مضمون پڑھ رہے تھے کہ نہیں اٹھے۔

یہ آٹھ بجے کی بات تھی نو بجے تک گھر میں صرف گلنار بیگم اور ملازم راجا رہ گئے تھے۔ باقی لوگ اپنے اپنے کاموں سے باہر جا چکے تھے۔

کوئی دس، پونے دس کے قریب راجا اپنے کام

سے فارغ ہوا تو اس کو خیال آیا کہ ٹماٹر لے لینے چاہیں۔ اس کو اس بات کا بھی افسوس ہوا کہ آج کسی نے بھی بیگم صاحبہ کی بات مان کر نہیں دی۔

راجا گھر سے باہر نکلا کہ ٹماٹر لے آئے اور دیکھا کہ ریڑھی والا خاصا دور چلا گیا ہے اور گلی کے دوسرے سرے پر کھڑا ہے۔

راجا گیا تو اطلاعی گھنٹی کی آواز سن کر گلنار باہر نکلیں، دیکھا تو دو لڑکے کھڑے ہیں۔

لڑکا ...... "السلام علیکم۔"

گلنار ...... "وعلیکم السلام۔"

لڑکا ...... "اشفاق صاحب کا گھر یہی ہے؟"

گلنار ...... "جی ہاں، لیکن اشفاق گھر پر نہیں ہے۔"

لڑکا ...... "جی وہ ہمیں معلوم ہے۔"

گلنار ...... "پھر آپ کیسے آئے ہیں؟"

لڑکا ...... "جی ہم ان کے اسٹوڈنٹ ہیں انہوں نے یہ دو کلو ٹماٹر بھیجے ہیں۔"

گلنار ...... "ہائے ہائے میں تو خود کلو ٹماٹر لے آئی تھی۔"

دونوں لڑکے گلنار بیگم کو دو کلو ٹماٹر دے کر واپس چلے گئے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد راجا بھی ایک کلو ٹماٹر لے کر آگیا۔

دوپہر ہوتے ہوتے سلیمہ کالج سے واپس آئی اور آتے ہی اپنی امی سے لپٹ گئی۔

سلیمہ ...... "امی مجھے معاف کر دیں، میں سارا دن پچھتاتی رہی ہوں۔"

گلنار ...... "کیوں بلی کس بات پر پچھتاتی رہی ہو؟"

سلیمہ ...... "صبح میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی اور ٹماٹر نہیں لائی تھی اور اب آتے آتے ایک کلو ٹماٹر لے آئی ہوں۔"

گلنار ...... "لو یہ بھی ہونا باقی تھا آج تو ہمارا گھر، ٹماٹر گھر بن گیا ہے۔"

سلیمہ ...... "ٹماٹر گھر کیا مطلب!"

گلنار نے سلیمہ کو بتایا کہ گھر میں پانچ کلو آچکے ہیں اور کہیں اس کے ابا محسن اور یاسر بھائی بھی آتے آتے ٹماٹر لیتے آئے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے گی۔

اور ہوا بھی یہی کہ گلنار کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔

محسن صاحب تو دو کلو ٹماٹر لیتے ہوئے آئے یاسر آیا تو ایک کلو ٹماٹر لیتا ہوا آیا۔

پچھلے پہر کی چائے پیتے وقت ہر ایک کو ہر ایک کی کارروائی کا علم ہو گیا تھا اور اب کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آٹھ کلو ٹماٹروں کا کیا کیا جائے۔ فرج میں تو اتنی چیزیں رکھی ہوئی تھیں کہ وہاں بمشکل ایک کلو ٹماٹر رکھنے کی گنجائش نکل سکتی تھی اور باقی سات کلو ٹماٹروں کو کیا کیا جائے ؟

ہر ایک کا چہرہ لٹکا ہوا تھا ہر ایک متاسف تھا اور ہر ایک پچھتا رہا تھا کہ ان ٹماٹروں کا کیا کیا جائے۔ ہر ایک

اپنی کوتاہی، نالائقی اور زیادتی محسوس کر رہا تھا۔
اب وہ ایسی باتیں کر رہے تھے۔

جاوید...... "امی جان اگر آٹھ کلو آم ہوتے تو مزہ آجاتا۔"

راجا...... "اگر یہ آٹھ کلو آلو ہوتے تو کوئی مسئلہ نہ ہوتے۔"

سلیمہ ...... "اگر یہ آٹھ کلو بیسن ہوتا تو پکوڑے تل تل کر کھاتے۔"

یاسر...... "اگر یہ آٹھ کلو کھجوریں ہوتیں تو کیا بات ہوتی۔"

اشفاق...... "اگر یہ آٹھ کلو انگور ہوتے تو میں انگوری سرکہ بنوالیتا۔"

گلنار...... "اگر تم میں سے کسی ایک نے بھی یہ کام وقت پر کر دیا ہوتا تو یہ ٹماٹر ہمارا منہ نہ چڑا رہے ہوتے۔" گلنار کی بات سن کر سب نے چپ سادھ لی۔ کچھ دیر بعد جاوید بولا۔ "امی جان میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔"

گلنار...... وہ کیا بیٹا۔"

جاوید...... ہمیں چاہئے کہ ان ٹماٹروں کے سڑنے کا انتظار کریں۔ اور پھر ان خراب ٹماٹروں سے ان لوگوں کی خاطر تواضع کی جائے جو آئندہ وقت پر کوئی کام نہ کریں۔"

آؤ بہن لوسی کریں کانا پھوسی

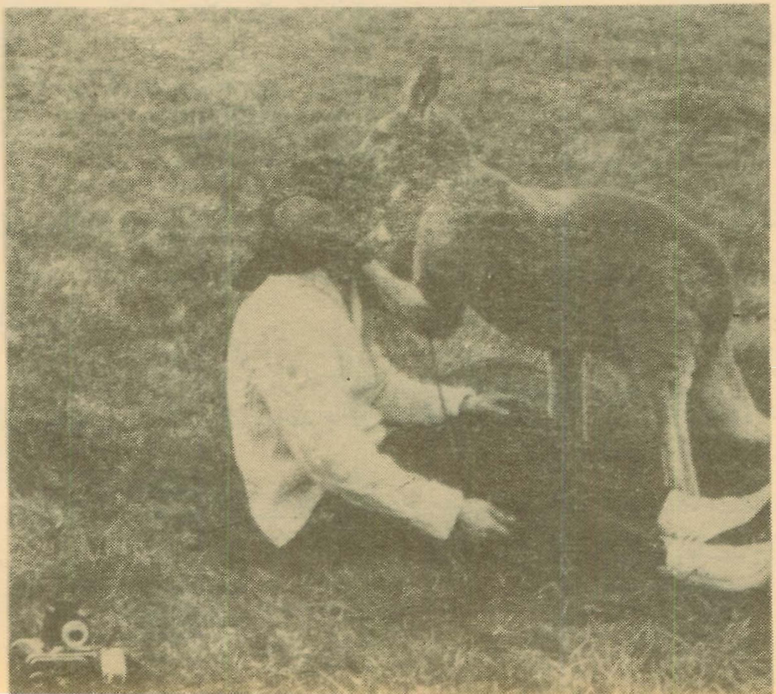

بال کی کھال

نگہت آر چوہدری

پرندوں کے پر ہوتے ہیں اور انسان کے بال۔ انسانی جسم پر صرف دو جگہ بال نہیں ہوتے۔ ہاتھ کی ہتھیلی اور پاؤں کے تلوؤں پر۔ خیال کیا جاتا ہے کہ زمانہ ماقبلِ تاریخ کے انسان کے بقیہ جسم پر بال ہی بال تھے۔

جب ماں کے پیٹ میں انسانی جسم سو دن کا ہو جاتا ہے تو جلد کے اندر سے گھنے بالوں کا ایک کوٹ سا بر آمد ہوتا ہے اور پھر مزید سو دن گزرنے پر یہ بال نرم اور روئیں میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو نوزائیدہ بچے کے سارے جسم پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ پھر یہ بال بلوغت تک بڑھتے اور تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور عمدہ شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بالغ انسانوں کے بال جنسی غدود کے ذریعے کنٹرول ہوتے ہیں۔ مردوں میں کچھ خاص قسم کے ہارمون چہرے، جسم

کیا آپ جانتے ہیں

مرسلہ...... وجاہت اللہ صدیقی، کراچی

○ پہلی جنگ عظیم میں ۱۵ ممالک نے حصہ لیا۔

○ ناگی وہ واحد مصور ہے جس کے سامنے بیٹھ کر قائد اعظمؒ نے تصویر بنوائی۔

○ دنیا میں سب سے زیادہ ناریل انڈونیشیا میں، پائے جاتے ہیں۔

اور سر پر بالوں کی افزائش کرتے ہیں اور عورتوں میں اس کے مخالف عمل ہوتا ہے۔

ہمیں بالوں کی ضرورت کیوں ہے؟ اس پر سائنس ابھی تک کوئی روشنی نہیں ڈال سکی۔ ہم کہہ سکتے ہیں بھووں، پلکوں، کانوں اور ناک کے بال گرد اور جراثیم سے محفوظ رکھتے ہیں اور مرد کے چہرے پر داڑھی اسے عورتوں سے مختلف کرتی ہے۔ چارلس ڈارون کے مطابق جسم کے بال پسینے اور پانی کو خارج کرنے میں مدد دیتے ہیں ایک بالغ مرد کی جلد پر تین لاکھ سے پانچ لاکھ بال ہو سکتے ہیں۔ گورے اور خوبصورت بالوں والے لوگوں کے جسم پر کم بال ہوتے ہیں اور سرخ بالوں والے یا کھردرے بالوں والے لوگوں کے جسم پر زیادہ بال ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے بالوں کے متعلق بہت تجسس رہتا ہے۔ بالوں کو رنگ کیسے ملتا ہے؟ بال سفید کیوں ہو جاتے ہیں؟ کچھ بال گھنگریالے کیوں ہوتے ہیں؟ سائنس کے پاس ہمارے تمام سوالوں کا جواب نہیں ہے لیکن کچھ باتیں ہم جانتے ہیں۔ بالوں کی جڑوں میں خاص قسم کے خلیات ہوتے ہیں جن میں رنگ ہوتا ہے۔ ان خلیات میں خود کو کئی بنانے کی صلاحیت ہوتی ہے اور نئے خلیات بالوں کے ساتھ ساتھ اوپر کی طرف بڑھتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں لیکن رنگوں کے چھوٹے چھوٹے دانے بالوں ہی میں چھوڑ جاتے ہیں۔ ان دانوں میں بھورے، سرخ اور گہرے کتھئی اور سیاہ رنگوں کے تمام شیڈ ہوتے ہیں۔ بال کا نوک دار حصہ جس میں یہ رنگ دفن ہوتے ہیں، زرد رنگ کا ہوتا ہے۔ بال کا یہ مادہ اور رنگوں کے دانے آپس میں ملتے ہیں تو بالوں کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ مختلف لوگوں کے بالوں کی ساخت مختلف ہوتی ہے۔ اگر ہم ایک بال کو کاٹ کر خوردبین کے نیچے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کی ایک خاص شکل ہے۔ گول سیدھا، بیضوی، لہریا یہاں تک کہ گردے کی ساخت کا بھی بال ہوتا ہے۔ اس شکل پر بال کے گھنگریالے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔ چکنا بال عام طور پر گھنگریالا ہوتا ہے اور گول، سخت اور سیدھا، لہریا اور گردے کی شکل کے بال عام طور پر چھوٹے اور گھنگریالے ہوتے ہیں۔ کالی نسلوں میں یہ اون کی طرح ہوتے ہیں۔ گول شکل بال سیدھے، سخت اور بھدے ہوتے ہیں۔ بیضوی ساخت میں بل کھائے ہوئے اور سیدھے ریشمی بال ہوتے ہیں۔ ●

SYED ORIENT

میں چھوٹی سی اِک بچی ہوں
پر کام کروں گی بڑے بڑے

تحریر: رخشندہ خالد

کیتھرینا کے جہاز میں واحد مسافر۔ اس کی پیاری گڑیا

کیتھرینا طیارے میں سوار ہونے
سے پہلے پیراشوٹ پہنتے ہوئے

بچوں نے دنیا میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ اگر ان پر اعتماد کیا جائے تو وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ حال ہی میں ایک دس سالہ بچی کیٹرنیامیومانے ۵ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک طیارہ اڑا کر دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ کیٹرنیا امریکی ریاست کیلی فورنیا کی رہنے والی ہے اور ابھی اسکول کی طالبہ ہے۔ اس نے دو سال قبل ہوا بازی کی تربیت حاصل کی، اس وقت اس کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ تربیت مکمل ہونے کے بعد اس نے نہایت اعتماد سے طیارہ اڑانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ کاک پٹ میں بیٹھی تو بالکل بھی نروس نہیں تھی۔ اس نے بعد میں بتایا کہ کاک پٹ میں بیٹھتے وقت اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ "اب واقعی مزہ آئے گا۔" احتیاطاً کیٹرنیا کے ساتھ کی نشست پر اس کا انسٹرکٹر بھی موجود تھا۔ تاکہ ہنگامی صورت حال میں مدد کر سکے لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیٹرنیا نے جس کا کنٹرول ٹاور سے رابطے کے لئے مختصر نام "کیٹ ون" تجویز کیا گیا تھا، نہایت سلیقے، احتیاط اور اعتماد کے ساتھ جہاز کو اپنے کنٹرول میں رکھا۔ کسی بھی موقع پر انسٹرکٹر کو ہدایات دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جہاز کا ٹیک آف اور لینڈنگ جو سب سے مشکل مرحلے ہوتے ہیں، کیٹرنیا نے حیرت انگیز طور پر سکون اور اعتماد کا مظاہرہ کیا۔ طیارے کو زمین پر اتارنے کے بعد جب وہ کاک پٹ سے باہر نکلی تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ اگر بچوں پر اعتماد کیا جائے تو وہ کیا نہیں کر سکتے۔

یوں تو ہوا بازی کی تاریخ میں بہت سی عورتوں نے طیارہ اڑانے میں نام پیدا کیا ہے۔ مثلاً جیکولین کوچران پہلی خاتون پائلٹ تھی جس نے

جیکولین کوچران ـ امریکہ

ہیلن ڈیوٹریو ـ فرانس

امیلا ارہاٹ ـ امریکہ

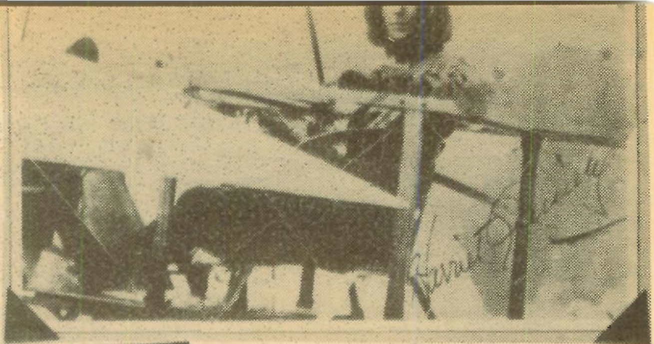

ہیرٹ کوائمی
- امریکہ

بلانچی اسکاٹ - امریکہ

بیسی کول مین - امریکہ

۱۹۵۳ء میں آواز سے زیادہ تیز رفتار طیارہ اڑایا۔ اس نے دوسری جنگ عظیم کے دوران "وومین ائیر فورس سروس پائلٹ" کی قیادت کی اور جنگی طیارے اڑا کر بڑے زبردست کارنامے انجام دیئے۔ اسی طرح فرانس کی ایک خاتون پائلٹ ہیلن ڈیوٹریو نے ۱۹۱۲ء میں اٹلی میں طیاروں کی فضائی دوڑ کا مقابلہ جیتا اور ۱۴ مرد پائلٹوں کو شکست دی۔ بیسی کول مین امریکہ کی پہلی سیاہ فام خاتون پائلٹ تھی۔ اس پُر عزم خاتون کو امریکہ کے تمام ہوا بازی کے اسکولوں نے داخلہ دینے سے انکار کر دیا جس کے بعد وہ ۱۹۲۲ء میں یورپ گئی اور وہاں اس نے ہوا بازی کی تربیت اور لائسنس حاصل کیا۔ امیلا ارہارٹ اوّلین خاتون پائلٹ تھی جس نے ۱۹۳۲ء میں تن تنہا بحراوقیانوس کو عبور کیا۔ ۱۹۳۷ء میں اس کا طیارہ پرواز کے دوران پراسرار طریقے سے غائب ہو گیا اور پھر اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس سے قبل ۱۹۱۷ء میں ہیرٹ کوائمی سطح آب کے اوپر جہاز اڑانے کی مہم سر کر چکی تھی۔ لیکن کیٹرنیا میوما ان سب کے مقابلے میں سب سے نو عمر ہے اور اس حوالے سے اس کا نام ہوابازی کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔

ہڈیوں کے ماہر

مُحمّد جاوید خالد

یوں ہی سڑک کنارے — کرتے ہوئے اشارے

افراد دو کھڑے تھے — ماہر تھے ہڈیوں کے
مرکز تھا گفتگو کا — اک شخص ان کی ایسا
جو دُکھ اٹھا رہا تھا — لنگڑاتا آرہا تھا
ان میں سے ایک بولا — "ہے یہ خیال میرا
ٹخنے کی ہڈی اس کی — اک حادثے میں ٹوٹی
چلنا ہے جب ہی مشکل — لگتی ہے دور منزل"

تھا دوسرا جو ماہر — کہنے لگا وہ یوں پھر
"دعویٰ غلط ہے تیرا — ہے یہ خیال میرا
ٹخنا ہے ٹھیک اس کا — ٹوٹا مگر ہے گھُٹنا"
ہر اک کو رائے اپنی — بس لگ رہی تھی اچھی
دونوں لکھے پڑھے تھے — دونوں ڈٹے ہوئے تھے

اتنے میں جو بچارا — لگتا تھا دکھ کا مارا
لنگڑا کے چلتا چلتا — جب پاس ان کے پہنچا
آگے بڑھے وہ دونوں — کہنے لگے وہ دونوں

"لنگڑاتے آرہے ہو — زحمت اٹھا رہے ہو
کیا ہے تمہارا ٹوٹا — گھٹنا ہے یا کہ ٹخنا"
پہلے ہوا وہ حیراں — اپنی ٹٹولی ہڈیاں
پھر بات ساری سمجھا — اور ہنس کے ایسے بولا

"میں اس لئے ہوں بے کل
ٹوٹی ہے میری چپل"

الٹی گنگا

اشتیاق احمد

"ابو! آج میں نے پھر پین گم کر دیا ہے۔" منے میاں گھر میں داخل ہوتے ہوئے چہکے۔

"کب، کہاں ...... تیسرا پین بھی گم کر دیا؟" طارق صاحب چلائے۔

"جی ہاں! اور کل انشاء اللہ چوتھا پین بھی گم ہو گا۔"

"اور یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں تمہیں چوتھا پین لے کر دوں گا۔" طارق صاحب بولے۔

"ہائیں! تو کیا ابو آپ مجھے اسکول سے اٹھا رہے ہیں؟ ...... اس طرح تو میں اَن پڑھ رہ جاؤں گا ...... آپ مجھے پر یہ ظلم تو نہ کریں۔"

"کیا کہا ...... میں اور تم پر ظلم کروں گا ...... ٹھہرو ابھی بتاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے منے میاں کو کان سے پکڑ لیا، کان جو مروڑا تو وہ لگے چلانے، ان کے چلانے کی آواز سن کر امی جان دوڑیں:

"آئے ہائے. کیا میرے بچے کی جان لے کر چھوڑیں گے۔" انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"اور سنیں...... کہیں کان پکڑنے اور مروڑنے سے بھی کوئی مرتا ہے ...... بیگم ...... اف ایسی بے پر کی تو نہ اڑائیں۔"

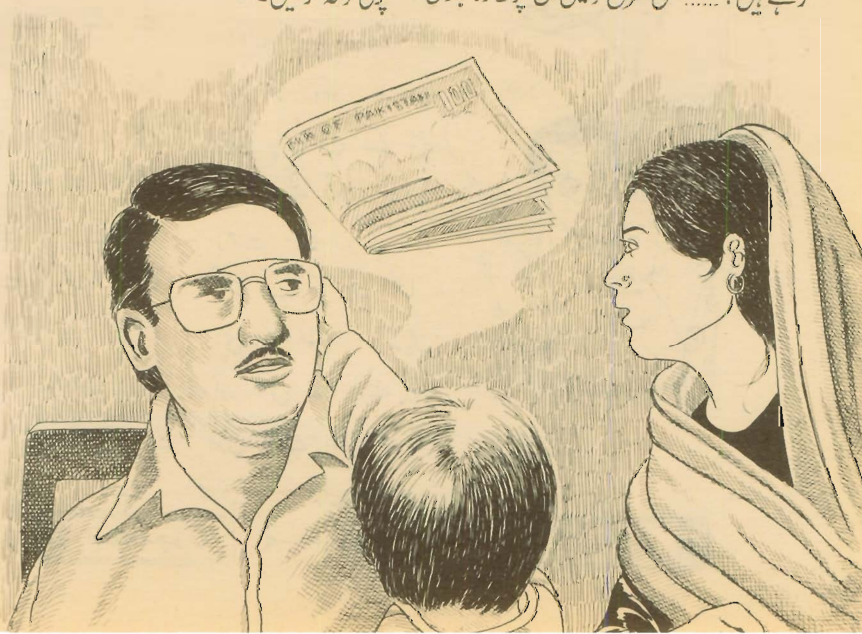

"اچھا! میں بے پر کی اڑاتی ہوں ...... اور خود آپ ...... کبھی اپنی باتیں بھی توجہ سے سنی ہیں۔"
انہوں نے آنکھیں نکالیں۔
"حد ہو گئی ...... اپنی باتیں بھی کوئی سنتا ہے، ...... ذرا آپ ہی بتائیں ...... آخر پین روزانہ گم کرنے کی تُک کیا ہے۔"
"بچہ ہے، بس ہو جاتا ہے گم۔"
"میں پین کی بات کر رہا ہوں ...... گم کی ...... اوہ میرا مطلب ہے، بچے کی نہیں۔"
"میں بھی پین کی بات کر رہی ہوں۔"
"ابو میں بھی پین کی بات کر رہا ہوں۔"
"...... سنا ...... یہ بھی پین کی بات کر رہے ہیں۔" ابو چلّائے۔
"یہ گھر میں کیا پین پین کی آوازیں گونج رہی ہیں ...... ہمارا گھر ہے یا پینوں کی دکان۔"
دادی اماں کی آواز سنائی دی۔
"لیجئے ...... اب آگئی ہیں آپ کی امی جان ...... اب انہیں جواب دیجئے گا۔"
"جواب تو جب ہی دوں گا نا، جب وہ کوئی سوال کریں گی۔"
اتنے میں دادی اماں نزدیک آگئیں۔
"یہ کیا ہو رہا ہے۔"
"ایک پین روز گم ہو رہا ہے اور یہ کارنامہ آپ کے یہ پوتے کر رہے ہیں۔"
"منے میاں ایک پین روز گم کر رہے ہیں!"
دادی جان حیران ہو کر بولیں۔

"جی ہاں! پوچھ لیں خود ان سے۔"
"دیکھیں بیٹا! اتنے پین گم کرنا تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ چلیں آپ مہینے میں پندرہ پین گم کر لیا کریں۔"
"ہائیں امی جان! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ...... آپ کو پتا بھی ہے ...... میری تنخواہ کتنی ہے ...... اگر یہ حضرت ہر ماہ پندرہ پین باقاعدگی سے گم کرتے ہیں تو میرا تو ہو جائے گا کباڑا۔"
"اچھا خیر ...... منے بھئی آپ باقاعدگی سے اب نہ کیجئے گا۔"
"یہ ...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" ابو بولے۔
"کیا میں نے کوئی غلط بات کر دی ...... ہوں جو پرانے زمانے کی ...... بس اب تم منے میاں کو کچھ نہ کہنا۔" دادی جان نے کہا۔
"لیکن دادی جان ...... یہ نہیں ہو سکتا ہے۔" منے میاں پٹ سے بولے۔
"کیا نہیں ہو سکتا۔"
"مہینے میں پندرہ پین مجھے منظور نہیں ...... وہ بھی بے قاعدگی سے ...... ہر کام میں قاعدہ ہونا چاہئے، ہونا چاہئے نا؟"
"ہاں! وہ تو خیر ہونا چاہئے ...... یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ ہر کام قاعدے کے مطابق کرتے ہیں۔"
"شکریہ دادی جان ...... تو یہ طے رہا۔" منے میاں، خوش ہو کر بولے۔

"کیا طے رہا؟" انہوں نے گھبرا کر کہا۔
"مہینے میں تیس پین۔"
دادی جان نے گھبرا کر اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔
"آپ جائیں ...... میں اس نالائق سے خود نبٹ لوں گا۔"
"لیکن تم اسے مارو گے نہیں، وعدہ کرو۔"
"وعدہ کرتا ہوں ...... نہیں ماروں گا۔"
"اور کان بھی نہیں کھینچو گے۔"
"نہیں کھینچونگا۔" ...... ابو بولے۔
"اور گھور کر بھی نہیں دیکھو گے ...... دیکھو تو مارے خوف کے اس کا کتنا سا منہ نکل آیا ہے۔"
"جی ہاں! میں بھی دیکھ رہا ہوں ...... آپ فکر نہ کریں۔"
دادی جان تو چلی گئیں ...... ابو نے منہ پھُلا لیا ...... گویا منے میاں سے مکمل طور پر ناراض ہو گئے۔
"ابو! آپ ناراض ہو گئے؟"
"یار آخر آپ اتنے پینوں کو گم کر کے کرتے کیا ہیں؟"
"جاننا چاہتے ہیں؟" منے میاں خوش ہو کر بولے۔
"ہاں!" انہوں نے فوراً کہا۔
"تو ایسے بات کریں نا ...... میں نے اس وقت تک تین پین گم کیے ہیں ...... چوتھے کی باری کل ہے ...... گویا ابھی ستائیس پین باقی ہیں ...... آپ ایسا کریں ستائیس پینوں کے پیسے اسی وقت دے دیں پھر کوئی پن گم نہیں ہو گا۔"
"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ...... منے میاں ...... کیا آپ کا دماغ واقعی الٹ گیا؟"
"نن نہیں ...... اچھا پھر اسی طرح ٹھیک ہے۔" منے میاں گھبرا گئے۔
"کیا ٹھیک ہے؟"
"ایک پین روز ٹھیک رہے گا۔"
"حد ہو گئی ...... بھئی آپ بات بتا رہے ہیں یا نہیں۔"
"تو ستائیس پینوں کے پیسے ادھر کریں نا؟ یعنی صرف چار سو پانچ روپے۔"
"اب میں آپ کو مار بیٹھوں گا۔" ابو نے آنکھیں نکالیں۔
"اور دادی جان سے کیا ہوا وعدہ توڑ دیں گے آپ؟" انہوں نے معصومانہ انداز میں کہا۔
"اچھا بابا ...... آپ جیتے ...... میں ہارا ...... یہ لیں ۴۰۵ روپے ...... اب جلدی سے اصل بات بتا دیں یہ کہہ کر انہوں نے نوٹ گن دیئے۔
"منیر کے ابو کتابوں کی ایک دکان پر ملازم ہیں۔ انہیں صرف ایک ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے ...... جن سے ان کا گزارا اس قدر مشکل سے ہوتا ہے کہ کیا بتاؤں ...... ایسے میں چند دن پہلے چائنا پینوں کا ایک ڈبا کوئی گاہک چرا کر لے گیا ...... دکان کے مالک نے ان کی تنخواہ میں سے ساڑھے

چار سو روپے کاٹنے کا اعلان کر دیا۔ گویا اب پہلی تاریخ کو انہیں تنخواہ ملے گی ساڑھے پانچ سو اور وہ ابھی سے اس خیال سے دبلے ہوئے جا رہے ہیں کہ آئندہ ماہ گزارا کس طرح ہو گا...... جب یہ بات مجھے معلوم ہوئی تو میں نے یہ اسکیم بنائی کہ ایک پین روزانہ گم کر دیا جائے ...... اس طرح مہینے کے آخر تک چار سو پچاس روپے کے پین ہو جائیں گے اور وہ پین دکان کا مالک اپنے نقصان کے بدلے وصول کر لے گا...... یہ ہے ساری کہانی۔"

ابو چند سیکنڈ خاموش رہے ...... پھر مسکرا کر بولے۔

"نہیں بھئی ...... آپ نے یہ بات مجھے کیوں نہ بتا دی ...... میں چار سو پچاس روپے دے دیتا۔"

"ایک بار میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے ایک دوست کے والد کو پانچ سو روپے کی شدید ضرورت ہے...... آپ نے بات سنی ان سنی کر دی تھی اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا...... میں نے یہ سوچا کہ اس بار پھر مجھے اپنا سا منہ لے کر رہ جانا پڑے گا ...... تو کیوں نہ کوئی اور ترکیب کی جائے۔"

"اور ہاں! مجھے یاد آ گیا...... واقعی ...... یہ میری غلطی تھی...... اچھا منے میاں...... تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کا کان پکڑا تھا نا؟"

"جی ہاں! لیکن کوئی بات نہیں ابو۔"

"اور میں نے کان مروڑا بھی تھا نا؟"

"کوئی بات نہیں ابو۔"

"بات کیوں نہیں ...... بہت بڑی بات ہے ...... جس کا کوئی قصور نہیں اس کا میں نے کان پکڑا اور مروڑا اور جس نے قصور کیا...... اس کے کان کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا...... آپ ذرا میرا کان پکڑیں اور مروڑیں۔" وہ بولے۔

"یہ آپ ...... آپ کہہ رہے ہیں ابو!"

منے میاں گھبرا گئے۔

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ چار سو پانچ روپے میں آپ کے پاس رہنے دوں اور آپ کل یہ منیر کے والد کو دے دیں تو اس کی شرط یہ ہے کہ آپ میرا کان پکڑیں اور مروڑیں۔"

"یہ ...... یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔"

"تو پھر یہ روپے مجھے واپس دے دیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے نوٹ اچک لئے۔

"مم ...... میں کان پکڑ لیتا ہوں ...... لیکن مروڑوں گا نہیں۔"

"تب پھر نوٹ نہیں ملیں گے۔"

"اچھی بات ہے ...... جھکئے ......"

ابو جھک گئے...... منے میاں نے ان کا کان پکڑ کر مروڑا ہی تھا کہ امی جان اور دادی جان کی آوازیں سنائی دیں۔

"ہائیں! یہ کیا ہو رہا ہے ...... یہ اس گھر میں الٹی گنگا کب سے بہنے لگی۔"

اور وہ ہنسنے لگے ...... پھر ابو انہیں اصل بات بتانے لگے۔

●

بلا عنوان

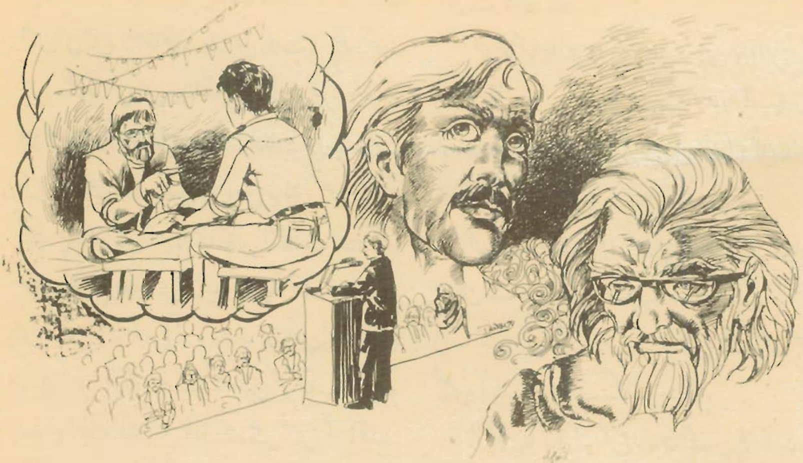

سیّدہ صدف عرفان

آج شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں پروفیسر جمال بیگ کے اعزاز میں زبردست تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ پروفیسر جمال بیگ کچھ عرصہ قبل ہی امریکہ سے تعلیم مکمل کر کے لوٹے تھے۔ سائنس کی دنیا میں ان کے نظریات نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ یہ تقریب ان کی علمی اور سائنسی خدمات کو سراہنے کے لئے منعقد کی گئی تھی۔

تقریب کے اختتام سے قبل پروفیسر جمال بیگ کو دعوت دی گئی کہ وہ اسٹیج پر آکر آج اپنی نجی زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں۔

وہ ڈائس پہ آئے تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"معزز سامعین! میں آپ سب کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں بلا کر عزّت بخشی۔ میری نجی زندگی کے بارے میں آپ نے کچھ جاننے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک ایسا واقعہ سنانا چاہتا ہوں جس نے مجھے موجودہ مقام دلانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ میں دراصل کسی کا مقروض ہوں اور مجھے قیمت چکانی ہے۔" پروفیسر جمال رکے۔

سب لوگ انہیں متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ "یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ایف ایس سی میں پڑھتا تھا۔ والدین وفات پا چکے تھے۔ اس لئے ہاسٹل میں رہتا تھا اور ٹیوشن وغیرہ پڑھا کر اپنا خرچ پورا کرتا تھا۔ سالانہ امتحانات قریب تھے۔ ہمیں پڑھنے کے لئے چھٹیاں دی جا چکی تھیں۔ میں لکھنے پڑھنے میں لاپروا تھا لیکن امتحانات سے کچھ عرصہ قبل پڑھائی میں سنجیدہ ہو جاتا تھا۔ اس لئے میں نے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اور تقریباً امتحان کی تیاری مکمل کر لی، صرف کیمسٹری کی کتاب کا ایک باب ایسا تھا جو مجھے کسی طور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاسٹل میں اپنے کلاس فیلوز اور سینئرز سے پوچھا، لیکن کوئی بھی نہ سمجھا سکا۔ کلاس فیلوز کا کہنا تھا کہ ہم تو چوائس میں چھوڑ دیں گے۔ سینئرز نے اپنی ازلی لاپرواہی کی بدولت نہایت سکون سے کہہ دیا تھا کہ اب یہ باتیں کون یاد رکھے؟ مجھے کیمسٹری کے ٹیچر سر اکبر ڈار یاد آ رہے تھے۔ جو بے حد اچھے اور فرض شناس استاد تھے۔ جانتے تھے کہ کس طالب علم کو سمجھانے کے لئے کون سا طریقہ بہتر رہے گا۔ لیکن بدقسمتی سے مجھے ان کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔

اسی شام میں کوئی چیز خریدنے بازار گیا۔ تو اپنے ایک کلاس فیلو عبداللہ سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے وہیں بازار میں کھڑے کھڑے اپنا مسئلہ بتایا تو وہ ہنس پڑا۔

"بھلا یہ کیا مشکل ہے۔ سر اکبر تو ہمارے محلے میں ہی رہتے ہیں...... تین چار گلیاں چھوڑ کر۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں فوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ سر کے گھر پہنچے تو پورا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ آج سر کی بیٹی کی شادی تھی۔ سر بہت مصروف تھے۔

ان سے ملاقات کی ...... اپنا مسئلہ انہیں بتایا۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس قدر شور ہنگامے میں مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ سر بھانپ گئے۔ بولے:

"تم ایسا کرو کہ آج رات ایک بجے آ جانا۔ میں تمہیں سمجھا دوں گا۔ تمہارے امتحانات بھی پرسوں سے شروع ہو رہے ہیں۔"

"لیکن سر آپ کی نیند" ...... میں ہچکچایا۔

"ارے! سونے کے لئے عمر پڑی ہے۔" وہ ہنس پڑے۔ میں ہاسٹل آ گیا۔ رات کو وارڈن سے خصوصی اجازت لے کر سر کے گھر پہنچا۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے سمجھانا شروع کیا۔ ڈھائی گھنٹے کے بعد جب انہوں نے پڑھانا ختم کیا تو وہ باب اچھی طرح میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ سر کی آنکھیں نیند کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ میں شرمندہ تھا۔ میری وجہ سے سر کتنا بے آرام ہوئے تھے۔ سارا دن کام کی تھکن رہی اور رات کو میں نازل ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار ان کے سامنے کیا تو وہ ہنس پڑے۔

"کچھ نہیں ہوتا بیٹے۔ تمہارے یہ امتحانات

بہت اہم ہیں!!"

"لیکن سر آپ کی نیند میری وجہ سے خراب ہوئی اور ......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں واقعی بہت شرمندہ تھا۔ انہوں نے پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور بولے'

" جمال بیٹا توجہ سے پڑھو۔ محنت کرو۔ دنیا میں کچھ بن کے دکھاؤ میری نیند کی قیمت وصول ہو جائے گی۔ " یہ جملہ میرے دل میں اتر گیا۔ اس دن کے بعد سے میری تمام توجہ پڑھائی کی طرف ہو گئی۔ دن رات محنت کی۔ سائنس دان بنا۔ عزّت ملی شہرت ہوئی، میں کامیابی کا زینہ طے کرتا گیا۔ ہر کامیابی پہ میرا دل کہتا کہ میں نے اپنے استاد کی، نیند کی قیمت ادا کر دی، لیکن دماغ کہتا...... نہیں...... میرے استاد کی نیند اتنی سستی نہیں تھی، اس کی قیمت چکانے کے لئے مجھے اور آگے جانا ہے، بہت سی کامیابیاں حاصل کرنی ہیں۔ لوگ محنت کرتے ہیں، نام کماتے ہیں، اپنے لئے، عزّت و شہرت کے لئے، والدین کا اور اپنا نام روشن کرنے کے لئے ...... لیکن میری اس دن رات کی محنت کا مقصد صرف اپنے محترم استاد کی خواہش کی تکمیل تھا۔

"نہ جانے میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا یا نہیں!!" پروفیسر جمال بیگ خاموش ہو گئے تھے۔ پورا ہال خاموش تھا۔ تمام آنکھیں عقیدت سے اس چہرے پہ جمی تھیں جو مغموم نظر آرہا تھا۔ اتنے میں ہال کے ایک گوشے میں ہلچل مچی۔ سفید جھاگ جیسے بالوں والا شخص لاٹھی ٹیکتا اسٹیج پر چڑھ آیا۔

پروفیسر جمال نے غور سے اس شخص کو دیکھا۔

"سر! آپ آپ اور یہاں!!" وہ حیرت اور خوشی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ سر اکبر کچھ نہیں بولے بس چپ کھڑے انہیں دیکھتے رہے۔ "سر! کیا میری یہ حقیر سی کاوشیں، چھوٹی چھوٹی کامیابیاں آپ کی نیند کی قیمت بن سکتی ہیں؟" انہوں نے سر کا ہاتھ تھام کر لجاجت سے پوچھا تھا۔

"یہ حقیر سی کاوشیں نہیں ہیں بیٹا! یہ تو روشنیوں کا وہ مینار ہے جس پہ چڑھنا کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ آج ایک شاگرد نے اپنے استاد کو وہ قیمت ادا کی ہے جو اس سے پہلے کسی شاگرد نے کسی استاد کو نہ کی ہو گی۔ "

سر نے بڑھ کر انہیں گلے سے لگالیا!!

انمول ستارے

مرسلہ...... عرفان حسین، کراچی

○ عقلمند انسان بات سنکر بولتا ہے اور بے وقوف بغیر سنے اور سوچے بولتا ہے۔

○ جو بات اچھی سنو اس پر عمل کرو۔

○ استاد کا احترام کرنا چاہئے کیونکہ استاد کا درجہ باپ کے برابر ہوتا ہے۔

○ عقل کے مقابلے میں طاقت کی حیثیت کچھ بھی نہیں ہے۔

○ جس انسان کے دل میں کوئی خواہش نہیں وہ فرشتہ صفت انسان ہے۔

انگلیوں کی پور، اثر پذیر زور
فٹنس
پارٹنر
دل و دماغ اور اعصابی تناؤ کیلئے
جگر اور معدے کیلئے
سانس و بلڈ پریشر کیلئے
اکوا پنکچر کے اصولوں کے مطابق
2 اسپرنگ اور 3 اسپرنگ کے ساتھ
PARTNER
Fitness
Partner
Fitness on Finger-tips

ہنستے ہنستے

ایک صاحب بہت شیخیاں بگھارتے کہ مجھ سے اچھا شکاری آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ ایک روز ان کے دوست انہیں شکار پر لے گئے شکاری صاحب نے مرغابی کو دیکھ کر جو فائر کیا تو وہ ایک مینڈک کو غلطی سے لگ گیا۔

"وہ اپنی شرمندگی چھپانے کے لئے بولے. "کیا زبردست نشانہ تھا مرغابی کے پر صاف کر دیئے۔"

مرسلہ ...... سید عابد مہدی، ایبٹ آباد۔

آرٹسٹ نے گاہک سے کہا. "اس تصویر کے پیچھے میرے پانچ سال گزر گئے۔"

گاہک نے پوچھا. "اس قدر محنت کرنی پڑی آپ کو ؟"

"جی نہیں! تصویر تو ایک ہفتے میں ہی بن گئی تھی مگر گاہک پانچ سال بعد ملا ہے۔"

مرسلہ ...... میر عدیل پرویز، آزاد کشمیر۔

راہ گیر. "تمہیں شرم نہیں آتی؟ یہاں کھڑے ہو کر بھیک مانگ رہے ہو۔"

فقیر. "تو کیا میں دفتر کھول لوں اور اخبار میں اشتہار دے دوں کہ مجھے اس پتے پر بھیک پہنچائی

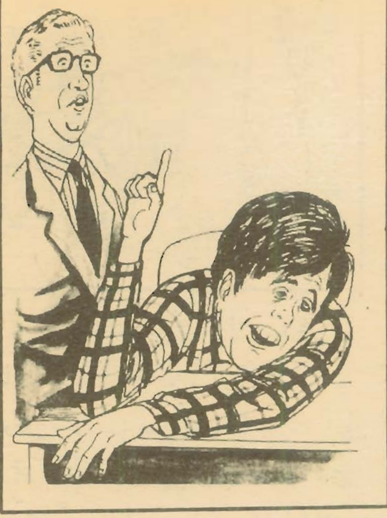

جائے۔"

فقیر نے غصے سے بھناتے ہوئے کہا۔

مرسلہ ...... محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔

منصور کو کھانے پینے کا بہت شوق تھا۔ جب امتحان میں اردو کا پرچہ آیا تو اسے ایک شعر بھی لکھنا تھا۔ اس نے لکھا

شکم کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری غذا کیا ہے

مرسلہ ...... ثنا اختر، اسلام آباد۔

میزبان: "بھئی تکلف نہیں کیجئے، بتایئے چائے چلے گی یا ٹھنڈا؟"

مہمان: "اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ چائے بننے تک ٹھنڈا ہی سہی۔"

مرسلہ ...... محمد عمر قریشی، اسلام آباد۔

ایک شخص کسی ہوٹل میں گیا۔ ہوٹل میں بہت گرمی تھی۔ اس نے اپنا کوٹ اتارا اور لٹکا دیا اور پرچی لکھ کر لگا دی "میرا کوٹ کوئی نہ اتارے میں ریسلنگ کا چیمپئن ہوں۔"

جب تھوڑی دیر بعد آدمی کوٹ لینے گیا تو کوٹ موجود نہ تھا اور یہ پرچی لگی ہوئی تھی۔ میرے پیچھے کوئی نہ آئے میں دوڑ کا عالمی چیمپئن ہوں۔

مرسلہ ...... محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔

والیٔ بھوپال شاہجہاں بیگم کے شوہر نواب صدیق حسن کی خدمت میں ایک مولوی صاحب ملازمت کے امیدوار ہو کر آئے۔ نواب صاحب نے ان کا نام پوچھا تو بولے۔

"محمد مداح الدین احمد قادری مجددی"

نواب صاحب مسکرا کر بولے۔ "آپ کے نام میں تو بہت سی دالیں ہیں۔"

مولوی صاحب برجستہ بولے۔ "سرکار! کوئی دال تو گل جائے گی۔"

مرسلہ ...... تسنیم سلطان، کراچی۔

استاد۔ (شاگرد سے) قومی اسمبلی میں کتنے اسپیکر ہوتے ہیں؟

شاگرد۔ جناب! تین ہوتے ہیں۔"

استاد۔ (غصے سے) وہ کیسے؟"

شاگرد۔ "نمبر ۱ اسپیکر نمبر ۲ ڈپٹی اسپیکر نمبر ۳ لاؤڈ اسپیکر۔"

مرسلہ ...... نعمان عطاء اللہ، گوجرانوالہ۔

ایک آدمی جوتے خریدنے گیا اس کا پیر کافی بڑا تھا لہٰذا اسے کوئی جوتا پورا نہ آ رہا تھا۔

دکان والا بے حد پریشان تھا ہر سائز آزمائے جا چکے تھے کہ اچانک لائٹ چلی گئی ان صاحب کا پیر اچانک کسی جگہ پڑا انہوں نے نعرہ لگایا آ گیا جوتا آ گیا اب جو لائٹ آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کا پیر جوتوں کے ڈبے میں پڑا تھا۔

مرسلہ ...... سید عابد مہدی، ایبٹ آباد۔

ایک آدمی رنگ ریز کی دکان پر گیا اور کہا کہ "اس کپڑے کو ایسا رنگ دیں جو نہ کالا ہو نہ پیلا، نہ سرخ، نہ سبز ہو، نہ جامنی، نہ گلابی ہو، نہ نارنجی۔ سمجھے؟"

رنگ ریز: "سمجھ گیا۔"

آدمی: "تو میں کب آؤں؟"

رنگ ریز اس دن جب نہ ہفتہ ہو، نہ اتوار، نہ پیر ہو، نہ منگل، نہ بدھ ہو، نہ جمعرات اور نہ جمعہ۔"

مرسلہ ...... عنبرین سعید، کراچی۔

پادری نے بچے سے پوچھا "بیٹے ڈاک خانہ کہاں ہے؟"
بچے نے اشارے سے بتا دیا تو پادری بہت خوش ہوا اور کہنے لگا۔
"بیٹے کل گرجا آنا میں تمہیں جنت کا راستہ بتاؤں گا۔"
بچے نے جواب دیا، "آپ کو ڈاک خانے کا راستہ معلوم نہیں، آپ جنت کا راستہ کیا بتائیں گے۔"
مرسلہ ...... نعمان عطاء اللہ، گوجرانوالہ۔

ایک بھکاری نے دوسرے بھکاری کو سڑک پر کھڑے بھیک مانگتے دیکھا تو کہا۔
"تمہاری جگہ تو پل پر تھی؟ پھر تم نے جگہ کیوں تبدیل کر لی؟"
پہلے بھکاری نے کہا، "بات دراصل یہ ہے کہ کل میرے بیٹے کی شادی ہوئی ہے میں نے پل اس کو شادی کی خوشی میں تحفے میں دے دیا ہے۔"
مرسلہ ...... نوشین شیخ (؟)

ایک شخص کسی کے گھر مہمان ٹھہرا بہت دن گزر گئے آخر میزبان تنگ آ گیا اور ایک دن اس نے مہمان سے کہا کہ آپ کے گھر والے تو آپ کو بہت یاد کر رہے ہوں گے مہمان نے جلدی سے کہا "ہاں واقعی اس لئے میں نے سوچا ہے کہ تار بھیج کر انہیں بھی بلوا لوں۔"
مرسلہ ...... شہربانو بشارت، رحیم یار خان۔

ایک شربت فروش اپنے مفت خورے دوست سے سخت نالاں تھا کیونکہ وہ دو تین گلاس مفت شربت روز ہی پیتا تھا۔ آخر ایک دن شربت فروش نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اسے شربت نہیں پینے دے گا اگلے دن مفت خورہ آیا اور دکان دار سے بولا۔" آج تمہارے لئے ایک خوش خبری لایا ہوں۔" کسی اچھی خوش خبری کی امید میں شربت فروش نے مفت خورے کو شربت پلا دیا۔ شربت پینے کے بعد مفت خور نے کہا "خوش خبری یہ ہے کہ اب میں تمہاری دُکان سے شربت مفت کے بجائے ادھار پیا کروں گا۔"
مرسلہ ...... شہربانو بخاری، رحیم یار خان۔

ایک مداری تماشہ دکھا رہا تھا۔ اس نے ہجوم میں سے ایک لڑکے کو بلا کر کہا۔
"تم نے مجھے پہلے تو نہیں دیکھا۔" بچہ بولا، "نہیں ابا جان!"
مرسلہ ...... سلمان امین، ڈی آئی خاں

ڈاکٹر (نوکر سے) "دیکھو دروازے پر کون آیا ہے؟"

نوکر "کوئی مریض ہو گا۔"

ڈاکٹر "معلوم کرو مریض نیا ہے یا پرانا؟"

نوکر "نیا ہو گا۔ پرانا تو کبھی واپس ہی نہیں آیا۔"

مرسلہ ...... احمر فرقان، ملتان۔

پہلا دوست: "میں نے گزشتہ سال ایک ایسی شے بنائی کہ اسے نیشنل آرٹ گیلری میں جگہ دی گئی۔"

دوسرا دوست: "کیا واقعی اسے وہاں لٹکایا گیا تھا؟"

پہلا دوست: "ہاں! اور ایسی جگہ جہاں پر ہر شخص اسے دیکھ سکتا تھا۔"

دوسرا دوست: "بھلا اس پر کیا بنا ہوا تھا؟"

پہلا دوست: "اس پر لکھا تھا یہاں سے بائیں طرف۔"

مرسلہ ثروت عزیز خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔

کلاسیکی موسیقی کے پروگرام میں جیل سے آئے ہوئے کچھ قیدیوں کو دیکھ کر سامعین میں سے ایک صاحب کو بہت تعجب ہوا۔ انہوں نے ایک شخص سے کہا "اب تو ہمارے قیدیوں کو بڑی سہولت ملنے لگی ہے۔"

وہ شخص بولا "سہولت! آپ نے ان قیدیوں سے بھی کچھ پوچھا ہے؟ یہ پروگرام تو ان کی سزا میں شامل ہے!!"

مرسلہ نیرا خان، کراچی۔

دو دوست ایک ایسی مشین پر وزن کرانے پہنچے جس میں سے ایک کارڈ نکلتا ہے اور اس پر وزن کے ساتھ وزن کرانے والے کی خصوصیات لکھی ہوتی ہیں۔ پہلا دوست مشین پر کھڑا ہوا۔ دوسرے دوست نے کارڈ نکالا تو اس پر لکھا تھا۔ "آپ بہت خوش اخلاق اور مہربان ہیں۔ آپکی شخصیت بڑی پر کشش ہے۔ آپ کے دوست آپ سے بہت خوش رہتے ہیں۔"

دوسرے دوست نے پھر ایک بار کارڈ کو پڑھا اور حیرت سے بولا "عجیب مشین ہے۔ وزن تمہارا بتایا اور خصوصیات میری بتا دیں۔"

مرسلہ ...... شمائلہ شہزین، لاہور۔

احمد
کسٹرڈ
ذائقہ ایسا کہ خوب کھائیں
قیمت ایسی کہ روز لے آئیں
AHMED
CUSTARD
POWDER
Vanilla
AHMED
CUSTARD
POWDER
Mango
AHMED
CUSTARD
POWDER
AHMED
CUSTARD
POWDER
ونیلا
مینگو
بنانا
اسٹرابیری
خوب کھائیں روز لائیں!
قدرت نے ذائقہ دیا احمد نے محفوظ کیا

ہیٹ کا جھگڑا

ترجمہ: صائمہ سفیر

کینیا کے جنگل کی ایک تصویری کہانی

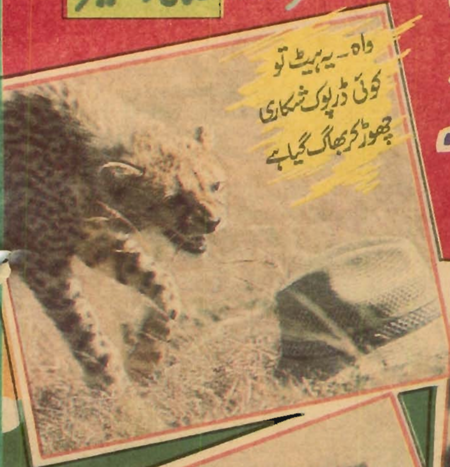

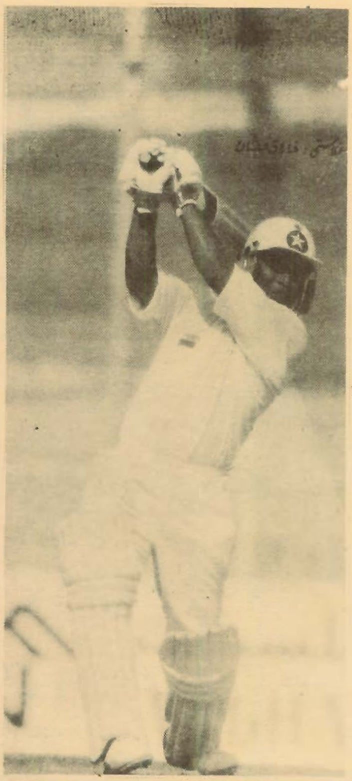

پاکستان سے پیار کریں

آصف مجتبیٰ کی باتیں

ملاقات:۔ سلیم خالق

آصف مجتبیٰ قومی کرکٹ ٹیم کے نائب کپتان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین مڈل آرڈر بیٹسمین اور مفید آف اسپنر بھی ہیں۔ ان کا کرکٹ کیریئر گو زیادہ طویل نہیں ہے لیکن پھر بھی اب تک انہوں نے جتنی کرکٹ کھیلی ہے اپنی عمدہ کارکردگی سے انہوں نے ہرایک کو متاثر کیا ہے۔ آصف میں بیک وقت دفاعی اور جارحانہ دونوں طرح سے بیٹنگ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ آصف ۱۹۸٦ء میں قومی کرکٹ ٹیم میں شامل ہوئے لیکن بوجوہ ٹیم سے جلد ہی باہر ہوگئے۔ پھر وہ اپنی محنت سے دوبارہ ٹیم میں آئے اور اب وہ ٹیم کے نائب کپتان ہیں۔ آصف ایک نہایت سادہ اور با اخلاق انسان ہیں، نماز روزے کے پابند ہیں۔ پاکستان اور زمبابوے کے درمیان کراچی ٹیسٹ جب پاکستان نے جیتا تو تمام پاکستانی کھلاڑی خوشیاں منانے میں مصروف تھے۔میں نے جب آصف کو دیکھنے کے لئے نظر دوڑائی تو وہ مجھے ڈریسنگ روم کے ایک کونے میں نماز پڑھتے ہوئے نظر آئے۔

اس بات سے میں بہت متاثر ہوا۔ آنکھ مچولی کے قارئین بھی آصف کو بہت پسند کرتے ہیں، ان کی باتیں سننا چاہتے ہیں اس لئے میں نے آصف کا یہ انٹرویو ان کی رہائش گاہ پر ریکارڈ کیا۔

سوال: آصف بھائی آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

آصف مجتبیٰ: میں ۶ نومبر ۱۹۶۷ کو روشنیوں کے شہر کراچی میں پیدا ہوا۔

سوال: آپ نے اپنا پہلا ٹیسٹ کس کے خلاف کھیلا؟

آصف مجتبیٰ: میں نے ۱۹۸۶ میں ویسٹ انڈیز کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلا۔

سوال: آپ پاکستانی کرکٹ ٹیم میں کیسے شامل ہوئے؟

آصف مجتبیٰ: پاکستانی ٹیم میں شامل ہونے کا ایک طریقہ کار ہے۔

۱۹۸۴ء سے میں نے اپنے فرسٹ کلاس کیریئر کا آغاز کیا، اور پہلے ہی سیزن میں ۸۰۰ رنز اسکور کر لیا۔ پھر جناب ۱۹۸۵ء میں پاکستان کی B ٹیم کے ساتھ سری لنکا کا دورہ کیا جہاں مجھے محدود مواقع ملے۔ پھر میں نے ڈومیسٹک سیزن میں دوبارہ اچھا اسکور کیا۔ جس کی وجہ سے ۱۹۸۶ء میں مجھے کینیا کا دورہ کرنے والی پاکستان کی B ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ وہاں میری کارکردگی شاندار رہی۔ میری لگاتار عمدہ کارکردگی نے سلیکٹرز کو متوجہ کیا اور انہوں نے مجھے ویسٹ انڈیز کی ٹیم کے خلاف راولپنڈی میں سائیڈ میچ میں کھیلنے کا موقع دیا جہاں میں نے ۶۴ رنز اسکور کئے۔ اس دوران حادثاتی طور پر سلیم ملک کا بازو ٹوٹ گیا۔ جس کی وجہ سے مڈل آرڈر بیٹسمین کی جگہ خالی ہو گئی، مجھے پھر سائیڈ میچ میں موقع ملا۔ ساہیوال میں جہاں میں نے ۷۰ ناٹ آؤٹ بنائے۔ اسی پرفارمنس کی وجہ سے مجھے ٹیسٹ کھیلنے کا موقع ملا۔

سوال: اس ٹیسٹ کے بعد آپ شاید ٹیم سے باہر ہو گئے تھے؟

آصف مجتبیٰ: جی ہاں یہاں میں اچھا نہیں کھیلا جس کی وجہ سے میں بعد میں اِن اور آؤٹ کا شکار رہا۔

سوال: ٹیم میں مستقل جگہ بنانے میں آپ کیسے کامیاب ہوئے؟

آصف مجتبیٰ: سخت محنت اور لوگوں کی دعاؤں کی وجہ سے میں دوبارہ ٹیم میں آنے میں کامیاب ہوا۔ دراصل میں جب ٹیم سے باہر ہوا تو میں نے خوب مشق کی اور بیٹنگ میں اپنی کمزوریوں کو دور کیا۔ اسی دوران میں فرسٹ کلاس کرکٹ میں بیٹنگ کر کے بیٹنگ میں اپنی کمزوریوں کو دور کرتا رہا اور پھر ۱۹۹۲ء میں مجھے دوبارہ ٹیم میں کھیلنے کا موقع ملا۔ اور میں برملا یہ اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے ٹیم میں دوبارہ واپس لانے والے جاوید بھائی (میانداد) ہیں، انہوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ میرے مسائل پر گفتگو کی۔ مجھے علیحدہ بیٹنگ پریکٹس کرائی تھی۔ وہ بہت عظیم کھلاڑی اور انسان ہیں۔

سوال: آپ نے اپنے کیریئر کے ابتدائی دنوں میں آسٹریلیا میں ایک شاندار اننگ کھیلی تھی ایک ایسے وقت میں جب قریب قریب پاکستان ہار چکا تھا۔ اس اننگ کے بارے میں کچھ بتایئے؟

آصف مجتبیٰ: جی ہاں، وہ میری زندگی کا یادگار ترین میچ ہے، اس میچ میں آسٹریلیا نے پہلے بیٹنگ کی اور ۲۷۳ رنز بنائے، جب ہماری باری آئی تو قاسم عمر نے بہترین اسٹارٹ دیا، تو ہم نے سوچا کہ آرام سے میچ جیت جائیں گے، لیکن پھر ایک کے بعد ایک آؤٹ ہونے لگے اور ۱۲۹ پر چھ بہترین کھلاڑی آؤٹ ہو گئے۔ میں آٹھویں نمبر پر بیٹنگ کے لئے آیا۔ منظور الٰہی ساتھ تھے۔ ہم ایک ایک رن لیتے رہے۔ پھر منظور الٰہی آؤٹ ہو گئے تو میں نے چوکے وغیرہ لگائے اسی طرح آخری اوور میں ۹ رنز چاہئیں تھے جو میں نے ایک گیند پہلے ہی بنا دیئے۔

سوال: آپ اب تک کتنے ممالک کا دورہ کر چکے ہیں اور سہولیات اور تماشائیوں کے لحاظ سے کونسا ملک پسند آیا؟

آصف مجتبیٰ: میں نے اب تک، جتنے بھی ممالک میں کرکٹ کھیلی جاتی ہے، تمام کا دورہ کیا ہے اور مجھے سب سے زیادہ آسٹریلیا پسند آیا، وہاں کا کراؤڈ بہت اچھا ہے ہر بال پر داد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وکٹیں اور دیگر سہولیات کے لحاظ سے بھی آسٹریلیا بہترین ہے۔

سوال: تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے؟

آصف مجتبیٰ: جی میں نے گریجویشن کی ہے۔

سوال: پڑھائی اور کھیل دو الگ الگ چیزیں ہیں آپ نے دونوں میں توازن کیسے قائم رکھا ہوا تھا؟

آصف مجتبیٰ: بس جی دوست اچھے تھے، بہت مدد کرتے تھے جس کی وجہ سے کبھی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

سوال: بچپن میں کرکٹ کھیلنے پر کبھی گھر والوں کی مار تو نہیں پڑی؟

آصف مجتبیٰ: جی نہیں، میں ہر کام وقت پر کرنے کا عادی ہوں اس لئے مجھے کبھی بھی مار تو کیا ڈانٹ بھی نہیں پڑی۔

سوال: آپ کس طریقے سے کھیلنا پسند کرتے ہیں سلو یا فاسٹ؟

آصف مجتبیٰ: میں موقع کے لحاظ سے کھیلنا پسند کرتا ہوں جب ٹیم کو تیز کھیلنے کی ضرورت ہو تو تیز جب آہستہ تو پھر آہستہ کھیلتا ہوں۔

سوال: آپ کے خیال میں پاکستان میں کرکٹ کو کن انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے؟

آصف مجتبیٰ: جونیئر کرکٹ یعنی انڈر ۱۴، ۱۶، ۱۹ کو مزید اچھا کرنا چاہئے۔ سارے پاکستان سے کھلاڑی لینے چاہئیں۔ پھر ان کی ٹیمیں بن کر آپس میں کھلانا چاہئے اس سے کرکٹ مزید بہتر ہوگی۔ اسکول اور کالج کی کرکٹ کا معیار بھی آج سے ۱۰، ۱۵ سال پہلے کی طرح بہترین بنانا ہوگا، اس سے نیا ٹیلنٹ آئے گا۔ ہم جب نوجوانوں کو شروع ہی سے اچھی تربیت دیں گے تب ہی یہ آگے بڑھیں گے۔

سوال: کرکٹ ٹیم میں آپ کے بہترین دوست؟

آصف مجتبیٰ: باسط علی، انضمام الحق اور راشد لطیف۔

سوال: جب آپ جلدی آؤٹ ہو جاتے ہیں تو کیا سوچتے ہیں؟

آصف مجتبیٰ: کچھ نہیں ریلیکس ہوتا ہوں، کیوں کہ یہ تو کرکٹ ہے، اگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر سوچنے بیٹھ گئے تو آگے کیا کریں گے۔

سوال: کرکٹ کے علاوہ کونسا کھیل پسند ہے؟

آصف مجتبیٰ: ہاکی اور ٹیبل ٹینس۔

سوال: آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش؟

آصف مجتبیٰ: ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے (مسکراتے ہوئے) ویسے میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پاکستان کے لئے زیادہ سے زیادہ کھیلنا اور اچھی کارکردگی دکھانا ہے۔

سوال: کھانے میں سب سے زیادہ کیا چیز پسند

سوال: پاکستان میں آپ کو کونسا گراؤنڈ پسند آیا؟

آصف مجتبیٰ: قذافی اسٹیڈیم بہت اچھا گراؤنڈ ہے۔

سوال: کرکٹ میں آپ کے آئیڈیل کھلاڑی؟

آصف مجتبیٰ: جاوید میانداد ...... ان کی بیٹنگ مجھے بہت پسند ہے اور میں سمجھتا ہوں ایسے کھلاڑی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

سوال: ورلڈ کپ کے بعد سے قومی کرکٹ ٹیم کی فتوحات میں خاصی کمی آئی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

آصف مجتبیٰ: کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ اپ اینڈ ڈاؤن تو ہوتا ہی ہے۔ ہار جیت تو کھیل کا ایک حصہ ہے۔

ہے؟

آصف مجتبیٰ: بس جی، جو چیز گھر میں پکی ہوتی ہے اللہ کا شکر ادا کر کے کھالیتا ہوں۔

سوال: کرکٹ میں آپ کی کوچنگ کس نے کی؟

آصف مجتبیٰ: شروع میں میرے والد صاحب اور اے۔ کے۔ مجید صاحب اور بعد میں حنیف محمد، جاوید میانداد اور ظہیر عباس نے کوچنگ کی۔

سوال: کیا آپ کے خیال میں ایک لیفٹ اور ایک رائٹ ہینڈ بیٹسمین کے کامبی نیشن سے میچ میں کوئی خاص فرق پڑتا ہے؟

آصف مجتبیٰ: جی ہاں بہت فرق پڑتا ہے۔ ایک سیدھے ہاتھ اور ایک الٹے ہاتھ کے بیٹسمین کے کامبی نیشن سے بالر بہت ڈسٹرب ہوتا ہے۔ اسے بار بار بالنگ کی لائین بدلنی پڑتی ہے۔ جبکہ اس سے فیلڈنگ پر بھی کافی اثر پڑتا ہے۔

سوال: آپ کو چوکے لگانا پسند ہے یا چھکے اڑانا؟

آصف مجتبیٰ: مجھے صرف اسکور کرنا پسند ہے چاہے وہ چوکے سے ہو، یا چھکے سے ہو یا ایک رن سے۔

سوال: کس قسم کی بال کو کھیلنے میں مزا آتا ہے؟

آصف مجتبیٰ: ہر قسم کی بولنگ پر ...... کیونکہ جب بیٹسمین فارم میں ہوتا ہے تو ہر قسم کی بولنگ آرام سے کھیل لیتا ہے۔ لیکن جب وہ فارم میں نہ ہو تو بچے کی گیند پر بھی آؤٹ ہو جاتا ہے۔

سوال: قومی کرکٹ ٹیم میں آپ کے علاوہ لیفٹ ہینڈ سے بیٹنگ کرنے والے کھلاڑی عامر سہیل، سعید انور اور وسیم اکرم بھی موجود ہیں۔ آپ کو ان میں سے کس کی بیٹنگ پسند ہے؟

آصف مجتبیٰ: سب ہی اچھی بیٹنگ کرتے ہیں، عامر سہیل ذرا تجربہ کار ہیں کافی کھیلتے رہے ہیں۔ سعید انور ایک باصلاحیت اوپنر ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹنگ کافی بہتر کر لی ہے۔ جبکہ وسیم اکرم کی بیٹنگ آخری اوورز کے لئے کافی فائدے مند ثابت ہوتی ہے۔

سوال: آپ کا بیٹنگ میں کوئی مخصوص نمبر نہیں ہے۔ کبھی آپ بطور اوپنر کھیلنے آتے ہیں کبھی تیسرے اور کبھی چھٹے نمبر پر تو کیا اس صورتحال سے آپ کی کارکردگی پر کوئی خاص اثر پڑتا ہے؟

آصف مجتبیٰ: میرے ذہن میں یہ بات ہے کہ اگر آپ میں ٹیلنٹ ہے تو آپ ۳ یا ۶ کسی بھی نمبر پر جائیں اگر اللہ کو عزت دینی ہوگی تو وہ مل کر رہے گی۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۷ء میں پرتھ آسٹریلیا میں، میں نے ۸ویں نمبر پر جا کر ۶۰ رنز کئے تھے اور میچ جتایا تھا۔

سوال: اچھا آصف بھائی، آنکھ مچولی کے قارئین کے لئے آپ کیا پیغام دیں گے؟

آصف مجتبیٰ: پیغام یہ ہے کہ ہر کام محنت سے کریں اور کبھی دل چھوٹا نہ کریں یعنی مایوس نہ ہوں اور پاکستان سے پیار کریں۔

ستاروں کے پُراسرار ذرّات

فیصل احمد شجراہ

شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ ہمارے جسم پر ہر وقت بے شمار ذرّوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ سائنس دانوں نے یہ بات معلوم کی ہے کہ یہ ذرّے ستاروں سے جنم لیتے ہیں۔ یہ ذرّے ہمیں نظر نہیں آتے لیکن ہر وقت، ہر لمحے گرتے رہتے ہیں۔ ان ذرّوں کی وجہ سے علمِ فلکیات میں ایک نئی شاخ کا اضافہ ہوا ہے۔ سائنس دانوں نے ان ذرّوں کو "نیوٹرینو" کا نام دیا ہے۔ ان ذرّوں کا تعلق ایٹم کے مرکزی حصّے سے ہے اس لئے شروع میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ زمین پر جو ایٹمی تجربات ہوتے رہتے ہیں ان کی وجہ سے یہ ذرّات پیدا ہوتے ہیں لیکن بعد میں سائنس دانوں نے بڑی کوششوں کے بعد یہ معلوم کیا کہ یہ ذرّات زمین سے نہیں بلکہ آسمان سے آتے ہیں۔ ستاروں میں

بھی ایٹمی کشش موجود ہوتی ہے اس لئے یہ ممکن ہے کہ ستارے وہ ذرّات خارج کرتے ہوں۔

۱۹۳۱ء میں ایک سائنس دان پولی کو مختلف شعاعوں پر تجربہ کر کے یہ شک ہوا کہ شعاعوں کی کچھ طاقت ضائع ہو جاتی ہے جو کسی ذریعے کی وجہ سے اُڑ جاتی ہے۔ یہ نیوٹرینو کے بارے میں پہلا تصوّر تھا۔ اس تصوّر کو یقین میں بدل دینے کے لئے سائنس دانوں کو پورے بتّیس سال لگ گئے۔

۱۹۵۳ء میں دو امریکی سائنس دانوں نے اس بارے میں تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سائنس دان جانتے تھے کہ نیوٹرینو ذرّات ہمیشہ ہائیڈروجن ایٹم سے ٹکرائیں گے۔ اس لئے ایٹمی ری ایکٹر کے قریب ہی ایک پائپ کی ٹنکی بنائی گئی تاکہ ہائیڈروجن ایٹموں کی قلّت محسوس نہ ہو۔ اس ٹنکی میں سے ہر سیکنڈ میں کروڑوں کی تعداد میں نیوٹرینو گزر رہے تھے لیکن ان میں سے ایک بھی ذرّہ ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا اس بات سے یہ ثبوت مل گیا کہ نیوٹرینو واقعی موجود ہیں۔

اب ان ذرّات کے بارے میں جان لیجئے .... نیوٹرینو ذرّات کی مقدار یا مادہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور نہ ہی ان پر کوئی چارج ہوتی ہے۔ اس لئے سائنس دانوں نے ان کو نیوٹرینو کا نام دیا ہے۔

ان ذرّوں کی عجیب و غریب خصوصیات کے باعث سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ذرّات اربوں کی تعداد میں ہمارے جسموں سے گزر جاتے ہیں لیکن ان میں سے فقط ایک ذرّہ بھی ہمارے جسم میں جذب نہیں ہوتا یہ ذرّات ساری کائنات میں سفر کر سکتے ہیں لیکن کسی بھی جسم کا حصّہ نہیں بن سکتے ہیں۔ قدرت نے ان ذرّوں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ یہ ہر جسم میں سے با آسانی گزر جاتے ہیں اس لئے سائنس دان یہ سمجھتے ہیں کہ ان ذرّات کے وسیلے سے ہم مختلف اشیا کا جائزہ لے سکتے ہیں اور ستاروں کے بارے میں کائنات کے رازوں کو فاش کر سکتے ہیں۔

متوازن غذا

صحت کی ضامن

ماہرینِ غذائیت غذاؤں کو درج ذیل چار حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں

- سبزیاں، پھل اور فروٹ
- اناج، چاول، گندم اور دالیں وغیرہ
- دُودھ، مکھن، گھی، پنیر اور دہی وغیرہ
- گوشت، انڈے، مُرغی اور مچھلی وغیرہ

اگر آپ نے دن بھر کی غذاؤں میں ان چاروں حصّوں سے کچھ نہ کچھ چکھ لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے متوازن غذا کھائی اور آپ کے جسم کو مطلوبہ توانائی میسر آگئی۔

اشتہار برائے ترغیب حفظانِ صحت و تندرستئ اطفال۔ آنکھ مچولی

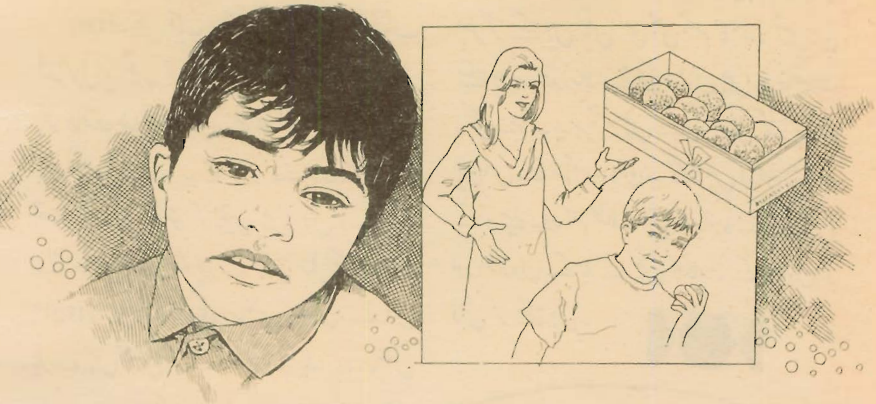

لڈو چرائے

محمد اظہار الحق

چھٹی کا دن تھا چنّوں میاں نے
ابّا سے کہہ کر لڈو منگائے
برفی بھی آئی لڈو بھی آئے
سب نے مزے سے مل کر اُڑائے!
باقی بچے جو امّی نے لے کر!
کمرے کے اندر فوراً چھپائے
چنّوں نے سوچا کمرے میں جائیں!
چُپکے سے جا کر لڈو چُرائیں
برفی بھی ہوگی وہ بھی اڑائیں
چھپ کر مزے سے لڈو بھی کھائیں
کچھ سوچ کر پھر لڈو نکالے
جیبوں میں ٹھونسے کچھ منہ میں ڈالے
اوپر سے لیکن امّی بھی آئیں
چنّوں کو پھر خوب آنکھیں دکھائیں
جھڑکیں بھی کھائیں چانٹے بھی کھائے
چنّوں میاں نے لڈو چُرائے

تحریر و ترتیب: سلیم خالق

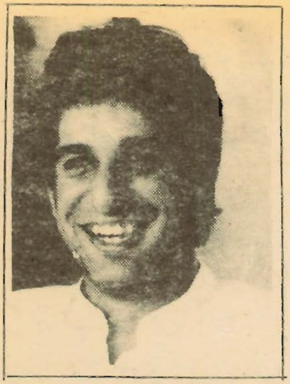

آمنے سامنے

اسٹار کھلاڑیوں سے سوال جواب کا دلچسپ سلسلہ

وسیم اکرم کا شمار دنیائے کرکٹ کے ایک بہترین فاسٹ بولر کے طور پر ہوتا ہے۔ انہوں نے اب تک ملک و قوم کے لئے بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ توقع کے عین مطابق ان کے لئے لاتعداد خطوط آئے بلکہ آخری تاریخ گزرنے کے بعد بھی دلچسپ خطوط آتے رہے جس کی وجہ سے وسیم اکرم کو اگست کے بجائے اس ماہ "آمنے سامنے" کا مہمان بنایا گیا، وسیم اکرم نے بچوں کے لاتعداد خطوط دیکھ کر پہلے تو کانوں کو ہاتھ لگایا کہ وہ اتنے خطوط کے جواب نہیں دے سکتے اور پھر ان بچوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے ان کے نام پیارے پیارے خوبصورت سے خطوط لکھ کر بھیجے۔ وسیم اکرم نے منتخب خطوط کے جواب دینے کے علاوہ تین بہترین انعامی سوالوں کا بھی انتخاب کیا

انعامی سوال

سوال: وسیم بھائی میری ایک شدید خواہش ہے اور وہ خواہش آپ کو ہی پوری کرنی ہے خواہش یہ ہے کہ جس طرح آپ نے سری کانت کو باؤنسر مار کر اس کا جبڑا توڑ دیا تھا۔ اس سے بھی خطرناک باؤنسر مار کر آپ ویسٹ انڈیز کے آل راؤنڈر فلپ سیمنز کا منہ توڑ دیں۔ کیا آپ میری یہ خواہش پوری کریں گے؟ (ضمیر احمد فردوسی، ڈیرہ اسماعیل خان)

وسیم اکرم! کیوں بھائی ایسی بھی کیا دشمنی ہوگئی فلپ سیمنز سے جو اس بیچارے کا اتنا برا حشر کرانا چاہتے ہیں۔ کہیں اس نے آپ کو آٹو گراف دینے سے تو منع نہیں کر دیا تھا

انعامی سوال

سوال: وسیم بھائی اگر آپ کو انٹرنیشنل کرکٹ کا کوئی بھی قانون ختم یا تبدیل کرنے کا اختیار دیا جائے تو آپ کونسا قانون ختم یا تبدیل کریں گے
(محمد محمود ظفر قیاسی، ملتان)

وسیم اکرم: ویسے تو ایسا ہو گا نہیں لیکن خواب دیکھنے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے اس لئے اگر ایسا ہوا تو میں ایک اوور میں ایک باؤنسر والا قانون تبدیل کرا دوں گا۔

انعامی سوال

سوال: وسیم صاحب میں ایک عظیم فاسٹ بولر ہوں اور اب تک تقریباً ۳۰۰ وکٹیں لے چکا ہوں۔ انشاءاللہ جلد ہی کپیل دیو کا ریکارڈ توڑ دوں گا۔ لیکن آپ یہ دیکھیں کہ اتنے عظیم کرکٹر کو اب تک ٹیسٹ کرکٹ نہیں کھلائی گئی، اور میرے یہ کارنامے صرف گھر کی چھت تک کی کرکٹ تک محدود ہو گئے ہیں میرے لئے کچھ کیجئے نا (احتشام ہاشمی، کراچی)

وسیم اکرم: چچ چچ، افسوس، اتنے عظیم بولر کا یہ حال۔ آپ کے لئے تو کچھ کرنا پڑے گا۔ ویسے آپ کے یہ ریکارڈ دیکھ کر میں آپ سے بولنگ سیکھنا چاہتا ہوں۔

سوال: آپ کو کونسی کرکٹ پسند ہے ٹیسٹ یا ون ڈے؟ (عدنان رشید، کراچی۔)

وسیم اکرم: اس سوال کے جواب میں، آپ ہی کے رسالے میں انضمام کے انٹرویو میں لکھا ہوا ایک شعر دہرا رہا ہوں۔

ون ڈے کرکٹ میں بچو
ایک یہ خوبی ہوتی ہے
جلد نتیجہ آتا ہے
اور دلچسپ بھی ہوتی ہے

ویسے ٹیسٹ کرکٹ کو بھی میں بہت پسند کرتا ہوں کیونکہ اصل کرکٹ، ٹیسٹ کرکٹ ہی ہوتی ہے۔

سوال: وسیم بھائی اگر آپ کو ایک اور زندگی نئے سرے سے گزارنے کی اجازت دی جائے تو آپ کیا بننا چاہیں گے (نورین فاطمہ چوہان، بہاولپور)

وسیم اکرم: صرف اور صرف کرکٹر وسیم اکرم۔

سوال: وسیم بھائی سری کانت کو اب تک خوفناک خواب دکھائی دیتے ہیں کہیں آپ کی وجہ سے تو نہیں؟ (علی اصغر ساہیوال)

وسیم اکرم: بھائی اب یہ سری کانت کا قصہ ختم بھی کریں۔ ویسے پاکستان میں رہ کر بھارت کے ایک شخص کے خواب معلوم کرنے کا طریقہ مجھے بھی بتا دیجئے۔

سوال: وسیم بھائی آپکی زندگی میں کبھی ایسا لمحہ آیا ہے جب آپ نے یہ سوچا ہو کہ کاش میں کرکٹر کے بجائے ایک عام انسان ہوتا؟ (افشاں بشیر کراچی)

وسیم اکرم: جب میرے اپنے دوستوں نے میری کپتانی کے خلاف بغاوت کی تھی تب میں بڑا دل برداشتہ ہوا تھا۔

سوال: آپ اور وقار بھائی سوئنگ بالنگ کرانے کے شہنشاہ ہیں۔ سچ سچ بتایئے کرکٹ کی دنیا کا وہ کونسا بیٹسمین ہے جس کے سامنے آپ کی سوئنگ بولنگ بھی آپ کو چکمہ دے گئی ہو؟ (صائمہ دلدار، جھمرہ سٹی، حماد سرور بہاولپور رفعیہ فاروقی،

کراچی۔ ایم اے قریشی، اسلام آباد۔ آصف نور کراچی۔ محمد عدنان، کوہاٹ۔ نعمان ہاشمی، کراچی۔)

وسیم اکرم: اللہ کا شکر ہے آج تک ایسا بہت کم ہی ہوا ہے۔ میرے ریکارڈ اس کے گواہ ہیں ویسے کچھ بیٹسمین ہیں جن کو آؤٹ کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

سوال: میں بھی آپ کی طرح ایک اچھا فاسٹ بولر بننا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے مجھے کیا کرنا چاہئے؟ (نوید الرحمان، کراچی)

وسیم اکرم: اس کے لئے آپ کو محنت کرنی چاہئے۔ خوب مشق کیجئے اچھے بولروں سے بولنگ کرنا سیکھیں گے تو ضرور اچھے بولر بنیں گے۔ اور ہاں پڑھائی پر زیادہ توجہ دیجئے۔ پھر جو وقت بچے اس میں کرکٹ کھیلئے۔

سوال: وسیم بھائی کیا وجہ ہے کہ جب بھی آپ بیٹنگ کرنے کے لئے آتے ہیں جلدی میں ہوتے ہیں دو چار الٹے سیدھے شاٹ مار کر آؤٹ ہو جاتے ہیں............ کہیں کسی نجومی نے تو آپ کو نہیں کہا ہے کہ زیادہ دیر بیٹنگ مت کرنا؟ (حافظ حذیفہ صدیق قادری، ملتان)

وسیم اکرم: ارے یہ بات آپ کو کیسے معلوم ہوئی۔ کہیں آپ بھی کوئی نجومی تو نہیں۔

سوال: وسیم بھائی جب آپ کپتان تھے تو میچ کے دوران ڈپریشن کا شکار ہو جاتے تھے بہت جلد غصے میں آجاتے تھے اس کی کیا وجہ تھی؟ (تنویر حسین، کراچی۔ شمس، کراچی)

وسیم اکرم: وجہ کوئی خاص نہیں ہیں جب کوئی بندہ غلطی کرے تو غصہ تو آئے گا ہی چاہے کپتان ہو یا نہ ہو۔

سوال: آپ نے انگریزوں کو شاندار باؤنسر مار کر ان کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے تو انہوں نے باؤنسر پر فی اوور ایک باؤنسر کی پابندی لگا دی۔ اب آپ کی شاندار یارکرز نے ان کا ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔ کہیں وہ اب یارکرز پر بھی پابندی نہ لگا دیں۔ کیوں آپ کا کیا خیال ہے؟ (محمد آصف ذکریا، کراچی)

وسیم آپ فکر نہ کریں ایک اوور ایک باؤنسر کے قانون سے بھی ہم پر زیادہ اثر نہیں پڑا۔ اور ہم ویسی ہی بولنگ کراتے رہے اگر ایسا ہوا تب بھی انشا اللہ ہم کامیاب رہیں گے۔

سوال: وسیم بھائی یہ آپ کو کس کی نظر لگ گئی ہے پہلے آپ جب بیٹنگ کرنے آتے تھے تو جب تک دو، چار چوکے چھکے نہیں مار لیتے تھے آؤٹ نہیں ہوتے تھے لیکن اب آپ صرف بولر بن کر رہ گئے ہیں۔ جبکہ ہم آپ کو عمران خان کی طرح ایک عظیم آل راؤنڈر کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہیے آئندہ کے کیا ارادے ہیں؟ (محمد عدنان عبد العزیز، کراچی۔ رانا ندیم، ساہیوال۔ دلنواز، بدین)

وسیم: ارادے تو بہت نیک ہیں بس آپ لوگ دعا کیجئے تو بیٹنگ پھر سے اچھی ہو جائے گی۔

سوال: وسیم بھائی یہ آخر سری کانت سے آپ کی کیا دشمنی تھی جو آپ نے خطرناک باؤنسر مار کر اس کا جبڑا توڑ دیا تھا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کی اس ایک بال کی وجہ سے اس بیچارے کا کیریئر ختم ہو گیا؟ (قادر خان طارق، ڈیرہ غازی خان، رانا محمد شاہد بورے والا)

وسیم: یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ میری باؤنسر کی وجہ سے اس کا کیریئر ختم ہوا ہے۔ وہ میرا اچھا دوست ہے اور باؤنسر بھی میں نے جان بوجھ کر اسے نہیں مارا تھا۔

سوال: اگر کسی ٹیم میں ٹیم ورک نہ ہو تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ (رضوان ظہیر خان زادہ، کراچی)

وسیم اکرم: بہت فرق پڑتا ہے۔ جب تک ٹیم متحد ہو کر نہیں کھیلے گی وہ میچ نہیں جیت سکتی۔

سوال: ہمارے ملک کے لاکھوں بچوں کے دل میں آپ جیسی خوبصورت بولنگ کرنے کی خواہش ہے۔ آپ اپنا تجربہ اور کھیل کا گر ان بچوں میں کس طرح منتقل کرنا چاہیں گے؟ (سیدہ کاشفہ، کراچی)

وسیم اکرم: ابھی تو میں خود سیکھ رہا ہوں کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ کریں گے۔ ویسے ذہن میں کچھ منصوبے موجود ہیں۔

سوال: وسیم بھائی آپ اور انکل جاوید میانداد ہمارے پسندیدہ کھلاڑی ہیں لیکن آپ دونوں کے آپس میں تعلقات ٹھیک نہیں ہیں ہمیں آپ دونوں عزیز ہیں اس لئے آپ اپنے اختلافات ختم کر کے پھر سے ایک ہو جائیں؟ (عمران علی رضا، سوہاوہ سٹی، جہلم)

وسیم اکرم: جس طرح آپ کے وہ انکل ہیں اس طرح میرے بھی وہ بڑے بھائی ہیں اس لئے ہمارے درمیان اب کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

سوال: دنیائے کرکٹ کے کس بیٹسمین کو آؤٹ کر کے آپ کو خوشی ہوتی ہے؟ (قرۃ العین فخر، ہری پور ہزارہ، امجد اقبال، غریب وال)

وسیم اکرم: مخالف ٹیم کے ہر بیٹسمین کو آؤٹ کر کے میں خوشی محسوس کرتا ہوں

سوال: یہ بال ٹیمپرنگ کا کیا چکر ہے؟ (محمد توفیق خان، کوہاٹ۔ منزہ ریاض، جیکب آباد۔ شرجیل خالد، عبد الوہاب، رحیم یار خان۔ افشاں بشیر کراچی۔ عامر، کوہاٹ صائمہ، دادیہ، کراچی۔ حنا سرور، بہاولپور۔ ندیم حبیب، نوید شہزاد، کراچی۔ آغا ظفر احمد، کراچی۔ قرۃ العین فاطمہ، پشاور۔)

جواب: دراصل گورے یہ نہیں چاہتے کہ کوئی دوسرا ان سے کسی بھی کام میں آگے آئے۔ اس لئے جب ہماری ٹیم نے کامیابیاں حاصل کیں تو گوروں نے اس قسم کے شوشے چھوڑنے شروع کئے جن میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ہمارا فن بال ٹیمپر کرنا نہیں ہے بلکہ ہم ریورس سوئنگ کرتے ہیں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے

فرزانہ روحی

"اب بس۔ بہت لکھ لیا آج۔"

اینڈریو نے لکھتے لکھتے قلم رکھ دیا۔

"ابھی اور لکھو بیٹے۔ تمہاری لکھائی بہت خراب ہے۔ بالکل دوسری جماعت کے بچے کی طرح۔ ابھی تمہیں مزید مشق کی ضرورت ہے۔ خراب لکھائی کی وجہ سے ہی امتحان میں تمہارے نمبر کٹ جاتے ہیں۔"

اینڈریو کی امی نے دودھ کا گلاس اسے دیتے ہوئے کہا۔ مگر پھر بھی اینڈریو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے کاپی بیگ میں ڈالی اور بیگ وہیں چھوڑ کر گیند نکال لایا۔

"اینڈی! تم باہر نہیں جاؤ گے۔ یہ کھیلنے کا وقت نہیں ہے۔" امی نے اسے یاد دلایا تو وہ بولا۔

"مجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے۔ دل چاہ رہا ہے اس لئے تھوڑا سا کھیل رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کسی ماہر فٹ بالر کی طرح گیند کو کک لگا کر ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور پھر ہوا میں اچھال کر سر سے ایک جھٹکا دیا۔ گیند اس کے قریب آنے کی بجائے شوکیس پر رکھے گلدان سے ٹکرائی تو کمرے میں ایک چھناکا سا ہوا۔

"کیا ہوا۔ کیا گرا؟" امی کی آواز کمرے کے باہر سے آرہی تھی۔

"بھائی نے گلدان توڑ دیا۔" اینڈریو سے چھوٹے بھائی ڈیوڈ نے امی کو اطلاع فراہم کی۔ اسی اثنا میں امی کمرے میں آچکی تھیں۔

"اوہ اینڈی! تم نے کمرے کو فٹ بال گراؤنڈ بنا دیا ہے۔ چلو رکھو اسے۔" امی نے فٹ بال اس کے ہاتھوں سے لے کر اسٹور روم میں ڈال دیا۔"

"آرام سے ایک جگہ بیٹھ جاؤ۔ ورنہ پھر گلدان کی کرچیاں چبھو لو گے۔" امی شیشے کے ٹکڑے ایک طرف کرنے لگیں۔

خوبصورت گلدان کے ٹوٹنے کا اسے بھی افسوس ہو رہا تھا۔ گلدان کے ٹوٹ جانے سے وہ

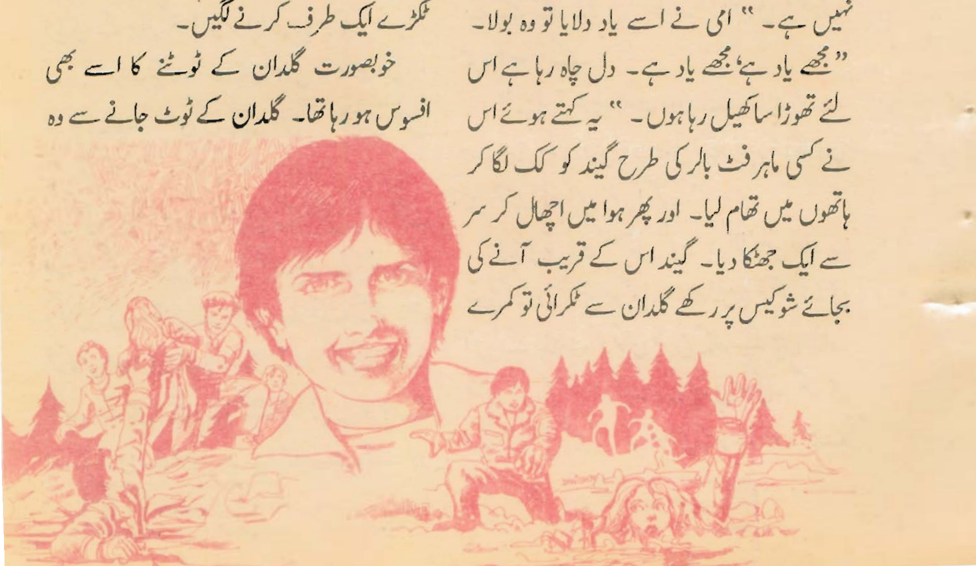

جگہ اب خالی خالی سی لگ رہی تھی اور شوکیس کے دوسرے کونے پر رکھا ہوا گلدان اب اکیلا ہو گیا تھا۔ اینڈریو کا دل چاہا کہ فٹ بال اسٹور سے نکال کر دوبارہ کھیلنا شروع کر دے مگر اس نے سوچا کہ اس طرح دوسرا گلدان کیا شوکیس کا شیشہ بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی آن کر دیا۔ اینڈریو کا پسندیدہ پروگرام ریسکیو ۹۹۹ آ رہا تھا۔ وہ پروگرام اسے اس لئے پسند تھا کہ اس میں جرأت و ہمت کی کہانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ اور مصیبت زدہ لوگوں کی فوری مدد کی جاتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھی ریسکیو ۹۹۹ کے کارکنوں کی طرح بن جائے۔ اور مشکل حالات میں مصیبتوں سے لڑ کر لوگوں کی مدد کرے۔ ایک مرتبہ اس نے ڈیڈی سے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ ابھی بہت چھوٹا ہے جب ان کے جتنا ہو جائے تب اس کی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ اکثر وہ ڈیڈی کے برابر کھڑا ہو کر اپنا قد ناپا کرتا۔

"صرف ایک بالشت چھوٹا ہوں۔ بہت جلد بڑا ہو جاؤں گا۔" اس کی باتیں سن کر ڈیڈی ہنس پڑتے۔

ایک مرتبہ جب آسٹریلیا کے جنگل میں آگ لگ گئی تھی۔ تو ٹیلی ویژن پر آگ بجھانے کی کارروائی دکھائی گئی۔ جس میں اس نے ایک ننھے منے خرگوش اور کینگرو کو دوڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ آگ کے لال نیلے پیلے شعلے جھاڑیوں کو جلاتے ہوئے تیزی سے ان کی جانب لپک رہے تھے۔ اور وہ جانور برق رفتاری سے آگ کی مخالف سمت بھاگ رہے تھے۔ اس وقت اس کا دل چاہا کہ اڑتا ہوا ولنگٹن سے آسٹریلیا پہنچ کر خرگوش کو اپنی گود میں چھپالے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ رہ رہ کر اسے خرگوش اور کینگرو کا خیال آتا تھا۔ ٹیلی ویژن پر جب کینگرو کی واضح تصویر دکھائی دی تو اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے کو اینڈریو نے بہت گہرائی سے محسوس کیا لیکن افسوس! وہ ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ آگ دوسرے دن بھی نہیں بجھائی جا سکی تھی۔ بے شمار جانور جل کر مر گئے تھے۔ اب بھی آگ کے بجھنے کے امکانات نہیں تھے۔

اینڈریو نے ڈیڈی سے پوچھا۔

"کیا میں ایک دن میں آسٹریلیا پہنچ سکتا ہوں؟" زخمی جانوروں اور پرندوں کی دیکھ بھال کے لئے۔ آگ سے خرگوش، کینگرو اور زیبرا کے ننھے ننھے بچے......" اتنا کہہ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بیٹے آسٹریلیا بہت دور ہے۔ خدانہ کرے جب یہاں کبھی ایسی بات ہوئی تو پھر ہم رضا کاروں میں تمہارا نام بھی دیں گے۔"

ڈیڈی کی بات معقول تھی۔ ایسا تو ممکن تھا۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ ڈیڈی اس کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ اور ضرور اس کی آرزو ایک دن پوری ہوگی۔ مگر ممی اب بھی کہتی تھیں کہ تم ابھی چھوٹے ہو۔ بڑے

ہو جاؤ گے تو کارنامے انجام دینا، بچوں کو صرف پڑھنا لکھنا اور کھیلنا کودنا چاہئے۔"

اس دن اینڈریو اپنے دوستوں کے ساتھ جھیل کے قریب فٹ بال کھیل رہا تھا۔ جب ڈیوڈ نے بال اس کی جانب پھینکی تو اینڈریو نے زور دار کک لگائی۔ اس کے ساتھ ہی فٹ بال ہواؤں کے دوش پر لہراتا ہوا کہیں دور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ایک لڑکا بال پکڑنے دوڑا۔ جب تک وہ ایک دوسرے پر برف کے گولے بنا بنا کر پھینکنے لگے۔ برف میں کھیلتے ہوئے انہیں بڑا مزہ آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد گیند کی تلاش میں جانے والا لڑکا واپس آیا اور بولا۔ گیند کہیں برف میں گم ہو گئی۔ جس نے شارٹ لگائی ہے وہی تلاش کرے۔لہٰذا اینڈریو فٹ بال کی تلاش میں برف کے پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ فٹ بال کا ملنا مشکل لگ رہا تھا۔ کیونکہ سفید برف میں پڑا ہوا فٹ بال بھی برف کا حصہ لگ رہا ہو گا۔ فٹ بال جھیل میں نہ گر گئی ہو؟ یہ سوچ کر وہ جھیل کے کنارے اتر گیا۔ سرد سرد ہوائیں جب سائیں سائیں کرتی ہوئی اسکے کانوں کے قریب سے گزریں تو اینڈریو کو ایک آواز سنائی دی۔ بہت آہستہ سے کوئی بلا رہا تھا۔

"ہیلپ می۔ (میری مدد کرو) سیو می" (مجھے بچاؤ)۔"

وہ ایک بچی تھی جو برفانی جھیل میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ جس قدر نکلنے کی کوشش کرتی مزید اندر جانے لگتی۔

اینڈریو نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ اور ان کے وہاں پہنچنے کا انتظار کئے بغیر برف پر جھکا اور احتیاط سے رینگتا ہوا ننھی لوئس کے قریب پہنچ گیا۔

لوئس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کے سرخ سرخ گالوں پر بہنے والے آنسو جم کر برف کی سفید لکیر میں تبدیل ہو گئے تھے۔

"ننھی لڑکی ـــــ ڈرو مت۔ میں آ گیا ہوں۔"

اس نے زور سے کہا۔ مگر شاید بچی نے اس کی بات سنی نہیں وہ بہت خوفزدہ تھی۔ اس کا جسم سردی سے کانپ رہا تھا اور دانت آپس میں جم چکے تھے۔

اینڈریو کے قریب پہنچنے کی وجہ سے جھیل کی برفیلی سطح میں ہلچل پیدا ہوئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ کہ اب وہ برف میں دھنس جائے گا۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اپنے دوستوں کو دیکھنا چاہا۔ جواب اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔

پیچھے دیکھے بغیر اس نے پوری قوت سے کہا۔ "دوستو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنا ورنہ بچنا مشکل ہو جائے گا۔ بچی مزید برف میں دھنس جائے گی۔" اینڈریو کی آواز سن کر وہ سب اپنی جگہ ساکت ہو گئے، اینڈریو کی بات درست تھی۔ ذرا سی حرکت سے معاملہ الٹ سکتا تھا۔ اب بچی نے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسے زندگی کی کرن

دکھائی دے رہی تھی۔ بہت احتیاط کے ساتھ اینڈریو نے ہاتھ بڑھایا اور پوری قوت سے بچی کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہیں کر سکا۔ کیونکہ اس کا ایک پاؤں جھیل میں دھنس چکا تھا۔ اس کے دوست یہ صورتحال دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ ڈیوڈ تو رونے لگا مگر پھر بھی اینڈریو نے ہمت نہ ہاری اور بولا۔ "بچی کو تم لوگ اپنی جانب کھینچ لو۔" اس کی آواز بہ مشکل نکل رہی تھی۔ پھر دو لڑکوں نے بڑھ کر لوئس کو فراک سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ لوئس بحفاظت جھیل سے نکل آئی۔ اینڈریو نے سہارے کے لئے ادھر ادھر ہاتھ مارنے کی کوشش کی تو برف کے گالے پچکنے لگے۔ اور وہ مزید برف کے پہاڑ میں دھنستا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اب اس کے کاندھے باہر رہ گئے تھے۔

"اوہ خدایا۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو نہ جانے کتنے لوگوں کو میری ضرورت ہوگی۔ مجھے لوگوں کے کام کرنے ہیں بہت سارے۔" وہ آہستہ آہستہ بڑبڑاتا ہوا آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے سارے دوست مدد کے لئے لوگوں کو بلانے چلے گئے اب وہاں اینڈریو اکیلا نرم نرم برف سے لڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر وہ چپ چاپ محسوس کرتا رہا کہ کیا وہ مزید اندر تک جاسکتا ہے یا نہیں۔ یکایک اسے احساس ہوا کہ اس کے جوتے کے نیچے کوئی سخت چیز ہے۔ اس کی جان میں جان آگئی۔ اس نے پورا زور دے کر دوسرا قدم آگے کی طرف بڑھایا اور جھیل کے کنارے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ اور ایک جھٹکے میں اس کا آدھا دھڑ جھیل سے باہر آگیا۔ مگر وہ سخت چیز اس کے قدموں کے نیچے سے ہٹ گئی۔ اب اینڈریو محتاط ہو گیا کہ ذراسی غلط جنبش سے کہیں وہ دوبارہ اندر تک نہ چلا جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور ترکیب استعمال کرتا۔ چھ سات افراد اس کے قریب آچکے تھے۔ انہوں نے مضبوط رسی لہرا کر اس کی جانب پھینکی اینڈریو نے بلاتاخیر اسے تھام لیا اور گھسٹتا ہوا باہر نکل آیا۔

"اوہ تھینکس گاڈ۔" اس نے برف پر لیٹے لیٹے دونوں آنکھوں کو بند کرتے ہوئے کہا جھیل میں میرے پاؤں کے نیچے کیا چیز تھی؟

"یہ معلوم کرنا آسان نہیں ہے اس وقت تک جب تک کہ تیز دھوپ نکل کر ساری وادی کی برف کو پگھلا نہ دے۔" کسی مدد گار شخص نے کہا۔

"بہرحال مجھے خوشی ہے کہ میرے آئندہ کے خیالات اللہ کو پسند ہیں۔ اور مجھے دوسری زندگی لوگوں کی مدد کرنے کے لئے ہی ملی ہے۔ کیا ننھی بچی خیریت سے ہے؟" اینڈریو نے آنکھوں سے برف صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں لوئس ٹھیک ہے۔ ہمیں تمہارے کارنامے پر فخر ہے بیٹے۔" یہ امی کی آواز تھی۔

امی! اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔"

ہاں بیٹے تم بڑے ہو گئے ہو۔" امی فخر سے اسکی پیٹھ تھپتھپانے لگیں۔

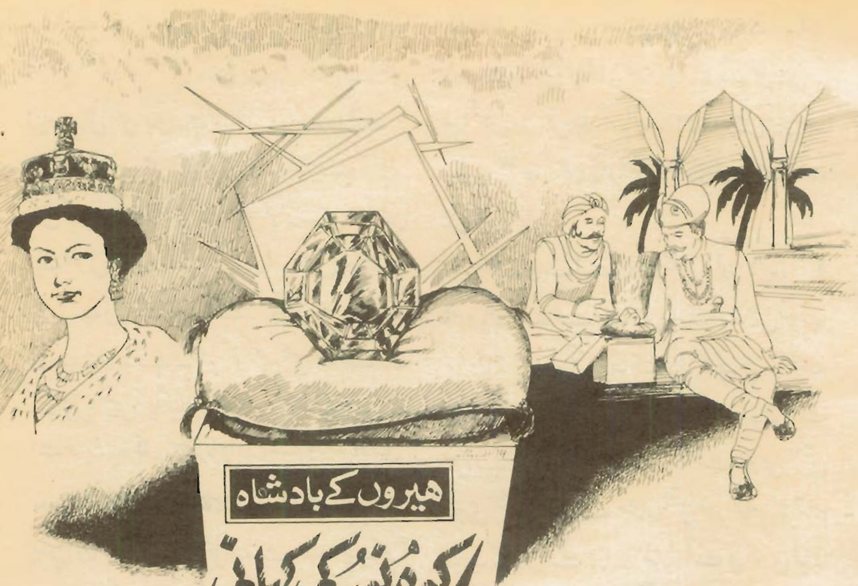

ہیروں کے بادشاہ

کوہِ نور کی کہانی

عبدالستار خان طاہر

حیدر آباد دکن سے پانچ میل مغرب میں گولکنڈہ کے ویران اور ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات ایک عظیم سلطنت کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ لیکن گولکنڈہ کی تاریخی اہمیت دراصل ان مشہور اور روایتی ہیروں کی وجہ سے ہے جو آس پاس کی کانوں سے نکالے جاتے تھے اور گولکنڈہ شہر کے بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے آتے تھے اور گولکنڈہ کے نام سے منسوب کر دیئے جاتے تھے۔ گولکنڈہ کے ہیروں کی کہانی بادشاہوں کے عروج و زوال کی کہانی ہے۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی داستان ہے۔ سلطنتوں کے بننے بگڑنے میں گولکنڈہ کے جن ہیروں نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے ان میں چند ایک نام بہت مشہور ہیں مثلاً "ریجنٹ" "ارلاف" "شاہ" "ہوپ" "اکبر شاہ" اور "سانسی" وغیرہ۔ لیکن ان سب ہیروں سے مختلف، سب سے الگ اور سب سے ممتاز ہیروں کا سرتاج ایک اور بیش بہا ہیرا ہے جس کا نام ہیروں کی تاریخ میں ایک زندہ روایت بن گیا ہے۔ وہ ہے "کوہِ نور"۔ مہذب زمانے میں ہیروں کو خزانے کی ساکھ سمجھا جاتا تھا اور بوقت ضرورت اس کی ضمانت پر نقد رقم مہیا کی جاتی تھی۔ چنانچہ نپولین بونا پارٹ نے ریجنٹ ہیرے کی ضمانت پر نقد رقم حاصل کر

کے اسے جنگی تیاریوں پر خرچ کیا تھا۔ ہیروں کے سرتاج "کوہِ نور" کی تاریخ چار ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی کہی جاتی ہے اور اس کی موجودہ قیمت کا اندازہ کروڑوں میں لگایا جاتا ہے۔ خیال ہے کہ اگر آج کوہ نور کو نیلام کیا جائے تو کم لوگ ہی دنیا میں ایسے خوش نصیب ہوں گے جو اس بیش بہا پتھر پر بولی دینے کی ہمت کریں گے۔ کوہ نور کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس کو کبھی بھی فروخت کے لئے پیش نہیں کیا گیا اور نہ کسی نے رقم ادا کر کے اسے خریدا ہے بلکہ یہ پتھر راجاؤں سے بادشاہوں اور بادشاہوں سے شہنشاہوں تک ہاتھوں ہاتھ پہنچتا رہا۔ کوہِ نور کی تاریخی اہمیت بہت دلچسپ بھی ہے اور عبرت ناک بھی۔ کوہ نور کبھی اپنے مالکان کے لئے کامیابی اور بامرادی کا پیغام لے کر نہیں آیا بلکہ ہمیشہ تباہی و بربادی کا ذریعہ رہا ہے۔ کوہ نور کی ابتدائی تاریخ کے متعلق کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن تمام ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ہیرا گولکنڈہ کے اطراف و جوانب میں کہیں پایا گیا تھا اور ایک طویل عرصے تک یہ مختلف لوگوں کے پاس رہا سب سے قدیم سراغ کے مطابق کوہ نور ۱۳۰۴ء سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ روایتی پتھر دراصل ۱۳۰۴ء میں ہی عوام کی نظروں کے سامنے آیا۔ ابتدا میں اس کا وزن آٹھ سو قیراط تھا۔ تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہیرا مہاراجہ گوالیار نے پانی پت کی جنگ کے بعد نصیر الدین محمد ہمایوں کو تحفتاً پیش کیا تھا ایک اور روایت کے اعتبار سے یہ ہیرا سلطان علاؤالدین نے مہاراجہ مالوہ سے حاصل کیا تھا۔ مہاراجہ کے خاندان میں یہ ہیرا نسل در نسل چلا آرہا تھا۔ ۱۶۵۶ء میں میر جملہ نے یہ مشہور زمان پتھر شہنشاہ شاہجہان کی خدمت میں پیش کیا۔

شاہجہان نے اسے کوہ نور یعنی "نور کا پہاڑ" کا نام دیا اور اسے اپنے ایک بیش قیمت تخت میں نصب کرا دیا۔ یہی وہ تخت تھا جسے دنیا کا بچہ بچہ "تختِ طاؤس" کے نام سے جانتا ہے۔ اور اپنے وقت میں بے مثال سمجھا جاتا تھا۔ "تخت طاؤس" کی ظاہری شکل مور سے مشابہ تھی اور تمام کا تمام نایاب پتھروں سے جڑا ہوا تھا۔ تخت کی کرسی ایک اونچے پلیٹ فارم پر بنائی گئی تھی جس میں چاندی سے مرصع قدمچے لگے ہوئے تھے لیکن شاہجہان کو تخت طاؤس راس نہ آیا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے دہلی پر قبضہ کیا اور مال غنیمت میں "تخت طاؤس" بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ کہتے ہیں ہیرے کو حاصل کرنے کے بعد نادر شاہ نے اس کو "دُرِّ دوراں" کا نام دیا اور اسی کی مناسبت سے "درانی" کہلایا۔ اس تخت میں کوہ نور کے علاوہ اور بھی کئی بیش قیمت اور نادر پتھر تھے جس میں "لعل بدخشانی" (لعل تیموری) بھی قابل ذکر ہے۔ کوہ نور نادر شاہ درانی جیسے جابر فاتح کا ساتھ بھی نہ دے سکا اور ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ درانی قتل ہو گیا۔ کوہِ نور احمد شاہ ابدالی کے ساتھ فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا قندھار میں سکونت پذیر ہو گیا۔ لیکن یہ ساتھ بھی عارضی

ثابت ہوا کچھ ہی عرصے بعد احمد شاہ ابدالی فوت ہو گیا اور اب تخت سلطنت پر خان اعظم امیر تیمور جلوہ افروز ہوا اور کوہ نور اپنے نئے مالک کے توشہ خانے کی زینت بن گیا۔ ۱۷۹۳ء میں کوہ نور کی نحوست پھر رنگ لائی اور امیر تیمور اپنے پیچھے خانہ جنگی اور سیاسی طوائف الملوکی کا ایک طویل دور چھوڑ کر چل بسا۔ امیر تیمور کے ۳۲ بیٹوں میں حصول تخت کے لئے زبردست رسہ کشی ہونے لگی۔ بالآخر کسی طرح اس کا پانچواں بیٹا زمان مرزا تخت پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ زمان مرزا بھی کوہ نور کی روایتی نحوست کے سائے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ یہ (کوہِ نور) ۱۸۰۳ء میں اس کے دوسرے بھائی محمود کے لئے بھی اچھا شگون لے کر نہ آیا اور اس (محمود) کے تخت سنبھالنے کے فوراً بعد ہی شہزادہ شجاع نے بغاوت کر دی۔ لیکن شجاع کو بھی سکون نصیب نہ ہوا اور اسے پایۂ تخت سے بھاگنا پڑا۔ پنجاب میں اس وقت سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت تھی۔ شجاع نے مہاراجہ سے پناہ مانگی۔ پناہ تو ملی لیکن شجاع کو کوہِ نور سے ہاتھ دھونا پڑے اور مہاراجہ نے شہزادے کے تمام قیمتی پتھر چھین لئے جو وہ قندھار سے لے کر بھاگا تھا۔ ۱۸۴۹ء تک کوہ نور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے توشہ خانے میں قیام پذیر رہا۔ لیکن اسی زمانے میں سر زمین ہند میں انگریزوں کی جڑیں بہت مضبوط ہو چکی تھیں۔ انگریزوں نے پنجاب میں سکھوں کی حکومت ختم کی تو یہ ہیرا ان کے ہاتھ لگا۔ اور ۳ جون ۱۸۵۰ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے کوہ نور کو ملکہ معظمہ وکٹوریا کی خدمت میں نذرانے کے طور پر لندن بھجوا دیا جسے فوراً بعد ہی لندن میں ہونے والی عظیم نمائش میں بھی رکھا گیا اور کوہ نور نے دور اور قریب کے قدر دانوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ۱۸۵۲ء میں ملکہ معظمہ کے حکم سے ملکہ کے خاص نجی ماہر معدنیات اور جوہر جیمس ٹینینٹ نے اسے خاص طور پر تراشا اور تراشنے کی وجہ سے اس کا وزن ۱۹۱ میٹرک قیراط سے گھٹ کر صرف ۱۰۸.۹ قیراط رہ گیا۔ ملکہ وکٹوریا نے اس ہیرے کو ایک بروچ میں جڑوا کر اپنے ذاتی استعمال کے لئے محفوظ رکھا۔ ملکہ کے انتقال کے بعد اسے شاہی ماہی و مراتب میں داخل کر لیا گیا۔ ملکہ "ایلیگزنڈرا" کی رسم تاجپوشی کے وقت اس ہیرے کی یاد پھر آئی اور اسے ایک خاص تاج میں جو وہ "ملکہ معظمہ سلطنت ہند" کی حیثیت سے استعمال کرتی تھیں، سامنے کی کراس پلیٹ میں جڑ دیا گیا۔ ملکہ میری نے بھی اسی تاج کو زیب سر کیا لیکن مادر ملکہ ایلزبتھ کے دور میں اسے پرانے تاج سے نکال کر نئے تاج میں لگا دیا گیا۔ مشہور جوہری گیراڈ نے اسے دوبارہ تراشا اور تاج میں نصب کیا۔ یہ تاج "کوئنز کراؤن" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے اور آج بھی اپنی تمام تر شان و شوکت کے ساتھ گہرے بنفشی رنگ کے مخملیں تکیہ پر رکھا ہوا یہ تاج مسلح فوج کے پہرے میں تاریخی ٹاور آف لندن کے شاہی جواہر خانہ کے

اس حصے میں رکھا ہوا ہے جو پہلے کبھی قید خانہ تھا اور سنگین جرائم کے مجرم اس میں قید کئے جاتے تھے۔ وقت گزر گیا لیکن اس جگہ کی اہمیت ابھی باقی ہے۔ قید خانہ وہی ہے البتہ قیدی ضرور بدل گئے ہیں۔ آج کا قیدی سرزمین ہند کا مایہ ناز گوہر ''کوہِ نور'' ہے۔ یہاں ایک اور بات قابل ذکر ہے۔ دنیا کے دوسرے ہیروں کی طرح ''کوہ نور'' کا نام اپنے ملک کے نام پر مشہور نہیں ہے۔ کوہ نور کی ساری تاریخ اس کے مختلف مالکان کے لئے سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ نہیں رہی ہے۔ تاج برطانیہ میں نصب ہوتے ہی انگریزوں کے ہاتھ سے تمام نو آبادیاں اور مقبوضہ علاقے آہستہ آہستہ نکلنے لگے اور خود ہندوستان بھی اس کے قبضے سے نکل گیا جو شاید عظیم سلطنت برطانیہ کی سب سے بڑی ریاست تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جب تک یہ ہیرا تاج برطانیہ سے علیحدہ نہیں کر دیا جاتا برطانیہ کا مکمل زوال روکا نہیں جاسکتا۔

○ .... ○ .... ○

غازی نے دشمن کو غرق کر دیا

یہ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کی رات تھی بھارت کے چار بحری جہاز پورے ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ دشمن کو یہ خوش فہمی تھی کہ جنگ بند ہونے والی ہے۔ لہٰذا پاکستانی فوجی اس تاریک رات میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ لیکن جیسے ہی یہ جہاز آگے بڑھا پاکستانی آبدوز ''غازی'' نے سر اٹھایا اور مقابلے کے لئے تیار ہو گئی۔

''غازی'' آبدوز بحیرہ عرب میں پاکستان کی سمندری حدود کی نگرانی کے لئے پہلے سے ہی تیار تھی۔

آبدوز کے کمانڈر ''کے آر نیازی'' نے جو کئی راتوں سے دشمن کے انتظار میں پوری طرح چاق و چوبند اور تیار تھے........ اللہ کا نام لیا اور اپنی آبدوز کو آگے بڑھنے کا حکم دے دیا۔

دشمن کی نظر جب ''غازی'' پر پڑی تو وہ ہنس پڑا۔ اس کے خیال میں چار بڑے جہازوں کا ایک چھوٹی سی آبدوز کیا بگاڑ سکتی ہے۔

ہندوستان کے جہازوں نے ''غازی'' کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ کمانڈر نیازی نے بڑی احتیاط سے حالات کا جائزہ لینے کے بعد دشمن کے ایک فریگیٹ جہاز پر حملہ کر دیا۔ یہ فریگیٹ جہاز بہت بڑا تھا۔ لیکن نیازی صاحب ذرا بھی نہ گھبرائے انہوں نے تار پیڈو کے ذریعے اس جہاز پر قابو پایا اور سمندر کی تہہ کی طرف لے گئے۔ بڑا عجیب وقت تھا جب ایک بہت بڑا جہاز اسلحے سے پوری طرح لیس بے بسی کے عالم میں ''غازی'' کے قبضے میں آ چکا تھا۔

غازی آبدوز بڑی تیزی سے اسے نیچے کی طرف لے جا رہی تھی چند ہی منٹوں میں یہ فریگیٹ جہاز سمندر کی تہہ میں غرق کر دیا گیا۔ اب جب نیازی صاحب نے دوسرے تین ہندوستانی جہازوں کی طرف نظر دوڑائی تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ دشمن میدان چھوڑ کر ڈرپوک گیدڑ کی طرح بھاگ چکا ہے اور سمندر کا صاف پانی دشمن کی بزدلی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ نیازی صاحب کی حاضر دماغی اور بہادری پر صدر مملکت نے انہیں ''ستارہ جرأت'' کا تمغہ عطا کیا۔

مزید محنت کی ضروت ہے

ناقابل اشاعت تحریریں ضائع کر دی جاتی ہیں ایسی تحریروں کی واپسی کا مطالبہ نہ کریں۔ تحریر بھیجتے وقت اس کی ایک نقل اپنے اس ضرور محفوظ رکھیں!!

"ابو بکر الائیں گے" محمد فیاض، کراچی۔ "بارش" ارسلان خالد کوئٹہ۔ "پیارے بچے" "کشمیری بھائی" محمد عثمان، اٹک۔ "قوم کا خادم" "حضرت عثمان غنیؓ" عبدالوحید عباسی، لاڑکانہ۔ "ایک یاد گار دن" اصفیہ عرفان برڑو، دادو۔ "اخلاق" محمد عدنان عبدالعزیز، کراچی۔ "بلّے کی کہانی" عالم شفیع ہمدم، جھنگ صدر۔ "دنیا میرے آگے" پرنس عمر ریاض ساگری، جہلم۔ "آزادی بڑی نعمت ہے" افشاں نعیم خان، ٹنڈو آدم۔ "بلاعنوان" عظیم اختر میمن، میرپور خاص۔ "خصوصی بلیٹن" محمد کاشف شیخ، کراچی۔ "ریڈیو کی کہانی" حمیرا سلیم خان، شور کوٹ۔ "گرمی کا جب موسم آئے" عامر شاہ، کراچی۔ "اندھا سانپ" ایم اعجاز احمد، کراچی۔ "انجانے بھوت" عدیل اسلم، گوجرانوالہ۔ "کیا ماریہ بدتمیز ہے" کلثوم کاکڑ، کوئٹہ۔ "نمک حرام" عثمان عدیل، جہلم کینٹ۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی" سعدیہ کوکب، بہاولپور۔ مولوی عبدالحق، محمد عرفان احمد، کراچی۔ "ہمارے نبی" زاہد حسین زاہد، پسنی۔ "غصے کا انجام" عمر غلام نبی، راولپنڈی۔ "جنگ ستمبر" اسما اصغر، راولپنڈی۔ "شیر اور طالب علم" احسن رندھاوا، حیدر آباد۔ "دعا" سہیل احمد سہیل، صوابی۔ "انجام" سید خرم مہدی، کراچی۔ "دکھاوے کا انجام" ارم فاطمہ، کراچی۔ "غرق شدہ خزانے" اے ڈی رضا، ڈونگہ بونگہ۔ "غریب بھی انسان ہیں" آمنہ اسلم، ہارون آباد۔ "عقل مند موچی" چوہدری امیر، کراچی۔ "غدار مجاہد" سید ارمان علی مجاہد، حیدر آباد۔ "کامیابی" زیاد بن طارق، ہزارہ۔ "ڈھول کا پول" اویس احمد، حیدر آباد۔ "بلاعنوان" معین الدین انصاری، حیدر آباد۔ "بونے کہاں پائے جاتے ہیں؟" سیدہ کاشفہ خاتون نقوی، کراچی۔ "کشمیر ہمارا ہے" علی عمران میاں، ساہیوال۔ "چڑیا گھر" پ۔ ک تاج، لاہور۔ "ذرا سی شرارت" عثمان طاہر وردگ، کوئٹہ۔ "نظم" لطیف مہران ہالیپوٹہ، حیدر آباد۔ "انار" ماریہ منصور، کراچی۔ "انتقام یا تحفہ" رضوان عبدالرشید، لاہور۔ "ندامت کے آنسو" سید سجاد حیدر، گجرات۔ "نیکی کر" "وقت" "دو دانے" نیلم ستار، حافظ آباد۔ "لالچ کا انجام" "مسٹر بونا" "ضد نہیں کروں گی" "ایسا بھی ہوتا ہے" عروسہ یونس، اسلام آباد۔ "نیلا دین" منیر احمد، گجرات۔ "برے کام کا برا انجام" راشد اقبال، کراچی۔ "بھائی جان کی بہادری" محمد اشفاق، نوشہرہ۔ "احمد کی دیانت داری" احمر صدیقی، ملتان۔ "آئس کریم کی کہانی" محمد اختر سردار، کسووال۔

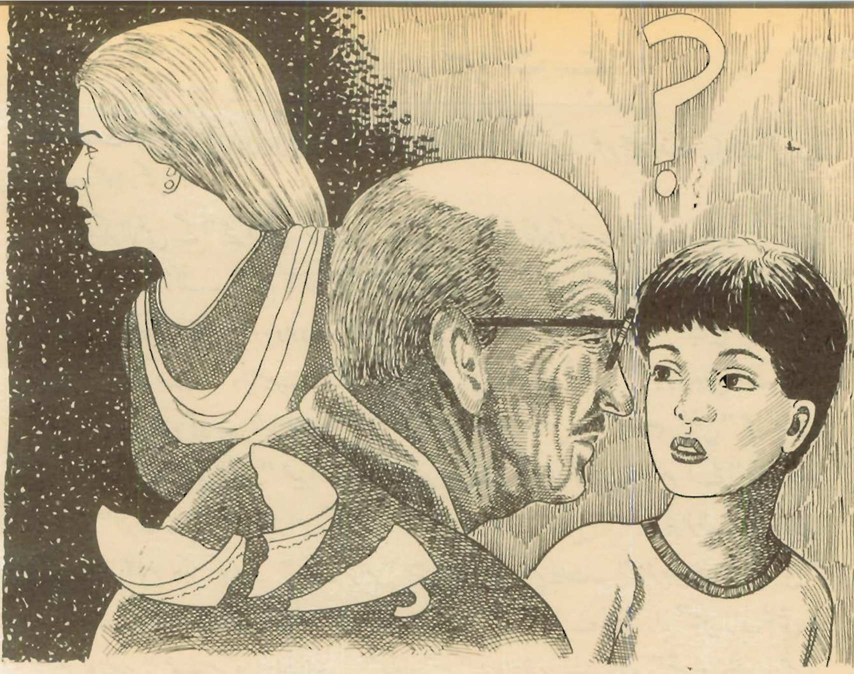

طَرَفْ دَارْ

محمد عقیل صابر قریشی

ناصر دادا جان کے ساتھ برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اچانک اسے اپنی امی کی گرجتی آواز سنائی دی۔

"یہ پیالی تم نے توڑی ہے؟"

آواز دادا جان کے کمرے سے آئی تھی جہاں مہری جھاڑو لگا رہی تھی۔ دادا میاں نے آہستہ سے اخبار سامنے سے ہٹایا۔ اپنی عینک کان پر درست کی۔ اس طرح جیسے اب انہیں زیادہ صاف سنائی دینے لگے گا۔

"کون سی پیالی بیگم صاحبہ؟" مہری کی منمناتی آواز آئی۔ وہ ایک بارہ تیرہ سال کی دبلی پتلی لڑکی تھی جو گھر کی صفائی کا کام کرتی تھی۔

"بیگم صاحبہ! میں تو ادھر گئی بھی نہیں"

"ارے تو پھر کون اسے توڑے گا۔ کوئی اور توڑتا تو بتاتا ضرور۔"

"میں سچ کہتی ہوں بیگم صاحبہ میں نے نہیں توڑا اسے۔"

"اب جھوٹ بھی بولے گی۔ اتنی مہنگی پیالی تھی۔ سارا سیٹ خراب کر دیا۔ مفت کی چیزیں نہیں ہیں...... کیا سمجھی؟"

"اللہ قسم بیگم صاحبہ......"

"بس چپ ہو جائیں کہتی ہوں......" ناصر نے دادا کی طرف دیکھا وہ ایک دم ساکت بیٹھے امی اور مہری کی گفتگو سن رہے تھے۔

"میں تیری تنخواہ میں سے پیسے کاٹوں گی۔"

ناصر کی امی کمرے سے باہر نکلتی دکھائی دیں۔ وہ سخت غصے میں تھیں۔ ان کے پیچھے مہری سر جھکائے ہوئے تھی۔

"مگر بیگم صاحبہ میں نے......" وہ تقریباً رونے کے قریب تھی۔ ناصر نے دادا میاں کی طرف دیکھا وہ بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ وہ ناصر کی ماں سے بہت کم بات کرتے تھے۔ دراصل وہ ان سے گھبراتے تھے۔ کیونکہ وہ زبان کی بہت تلخ تھیں اور لحاظ، پاس کی ذرا کم ہی قائل تھیں۔

"اس بار میں پیسے ضرور کاٹوں گی۔" انہوں نے پھر دھمکی دی۔

"حد ہو گئی پچھلی بار گلاس توڑ دیا تھا۔"

"مگر بیگم صاحبہ! وہ گلاس تو آپ کی بلی نے گرایا تھا۔" مہری نے صفائی پیش کی۔

"خاموش رہ پیالی کوئی اور توڑ ہی نہیں سکتا۔ دادا میاں ہیں، یہ لڑکا ہے اور کامران ہیں۔ کامران تو دو دن سے دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ ناصر تو دادا کے کمرے میں گیا ہی نہیں اور دادا توڑتے تو بتاتے۔ کون توڑے گا پھر؟"

مہری گھگھیائی تو ناصر نے دادا کی طرف دیکھا اس نے انہیں بلاوجہ نہیں دیکھا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ پیالی آج صبح ہی دادا سے گری تھی۔ رات انہوں نے چائے پی تھی اور میز پر اسے رکھ دیا تھا۔ صبح جب وہ میز سے کوئی کاغذ کھینچ رہے تھے تو اسی کے ساتھ پیالی بھی نیچے آ گئی تھی۔

ناصر وہیں کھڑا تھا۔ پھر دادا نے اس کے ٹکڑے چن کر ڈسٹ بن میں ڈال دیئے تھے۔

دادا چپ بیٹھے تھے۔

ناصر ابھی دس سال کا تھا مگر تھا سمجھدار۔ سمجھ گیا تھا کہ دادا بتانا نہیں چاہ رہے۔ اسے مہری پر ترس آ رہا تھا۔

مگر دادا چپ تھے۔

"پورے پچاس روپے تنخواہ میں سے کٹیں گے تب تجھے سلیقہ آ جائے گا۔"

امی یہ کہہ کر دوسرے کمرے کی طرف چل دیں۔ مہری پیچھے پیچھے تھی۔

ناصر نے دادا کی طرف پھر دیکھا۔ دادا نے ایک انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اسے چپ رہنے کو کہا۔ اور اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور دھیرے سے بولے...... "بتانا مت۔" "مگر دادا ابا وہ مہری کے پیسے کاٹیں گی۔ مہری رو رہی ہے۔"

"کاٹنے دو۔" دادا نے دھیرے سے کہا۔

اسے دادا پر بہت تاؤ آیا۔

مگر دادا نے تھوڑی دیر توقف کے بعد کہا "ہم چپکے سے کٹی ہوئی تنخواہ مہری کو دے دیں گے اور بس۔"

"واہ!" ناصر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ مگر پھر وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ "مگر دادا آپ کے پاس پچاس روپے کہاں سے آئیں گے۔ آپ تو بس ابو سے کہہ کر اپنی چیزیں منگواتے ہیں۔" "ہاں یہ مسئلہ تو ہے۔" دادا میاں نے عینک اتارتے ہوئے کہا۔ وہ سوچنے لگے۔

"ایک ترکیب ہے!" ناصر نے کہا۔

"کیا ہے......؟" دادا ابا نے دلچسپی سے کہا۔" میں اپنی جیب خرچ میں سے پیسے بچاتا رہوں گا۔ اس طرح مہینے کے آخر میں پچاس روپے ہو جائیں گے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" مگر پھر دادا کی آنکھیں یک دم اداس ہو گئیں۔ "مگر تم پچاس روپے کیسے جمع کر پاؤ گے۔ تمہیں تو مہینے میں بمشکل بیس روپے ملتے ہیں۔"

ایک بار پھر وہ دونوں سر جوڑے مسئلے کا حل ڈھونڈ رہے تھے۔ اچانک ناصر نے کہا۔

"دادا...... دادا۔"

"کیا ہے......؟"

"لیکن دادا، امی مہری کو جھوٹی سمجھ رہی ہیں اس کا نقصان تو پورا ہو جائے گا مگر امی اسے ہمیشہ جھوٹی سمجھتی رہیں گی۔"

"ہوں......ں......ں......" دادا ابا نے لمبی سی ہنکار بھری۔

"پھر......؟" ناصر نے بڑی اُمید سے دادا کو دیکھا۔ مگر وہ چپ رہے تو اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"آپ بتا دیں نا؟"

"بتا تو دوں لیکن تمہاری ماں۔ اس بات پر تمہارے ابو سے بہت لڑے گی اور گھر کی فضا خراب ہو گی۔ میں یہ نہیں چاہتا۔" دادا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

ناصر وہاں سے جانے لگا تو دادا نے اسے روک کر کہا۔

"اپنی ماں کو کچھ نہ بتانا ہم مہری کو پیسے دے دیں گے۔" ناصر نے سر ہلا دیا اور چلا گیا۔ اس کے چہرے پر ناگواری پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد دادا یونہی بیٹھے خلا کو گھورتے رہے۔ ان کے چہرے پر افسردگی تھی۔ یہ عورت جوان کی بہو تھی، انہیں پسند نہیں کرتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ بڑے چاؤ سے وہ اسے بیاہ کر لائے تھے۔ اب جبکہ وہ ستر سے اوپر ہو گئے تھے۔ وہ ان سے بے زار رہنے لگی تھی حالانکہ انہوں نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ اس گھر میں بہت ناخوش انداز میں جی رہے تھے۔ صرف ان کا پوتا ناصر ہی تھا، جو ان سے قریب تھا۔ ورنہ ان کا اپنا بیٹا بھی اسی وقت بات کرتا تھا جب اسے کوئی ضرورت پڑتی تھی۔

یہاں وہ ایک قیدی کی طرح تھے اور خود کو اپنی

عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا محسوس کرتے تھے۔ خلا میں گھورتے ہوئے انہوں نے ایک لمبی سانس لی اور اخبار صحن میں پھینکتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ انہیں اپنے کمرے میں ناصر کی ماں اور مہری نظر آئی۔ مہری منہ بسورتے ہوئے جھاڑو لگا رہی تھی۔ دادا ابا کو جب مہری نے کمرے میں آتے دیکھا تو عجیب سی نظروں سے انہیں گھورا۔ دادا ابا ایک لمحے کے لئے گھبرا گئے پھر وہیں رک کر بہو سے پوچھا "کیا ہوا تم مہری پر کیوں خفا ہو رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں...... میں سمجھی تھی کہ پیالی مہری نے توڑی ہے۔" بہو نے بے زاری سے کہا تو دادا ابا قدرے نروس ہو گئے۔ غالباً ناصر نے انہیں بتا دیا تھا۔ انہوں نے دیکھا ناصر گردن جھکائے امی کے پہلو میں کھڑا ہے۔ انہوں نے ناصر کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا تھا۔ اور پھر ان کی کمر مزید جھک گئی۔

ناصر کی امی نے ناصر کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"پیالی توڑنے کی وجہ سے تمہارا جیب خرچ بالکل بند...... سمجھے۔ آنے دو کامران کو میں انہیں بھی تمہاری کارستانیاں بتاؤں گی۔"

"کک ...... کیا کیا؟ پیالی ناصر نے توڑی ہے!" دادا میاں نے بے یقینی سے ناصر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ناصر نے دادا کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

اقوال زریں

○ کم کھانا صحت، کم بولنا حکمت، کم سونا عبادت ہے۔ (حضرت عمرؓ)

○ خاموشی غصے کا بہترین حل ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

○ عقلمند کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا بے وقوف کہتا ہے میں سب کچھ جانتا ہوں۔ (حضرت عثمانؓ)

○ خاموشی عالم کے لئے زیور اور جاہل کی جہالت کے لئے پردہ ہے۔ (حضرت علیؓ)

○ تندرستی سب سے بہترین لباس ہے اور جہالت سب سے دردناک مرض۔ (حضرت علیؓ)

○ دو آدمیوں کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ طالب علم اور طالب مال۔ (امام غزالیؒ)

○ نیکی اور بدی کے درمیان اتنی باریک لکیر ہے کہ نظر نہیں آتی۔ (امام غزالیؒ)

○ جس نے خدا کو پہچان لیا اس سے کوئی شے چھپی نہیں رہتی۔ (اویس قرنیؒ)

○ جو اچھی بات سنو لکھ لو اور جو لکھو حفظ کر لو اور جو حفظ ہیں ان کو بیان کرو۔ (یحییٰ برمکی)

○ ملازم سے اپنا راز کہنا اسے ملازم سے اپنا مالک بنالینا ہے۔ (ارسطو)

○ عالم سے ایک گھنٹہ کی گفتگو دس برس کے مطالعے سے زیادہ مفید ہے۔ (بطلیموس)

مرسلہ...... عالم شفیع ہمدم جھنگ صدر

بوڑھے آدمی نے ایک لمبی سی سانس کھینچ کر اپنے آپ کو سیدھا کیا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا جیسے وہ دوبارہ جوان ہو گیا ہو...... جیسے وہ اکیلا نہ ہو۔

● .... ●

چنگیز خان کی رحمدلی

عنایت اللہ اعوان

پوچھا کبھی کسی نے جو چنگیز خان سے ایک بات آج تو بتا اپنی زبان سے
ویسے تو ظلم تو نے کئے روز و شب بہت ہر دم لہو کی تجھ کو رہی ہے طلب بہت
کیا رحم کا ہوا ترے دل میں گزر کبھی فریاد نے کیا ترے دل پر اثر کبھی
چنگیز خان سُن کر یہ بولا کہ ہاں، یہ ہے سُن اب ترے جواب میں میرا بیاں یہ ہے
نیزہ اٹھائے میں جو روانہ تھا ایک بار یکدم ہی میرے کان تلک آئی اک پکار
چلا رہی تھی وہ میرا بچہ نہ ڈوب جائے کیا کوئی بھی نہیں کہ جو آکر اسے بچائے
آواز سُن کے میں جو ذرا اس طرف گیا پانی میں ڈوبتا ہوا بچہ نظر پڑا
پھر یہ ہوا کہ اس پر ترس آگیا مجھے فطرت کے تو خلاف تھا، بس آگیا مجھے
گھوڑے سے میں اتر کے گیا اس طرف جہاں بچہ تھا ڈوبتا ہوا پانی کے درمیاں
نیزہ چبھو کہ اس کے بدن میں اٹھا لیا نزدیک ہی تھی ماں اسے جا کر تھما دیا
اللہ ایسے شخص سے ہر ایک کو بچائے جو رحم بھی کرے تو کسی آنکھ کو رُلائے

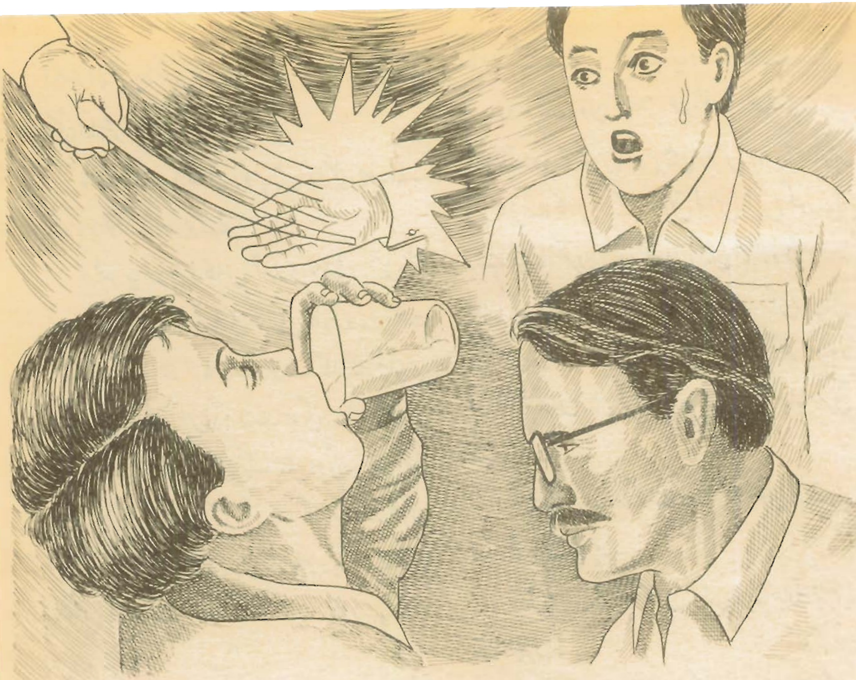

آنکھ بند مرغے

الطاف حسین

میٹرک کے سالانہ امتحان سر پر تھے۔ ہمارے کلاس ٹیچر، ماسٹر عبدالغفور صاحب لڑکوں کی کارکردگی بہتر بنانے کی غرض سے آئے دن ٹیسٹ پر ٹیسٹ لے رہے تھے۔ ریاضی جیسا مشکل مضمون پڑھاتے تھے اور بدقسمتی سے لڑکے ان کے مضمون میں ہی زیادہ کمزور تھے۔ ہر ٹیسٹ کا نتیجہ بر آمد ہوتا تو سب ہی فیل ہوتے۔ ٹیسٹ کے ۲۰ نمبروں میں سے کسی کے ۹ نمبر آتے۔ کسی کے ۷ نمبر آتے، کوئی ۳ نمبر حاصل کرتا۔ اور کچھ منچلے "گول" نمبر لینے سے بھی گریز نہ کرتے۔ صورتِ حال کافی تشویش ناک تھی۔ ماسٹر صاحب بہت فکر مند تھے۔ خصوصاً اپنے مضمون میں لڑکوں کی "اعلیٰ" کارکردگی نے ان کا سکون برباد کر رکھا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی ہمارے "شاندار نتائج" کی خبر ہو چکی تھی۔ لہٰذا ان کی ہدایت پر ماسٹر عبدالغفور صاحب نے شام چار سے چھ بجے تک

ایکسٹرا ٹائم دینا شروع کر دیا۔ اور آج اس سلسلے کی پہلی ایکسٹرا کلاس تھی۔

ماسٹر صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے۔ کچھ دیر توقف بعد بولے:

"دیکھو یہ ایکسٹرا کلاس تمہاری بہتری کے لئے شروع کی گئی ہے۔ تمہاری کامیابی کا دارومدار سخت محنت پر ہے۔ جو لڑکا محنت کرے گا اچھے نمبروں سے پاس ہو گا۔ اس کی عزت ہو گی، ہماری عزت ہو گی۔ اور اسکول کی بھی نیک نامی ہو گی۔ لہٰذا کوئی لڑکا فضول بہانہ بازی نہیں کرے گا۔ روزانہ کلاس اٹینڈ کرے گا۔ کلاس میں جو کام دیا جائے گا وہ خلوصِ نیّت سے کرو گے تو سب اچھا رہے گا۔ بصورت دیگر ...."

انہوں نے آخری جملہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔ لیکن اگلی بات ہم سب بخوبی سمجھ گئے۔

ریاضی کی ابتدائی چار مشقیں سمجھانے کے بعد انہوں نے سخت انداز میں وارننگ دیتے ہوئے کہا:

"کل میں ان چاروں مشقوں میں سے ٹیسٹ لوں گا۔ جو تیاری کر کے نہیں آئیں گے انہیں میرا مشورہ ہے کہ وہ گھر سے ارجنٹ مالش کر کے آئیں۔ بہت لحاظ ہو چکا۔ اب معافی یا نرمی کی قطعی گنجائش نہیں۔ جو فیل ہو گا اسے بالکل نہیں چھوڑوں گا۔"

یہ خوفناک اعلان سن کر نالائقوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ...... کہ یہ کیا ہونے لگا ہے۔

دوسرے دن ماسٹر عبدالغفور صاحب بید گھماتے ہوئے کلاس روم میں داخل ہوئے۔ کچھ دیر کھڑے کلاس کے ہر نالائق کو اس طرح گھورتے رہے جیسے نظروں ہی نظروں میں اندازہ لگا رہے ہوں کہ کون تیاری کر کے آیا ہے۔ آج ان کی آنکھیں شیر کی طرح چمک رہی تھیں۔ شکار موجود ہو تو آنکھوں میں آٹومیٹک چمک آ جایا کرتی ہے۔

"ٹیسٹ کے لئے تیار ہو؟" انہوں نے بید لہراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں!" کلاس میں صرف چند آوازیں ہی ابھریں۔

"یہ کیا! یہ تو پانچ چھ لڑکوں کی آوازیں سمجھ میں آئی ہیں۔ پچیّس لڑکوں کی کلاس ہے۔ کیا باقی کے منہ میں زبان نہیں؟..... کیا باقی گونگے ہو گئے ہیں؟ یا...... سانپ سونگھ گیا ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟" ماسٹر صاحب نے پہلے حیرت کا اظہار کیا اور پھر کئی سوالات ایک ہی سانس میں کر گئے۔ کلاس روم میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"جو تیاری کر کے آئے ہیں، بیٹھے رہیں۔ باقی نالائق کھڑے ہو جائیں۔" ماسٹر صاحب گرجے۔

چھ لڑکوں کے سوا باقی تمام لڑکے کھڑے ہو گئے۔ سب کے چہروں پر خوف کی زردی پھیل گئی تھی اور آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے

تھے اور اُدھر ماسٹر صاحب کے تیور بتا رہے تھے کہ آج معافی کسی کو نہیں ملے گی۔ بید لہرائے گا۔ ہڈیاں ٹوٹیں گی۔ آج سزا مقدّر میں لکھی جا چکی ہے۔

"ہاتھ باہر نکالو!" ماسٹر صاحب نے بید گھماتے ہوئے ساجد ککڑ کو حکم دیا۔ جو اُن کو اپنے قریب دیکھ کر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

ساجد ککڑ نے ہاتھ آگے کر دیئے لیکن جوں ہی بید لہرایا اس نے پھرتی سے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور بید ڈیسک پر جا لگا۔

"میرے بچے اتنی پھرتی ریاضی میں دکھا تو کیا بات ہے۔" ماسٹر صاحب نے اس کے پھرتیلے پن کی داد دیتے ہوئے دوبارہ بید لہرایا۔

"ماسٹر جی! آج مہلت دے دیں۔" ساجد ککڑ گڑ گڑایا۔

"مہلت کا بچہ...کل مہلت ہی دی تھی ناں۔ آج کیا کر کے آیا ہے۔ چل ہاتھ باہر نکال۔" ماسٹر صاحب کا پارہ انتہا کو چھونے لگا۔

ساجد ککڑ نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے کر دیئے۔

تڑاخ .... تڑاخ .... تڑاخ ....

بیدوں کی برسات شروع ہو گئی۔ ساجد ککڑ کی درگت بنتی دیکھ کر ہر نالائق خوفزدہ تھا۔

"چل مرغا بن جا۔ نالائقو! ناک کٹوانے پر تُلے کھڑے ہو۔ یہی علاج ہے تمہارا۔" ماسٹر صاحب بہت ناراض تھے۔

ساجد ککڑ ہاتھ بغل میں دبائے کلاس روم کے کونے میں جا کر مرغا بن گیا۔ اور ماسٹر صاحب نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔

"اور میرے پہلوان تیرا کیا حال ہے؟" ماسٹر صاحب کا رخ حمید ڈھول کی طرف تھا۔ اس کی موٹی جسامت کی وجہ سے ساری کلاس اسے ڈھول کہتی تھی۔

"جج .... جج .... جی .... جی

.... ماسٹر صاحب .... جی۔"

حمید ڈھول گڑ بڑا گیا۔

"جج ہی تو کر لیا ہے۔ اس لئے تو "اِس" کی زبانی سزا سنا رہا ہوں۔" انہوں نے بید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ہاتھ پیش کر"۔

حمید ڈھول نے گھبرا کر ہاتھ پیش کر دیئے۔

"تڑاخ!" پہلا بید پڑتے ہی حمید ڈھول باؤلے اونٹ کی طرح بلبلا اٹھا۔

"ہا...... ہائے ...... ہائے ہائے ...... ماسٹر جی مر گیا۔"

"تو نہیں تیرا مستقبل مر گیا .... اناج کے دشمن۔" انہوں نے بید کی نوک حمید ڈھول کی توند پر لگاتے ہوئے طنز کیا۔

تھوڑی دیر بعد ۱۵ عدد بیدوں کا ڈنر کر کے حمید ڈھول، ساجد ککڑ کے برابر مرغا بنا ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب نے جیب سے پٹی نکالی اور اس کی آنکھوں پر چڑھا دی۔ لگتا ہے ماسٹر صاحب سزا کے طریقۂ کار کی گھر سے ہی منصوبہ بندی کر کے آئے

تھے۔

ہمارا ذہن سوچ کہ سمندر میں غرق تھا۔ شیطانی کارخانہ مصروفِ عمل تھا۔ اچانک ہمیں ایک شرارت سوجھی۔ ماسٹر صاحب اب صابر کپکپی کی طرف ٹرن ہو چکے تھے۔ اور صابر کپکپی کی روح فنا ہو رہی تھی۔ وہ کبھی ماسٹر صاحب کے چہرے کو دیکھتا تھا کبھی ان کے ہاتھ میں پکڑے ہو بید کو رحم طلب نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اور پورے جسم پر کپکپی طاری تھی۔

"آ آ آ .... ہا .... ہائے۔" ہم پیٹ پکڑے اپنی جگہ پر ڈہرے ہو چکے تھے۔ ماسٹر صاحب صابر کپکپی کو چھوڑ کر تیزی سے ہماری طرف بڑھے۔

"کیا ہوا؟"

ہم نے جواب دینے کے بجائے تکلیف کے آثار چہرے پر زیادہ گہرے کر لئے۔ اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں پانی طلب کیا۔

"دوڑو...... پانی لاؤ پانی۔" ماسٹر صاحب نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پانی لانے کا کہا۔

"کیا ہوا الطاف بیٹے؟ کیا تکلیف ہے؟"

"جی ...... وہ ...... پیٹ ...... درد ......" ہم بُری طرح تڑپنے لگے۔

"اسے باہر چار پائی پر لے چلو۔" ماسٹر صاحب کے حکم پر چار لڑکوں نے ہمیں اٹھایا اور کلاس روم سے باہر لے جاکر چوکیدار کی چار پائی پر لٹا دیا۔

"جیدو بچے دوڑ کے جاؤ اور ایک کلو دودھ اور ایک سیون اپ لے آؤ شاباش جلدی آنا۔ بچے کو تکلیف زیادہ ہے۔" ماسٹر صاحب نے جیب سے پیسے نکال کر جیدو کو دیئے۔ اور جیدو چوکڑیاں بھرتا ہوا دودھ لینے روانہ ہو گیا۔

دودھ اور سیون اپ کا سن کر ہم دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔ لیکن چہرے پر تکلیف کے آثار بدستور قائم رکھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں جیدو دودھ لے کر واپس آگیا۔ ہم نے داہنی آنکھ ذرا سی کھول کر اِرد گِرد کے ماحول کا جائزہ لیا۔ ماسٹر صاحب اور لڑکوں کے چہروں سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔ اور ماسٹر صاحب کانپتے ہاتھوں سے پیالے میں دودھ انڈیل رہے تھے۔ سیون اپ دودھ میں مکس کر کے پیالہ ہمارے ہونٹوں سے لگا دیا گیا۔

"پیو ...... شاباش ...... ابھی آرام آ جائے گا۔"

دودھ پی لینے کے بعد ہم نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اور انہوں نے ہمارا سر تکیہ پر رکھ دیا۔

"بیٹے اب کیسی طبیعت ہے؟"

"جی ...... اب کچھ ...... بہتر ہوں۔" ہم نے آواز میں کمزوری غالب کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آج چھٹی کرو! الطاف کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ دو لڑکے اسے گھر چھوڑ آئیں اور کل سب ٹائم پر آجانا۔" ماسٹر صاحب یہ کہہ کر اپنے گھر کی

طرف روانہ ہوگئے۔ ہم نیم وا آنکھوں سے انہیں جاتا دیکھتے رہے۔ جوں ہی ماسٹر صاحب نگاہوں سے اوجھل ہوئے ہم نے زور دار قہقہہ لگاتے ہوئے چار پائی سے نیچے جمپ لگایا۔

"ارے یہ سب کیا تھا؟" کئی آوازیں سنائی دیں۔

"ایکشن! ...... ڈرامہ! مذاق! ...... شرارت! ...... سیفٹی پلان! ...... ہر کسی نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"یہ جو کچھ بھی تھا۔ لیکن اس ایکشن کے باعث ہم لوگ ہڈیاں تڑانے سے بچ گئے۔ ساجد ککڑ اور حمید ڈھول کے حوصلہ کو ہم سب داد دیتے ہیں۔" اشرف بولا۔

"شاباش مسٹر پلانر۔" اختر نے ہماری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے خطاب سے نوازا۔

"ویل ڈن میرے شیر۔" صابر کپکپی نے بھی ہمیں داد دی۔ کیونکہ وہ دھنائی سے بال بال بچا تھا۔ اس لئے زیادہ خوش نظر آ رہا تھا۔

"اچھا تو یہ چکر تھا!" اچانک ایک آواز نے ہمارے قہقہوں کا گلا گھونٹ دیا۔ سب نے ایک ساتھ پیچھے دیکھا۔ سامنے ماسٹر صاحب کھڑے بید لہرا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر سب کے قدموں تلے سے زمین سلپ ہو گئی اور چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ شرارت کے وہیل برسٹ ہو چکے تھے۔ سیفٹی پلان ناکام ہو چکا تھا۔

"چلو سارے کلاس روم میں۔" ماسٹر صاحب نے غصے سے بید لہرایا۔ اور ہم سب "بھیگی بلے" بنے ان کے آگے آگے چل پڑے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ چھوڑیئے جی! کیا کریں گے پوچھ کر۔ صرف اتنا بتانا کافی ہے کہ "دھنائی" کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے منقطع ہوا تھا اور کلاس ختم ہونے تک اُنیس عدد "آنکھ بند مرغے" کلاس میں موجود تھے۔ واقعی استاد، استاد ہی ہوتا ہے۔

بتایئے تو سہی کہ

○ — کیا آپ کے گھر میں قرآن پڑھا جاتا ہے؟

○ — بالغ افراد میں کتنے ہیں جو قرآن پڑھتے ہیں؟

○ — بچوں میں کتنے بچے قرآن پڑھتے ہیں؟

○ — کیا گھر میں قرآن کی آیات اور احکام پر باتیں ہوتی ہیں؟

○ — بڑوں اور بچوں کو قرآن میں سے کیا کچھ یاد ہے؟

○ — بچوں یا بڑوں میں سے قرآن کا مفہوم سمجھنے یا ترجمہ جاننے والا بھی کوئی ہے؟

○ — کیا گھر میں قرآن اور اسلام کے متعلق کچھ کتابیں موجود ہیں؟

○ — کیا قرآنی آیات یا ان کے تراجم کے کتبے دیواروں پر آویزاں ہیں؟

○ — کیا گھر کی خواتین درس قرآن میں حصہ لیتی ہیں؟

○ — اگر ان سوالوں کا جواب "نہیں" ہے تو پھر اسے "ہاں" میں بدلنے میں کوشش کیجئے۔

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوط

زاہد غنی جوہان، نارووال۔ ماہ اگست کے شمارے کی تمام تحریریں دلچسپ تھیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ عامر سہیل اور سعید انور کا تفصیلی انٹرویو شائع کریں ○ ...... بھائی! عامر سہیل کا تفصیلی انٹرویو ہم پچھلے شمارے میں چھاپ چکے ہیں ...... سعید انور سے ملاقات بھی انشاء اللہ کرادی جائے گی۔ **مختار حسین ہاشمی، اللہ آباد۔** اگست کا سرورق اچھا تھا۔ قیمت میں اضافہ پاکر خوشی ہوئی اگر آپ آنکھ مچولی کی قیمت ۲۰ روپے بھی کر دیں تو کم ہے۔ ○ ...... یہ آپ کی محبت ہے لیکن خدا نہ کرے کہ عام شمارے کی قیمت اتنی بڑھے۔ **جمشید احمد خان انصاری، کراچی۔** تازہ شمارہ بے حد پسند آیا۔ "جب خواب بکھر جائیں" "ٹی وی مکھی" "مجرم کا ہاتھ" "اور بھوک مر گئی" "فرض کی خاطر" اور "شا کا مرغی کی پٹائی" اچھی کہانیاں تھیں۔ "آمنے سامنے" اچھا سلسلہ ہے۔ **اویس یوسف زئی، اٹک۔** آج کل کاغذ کی قیمت آسمان سے باتیں کر رہی ہے اتنے بہترین شمارے کی قیمت بے شک بڑھا دیں مگر اسے بند کرنے کا خیال دل سے نکال دیجئے۔ **محمد عرفان الحق، اسلام آباد۔** اگست کا شمارہ یکم اگست کو ہی مل گیا۔ کہانیوں میں "مجرم کا ہاتھ" اور "فرض کی خاطر" اچھی لگیں "اے اللہ! مجھے شہادت نصیب کر" اور "پہیہ ایجادات کی ماں" اچھے مضامین تھے۔ **فیصل احمد صدیقی، حیدر آباد۔** "جب خواب بکھر جائیں" "مجرم کا ہاتھ" اور "مقابلہ چیخ و پکار میں اول آئے" اچھی کہانیاں تھیں۔ نظم "چودہ اگست" پسند آئی۔ **فہیم حیدر، کراچی۔** تمام شمارہ فوراً ہی پڑھ ڈالا۔ معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ **محمد حارث مقبول، کراچی۔** اگست کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ سرورق اس دفعہ بھی بہت شاندار تھا۔ جناب عبدالقادر صاحب کی نظم "پپو میاں

ایک خط ایک مسئلہ

ڈیئر انکل!

السلام علیکم

کچھ روز پہلے ہمارے ساتھ والے گھر میں ڈاکو آ گئے۔ ہمیں پتہ چل گیا۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا کیوں کہ صرف مجھے پولیس کا نمبر یاد تھا۔ خلاف معمول پولیس ایک منٹ میں پہنچ گئی مگر ڈاکو کچھ لئے بغیر ہی بھاگ گئے کیونکہ میرے ابو نے اپنے ریوالور سے فائر کر دیئے تھے اور ڈاکو سمجھے تھے کہ پولیس آ گئی ہے۔ ایک تو ہم نے نیکی کی اوپر سے پولیس والوں نے میرے ابو کو تنگ کرنا شروع کر دیا مثلاً "آپ کا ریوالور کتنے بور کا ہے؟" اور "کیا آپ کے پاس لائسنس ہے؟" ابو نے لائسنس دکھایا تو ان کے منہ لٹک گئے۔ ابو کہہ رہے تھے کہ وہ کوئی لمبا مال ہم سے ہتھیانا چاہتے تھے۔ آخر ہمارے ملک کی پولیس اتنی خراب کیوں ہے؟؟

احسن رندھاوا، حیدر آباد۔

نے دعوت اڑائی" بے حد اچھی تھی، کہانیاں سب پسند آئیں۔ **ندیم انصاری، کراچی۔** تازہ شمارہ حسب معمول بہت اچھا تھا۔ "مجرم کا ہاتھ" اور "جب خواب بکھر جائیں" بے حد پسند آئیں۔ **طلعت نظامی، راولپنڈی۔** اس ماہ کا سرورق نہایت دیدہ زیب تھا۔ "عکس ادھورے کیجئے پورے" نہایت دلچسپ سلسلہ ہے۔ **عامر شہزاد تبسم، جہلم۔** اگست کا شمارہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ تمام نظمیں کہانیاں معیاری تھیں۔ **عشرت یوسف، جمشید یوسف، کراچی۔** اگست کا سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں "وہ کیا راز تھا" بہت سنسنی خیز چل رہی ہے۔ اس دفعہ "جب خواب بکھر جائیں" "عزم کی فتح" "اور بھوک مر گئی" اور "شاکا مرخی کی پٹائی" بہت اچھی لگی، نظموں میں "میں اس کی یہ میری بہنا" اور "پپّو میاں نے دعوت اڑائی" پسند آئیں۔ **عبدالباسط، ہری پور۔** "وہ کیا راز تھا" شروع میں بہت اچھی جا رہی تھی لیکن اب اس میں غیر ضروری واقعات کو گھسیٹا جا رہا ہے۔ کہانی بور ہو گئی ہے اور ابھی تک وہیں کھڑی ہے جہاں سے چلی تھی۔ اس کہانی کو جلد ختم کریں۔ ○ ...... لیکن اکثر دوستوں میں یہ سلسلہ وار ناول بہت مقبول ہے اور ان کا اصرار ہے کہ اسے جاری رکھا جائے۔ بھلا بتایئے ہم کیا کریں؟ **عبدالرؤف، علی رشید، ملتان شہر۔** اس بار سرورق بہت خوبصورت تھا۔ کہانیاں بھی مزیدار تھیں۔ خاص نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ○ ...... یہ لیجئے آپ کا انتظار ختم ہوا۔ **عمران محمود، کراچی۔** انکل میرا خط چھاپ دیجئے ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا ○ ...... بھئی! آپ نے صرف یہ بتانے کے لئے ہمیں خط لکھا...... آنکھ مچولی کے بارے میں بھی تو کچھ لکھیئے!! **محمد راشد اقبال، کراچی۔** آپ ہمیشہ میرا آدھا خط کھا جاتے ہیں...... میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے! ○ ...... آپ کا آدھا خط ہم نہیں کھاتے وہ کھا جاتی ہے جسے ردی کی ٹوکری کہتے ہیں۔ **نیما گل، حیدر آباد۔** اس دفعہ آنکھ مچولی جلد مل گیا۔ کہانیاں سب اچھی تھیں۔ "شاکا مرخی" ہمارے سر پر سے گزر گئی جب کہ "وہ کیا راز تھا" خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ **لیاقت زماں، سوئی۔** نظم "۱۴ اگست" بہت پسند آئی۔ "مجرم کا ہاتھ" سنسنی خیز کہانی تھی۔ **ماجد لطیف، لاہور کینٹ۔** سرورق حسب روایت بہت ہی دلکش اور جاذب نظر تھا۔ عبد القادر صاحب کی نظم بہت پسند آئی جب کہ عادل منہاج کی کہانی مجرم کا ہاتھ بھی بہت اچھی لگی۔ "وہ کیا راز تھا" بالکل بور کہانی

ہے اسے جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کریں۔ **راشد عرفان (؟)** اگست کا آنکھ مچولی لاجواب تھا۔ "چار اور ایک" اور "مجرم کا ہاتھ" بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ **شہزاد صادق بٹ، راولپنڈی۔** تازہ شمارے کا جواب نہیں۔ "اے اللہ مجھے شہادت نصیب کر" "مجرم کا ہاتھ" "جب خواب بکھر جائیں" اور "مقابلہ چیخ و پکار میں ہم اول آئے" اچھی تحریریں تھیں۔ لطائف بھی پسند آئے۔ **عمران خالق، کراچی۔** اگست کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں "مجرم کا ہاتھ" "جب خواب بکھر جائیں" "اور بھوک مر گئی" "وہ کیا راز تھا" بہت اچھی لگیں لیکن لطائف پسند نہیں آئے۔ آپ لوگ زیادہ تر پرانے لطائف ہی چھاپتے رہتے ہیں۔ **نوشین شیخ، نواب شاہ۔** آنکھ مچولی اتنا اچھا رسالہ ہے کہ امی جان بھی اسے شوق سے پڑھتی ہیں۔ آنکھ مچولی کی سلسلہ وار کہانی تجسس اور مزے سے بھرپور ہے۔ **سحر، مہوش، شبنم شیخ (؟)** اگست کا آنکھ مچولی بہت اچھا تھا۔ سرورق خوبصورت، کہانیاں مزے دار خاص کر قسط وار کہانی پڑھ کر دل چاہتا ہے کہ جلدی سے اگلی قسط پڑھیں ○ ..... لیجئے تو پھر آپ جلدی سے اگلی قسط پڑھیں۔ **فوزیہ علوی، پٹارو۔** اس دفعہ سرورق ۱۴ اگست کے حوالے سے نہیں تھا۔ کہانیوں میں "جب خواب بکھر جائیں" اور "وہ کیا راز تھا" بہت اچھی تھیں۔ **اسما بدر، کراچی۔** ایک دن چھوٹا بھائی آنکھ مچولی لے کر آیا بس اس دن سے یہ میرا پسندیدہ رسالہ بن گیا ہے۔ **طاہر ناز انصاری، جہلم۔** اگست کا آنکھ مچولی پڑھ کر دل کو بہت خوشی ہوئی۔ یوم آزادی کے حوالے سے تحریریں اچھی تھیں۔ **جواہر عرف جئرام داس، کندھ کوٹ۔** اس ماہ رسالہ کچھ دیر سے ملا۔ کہانیاں سب اچھی تھیں لیکن "مجرم کا ہاتھ" بے حد پسند آئی۔ باقی سلسلے بھی اچھے تھے۔ **حسن رضا، کامرہ۔** ٹائٹل بہترین تھا، کہانیاں اچھی لگیں۔ **عابد محمود، پاک پتن۔** اگست کا شمارہ پہلے کے نسبت ذرا جلد مل گیا۔ ٹائٹل اس دفعہ شاندار تھا۔ رسالہ اول تا آخر لاجواب رہا۔ **پرنس عرفان، لنگڑیال۔** شمارہ بہترین تھا..... دوسروں کے لئے ہمارے لئے اس وجہ سے نہیں کہ ہمارا خط بنام آنکھ مچولی میں شامل نہ تھا۔ **عارف حسین، سکھر۔** اگست کا شمارہ جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح شاندار تھا۔ تمام کہانیاں پسند آئیں۔ **طارق محمود، کراچی۔** ضمیر جعفری صاحب کی نظم "سفر ہو رہا ہے" مزاح سے بھرپور تھی۔ لطائف بھی پر لطف تھے۔ **نعمان خان درانی، کوہاٹ شہر۔** "سب کا بادشاہ" اور "اندھیرے غاروں کا سفر" اچھی تحریریں تھیں۔ کہانیاں سب پسند آئیں۔ سرورق بہترین تھا۔ **محمد اعجاز، محمد محسن، جہلم کینٹ۔** جو صاحب سرورق بناتے ہیں انہیں شاید نیلے رنگ سے الفت ہے ان سے کہیے دوسرے رنگ بھی زیادہ نمایاں کیا کریں۔ **محمد شبیر، ولایت محمد، جہلم کینٹ** "وہ کیا راز تھا" نے تو مصیبت میں ڈال دیا ہے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ **محمد عقیل، محمد صدیق، جہلم۔** اس دفعہ تمام کہانیاں، لطائف اور رنگین تصاویر اچھی تھیں۔ **نائمہ شبیر، صائمہ شبیر، جہلم کینٹ۔** آپ نے قیمت میں دو روپے کا اضافہ کیوں کر دیا؟ **عثمان، ارم، راحیل، جہلم۔** آپ نے ہمارے تنقیدی خط شائع نہیں کئے ہمیں پتا چل گیا ہے کہ آپ تنقید سے ڈرتے ہیں۔ ○ ..... تنقید سے نہیں، ہمیں آپ لوگ کی ناراضگی سے ڈر لگتا ہے۔ **میاں عبدالرزاق، ملتان۔** اگست کا شمارہ بہت ہی زبردست تھا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں لاجواب تھیں۔ "چار اور ایک" "فرض کی خاطر" اور "سب کا بادشاہ" لاجواب تحریریں تھیں۔ "آخری بات" اچھی لگی لیکن رسالے کی قیمت بڑھ جانے کا تھوڑا بہت افسوس ضرور ہوا ○ آپ سے زیادہ افسوس ہمیں ہے۔ **مسرت حسین، لودھراں۔** ماہ رواں کی پہلی بات پسند آئی۔ کہانیوں میں "مجرم کا ہاتھ" "مقابلہ چیخ و پکار" "شاکا مرغی کی پٹائی" اور "وہ کیا راز تھا" اچھی کاوشیں تھیں۔ **سید شیر شاہ،**

گجرات۔ اگست کا شمارہ بہت اچھا لگا۔ "دیوار برلن" پر تصویری فیچر بہت پسند آیا۔ **قرۃ العین فخر، ہری پور۔** مہنگائی کے دور میں اتنا ستار رسالہ نکالنا بڑی ہمت کی بات ہے۔ قیمت کے اضافے کو ہم رسالے سے محبت کی وجہ سے برداشت کرلیں گے۔ **کبیر خان، شجیع الرحمٰن، بہاولپور۔** ٹائٹل بہت ہی خوبصورت تھا لطائف سارے اچھے تھے۔ کہانیاں اور نظمیں پسند آئیں۔ **منرواشیر جنگ، گجرات۔** انکل! میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ آپ میری تحریریں شائع نہیں کرتے۔ ○ ..... بھئی! آپ اچھی تحریریں ہی نہیں بھیجتیں۔ اچھی اور معیاری تحریریں بھیجئے ناں! **عامر رضا کھوکھر۔ کھاریاں۔** اگست کا شمارہ بے حد پسند آیا۔ "مجرم کا ہاتھ" "عزم کی فتح" اور "مقابلہ چیخ و پکار" جیسی تحریریں بہت پسند آئیں۔ **سید نیّر آفاق سبزواری، راولپنڈی۔** آنکھ مچولی خسارے میں جا رہا ہے یہ جان کر حیرت ہوئی کیونکہ جس رسالے کو دو تین رنگین اشتہارات مل جائیں تو اس کا خرچہ ہی نکل آتا ہے۔ ○ ..... ایسی بات نہیں ہے۔ آنکھ مچولی کے حسن اور تحفے اور لکھنے والوں کو معاوضے کی ادائیگی میں اخراجات کا خاصا دخل ہے۔ دو اشتہاروں سے خرچ کہاں پورا ہوتا ہے۔ **میر عدیل پرویز، مظفر آباد۔** انعامی مقابلے بہترین جا رہے ہیں۔ سلسلہ وار کہانی بہترین جا رہی ہے۔ بڑی بے چینی سے اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ **ایاز حسین، کراچی۔** میں ہسپتال میں ایڈمٹ تھا۔ اگست کا رسالہ وہاں پہلی بار پڑھا بہت ہی اچھا لگا۔ ○ ..... آنکھ مچولی کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ! ہماری دعا ہے کہ آپ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں (آمین) **ہما شریف، کراچی۔** اگست کا آنکھ مچولی پڑھا بہت پسند آیا۔ **محمد عامر، سلیم، لاہور۔** محمد عادل منہاج کی کہانی "مجرم کا ہاتھ" بے حد پسند آئی۔ **سہیل احمد ثاقب، کراچی۔** اگست کا شمارہ موصول ہوا۔ حسب سابق معیاری تحریروں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ **عابد انور، کراچی۔** اگست کا شمارہ عمدہ اور خوبصورت تھا۔ مضامین اور کہانیاں پسند آئیں۔ میں کچھ اسلامی مضامین ارسال کرنا چاہتا ہوں کیا وہ شامل اشاعت ہو سکیں گے؟ ○ ..... آپ مضامین بھیج دیجئے۔ معیاری اور معلوماتی ہوئے تو ضرور شائع ہو سکیں گے۔ **ایم، اے قریشی، اسلام آباد۔** اس مرتبہ پورا رسالہ جگمگ کرتی تحریروں سے بھرا پڑا تھا۔ "نئی دی نکھی" "جب خواب بکھر جائیں" "فرض کی خاطر" اور "وہ کیا راز تھا" پسند آئیں جب کہ عادل منہاج کی کہانی پہلے نمبر پر رہی۔ ، **نواب شاہ۔** "وہ کیا راز تھا" کی اور کتنی قسطیں باقی ہیں..... کیا آپ اسے کتابی صورت میں شائع کریں گے؟ **قرۃ العین جاوید، راولپنڈی۔** تازہ شمارہ ملا۔ تمام کہانیاں اچھی لگیں۔ سرورق بھی پسند آیا۔ **مظہر سلیم، بہاولپور۔** اس بار کہانیاں سب اچھی تھیں لیکن "وہ کیا راز تھا" بہت پسند آئی۔ **ہمایوں بلال، سیالکوٹ۔ عفت فاطمہ عفی، راولپنڈی۔ نیک محمد چنہ، نواب شاہ۔** آپ نے چند مہینوں سے قلم دوست میں شعر و شاعری کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، ہمیں بہت اچھا لگا۔ اس سے شعر و شاعری کا ذوق رکھنے والے طلبا و طالبات میں شاعری کا شوق پروان چڑھے گا۔ **شیر محمد، نواب شاہ۔** پہلی دفعہ خط لکھ رہا ہوں امید ہے ضرور چھاپیں گے۔ **محمد زاہد سلیم، کراچی۔** اب آپ "دوستی نمبر" نکالئے اور وہ بھی عید کے مہینے میں تاکہ ہم دوستوں کو تحفے میں دے سکیں!! ○ ..... تجویز بہت اچھی ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔ **محمد عرفان، پنڈی گھیب۔** اس دفعہ لطائف کچھ خاص نہ تھے۔ "وہ کیا راز تھا" بہت اچھی جا رہی ہے۔ **محمد مقیم جلبانی، مسوڈیرو۔** آنکھ مچولی میرا پسندیدہ رسالہ ہے اور سائنسی کالم تو مجھے بہت ہی پسند ہے۔ **انیل عباس جلبانی، مسوڈیرو۔** اس مرتبہ "ماہ رواں کی پہلی بات" نے بے حد متاثر کیا۔

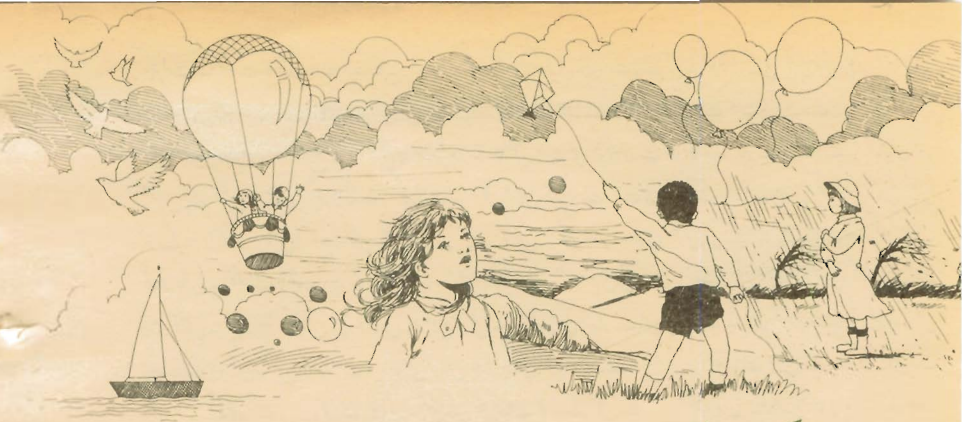

ہوا

افق دہلوی

ہوا ہر جگہ گو کہ موجود ہے
نظر سے ہماری یہ مفقود ہے
ہوا میں بس اک خاص ترکیب سے
ملی ہیں کئی گیسیں ترتیب سے
ہوا میں نہ بو ہے نہ ہے ذائقہ
عجب چیز ہے یہ ہوا بے مزہ
ہوا میں ہیں آبی بخارات بھی
انہی سے ہے رہتی ہوا میں نمی
جگہ گھیرتی ہے ہوا ہر جگہ
وزن ڈالتی ہے برابر ہوا
ہوا میں ہے موجود کافی لچک
ربڑ کی جبھی گیند میں ہے پچک
ہوا ڈالیں گر ہم کسی چیز میں
سما جاتی ہے یہ اسی چیز میں
سمندر میں کشتی چلاتی ہے یہ
پہاڑوں کو ریزہ بناتی ہے یہ
اڑا دیتی ہے بادلوں کو ہوا
اسی کے اثر سے ہے آتی گھٹا
جو چلتی ہے آندھی کی رفتار سے
تو ٹکراتی ہے در سے دیوار سے
ہوا گر نہ ہو کوئی زندہ نہ ہو
بشر کیا، چرندہ، پرندہ نہ ہو
جہاں کچھ نہیں ہے وہاں ہے ہوا
غلاف اس کا ہر سو ہے پھیلا ہوا
ہوا پر ہی ٹھہری ہے یہ کائنات
حقیقت میں دنیا ہے یہ بے ثبات
نہیں مانتے جو وجودِ خدا
افق وہ دکھا دیں بنا کر ہوا

تحریری مباحثہ

پڑھائی کے لیے پٹائی ضروری ہے

ادارہ

ادارہ آنکھ مچولی نے چند ماہ قبل اس موضوع پر ایک تحریری مباحثے کا اعلان کیا تھا۔ ساتھیوں نے اس مباحثے میں نہایت جوش و خروش سے حصہ لیا۔ چند مضامین تو اتنے زخم خوردہ تھے کہ پڑھنے سے محسوس ہو رہا تھا کہ پٹائی کا اثر طبیعت پر اب تک ہے۔ ادارے کو موضوع پر ایک سو سے زائد مضامین موصول ہوئے۔ تحریری مباحثے کے منصفین نوجوان ادیب و صحافی جناب سہیل احمد صدیقی اور آنکھ مچولی کے مدیر اعزازی تھے۔ ان کے فیصلے کے مطابق پہلا انعام محمد بن مالک (کراچی) دوسرا انعام سہلہ فیاض (چکوال) اور تیسرے انعام کے مستحق طارق رفیق بھٹی (اوکاڑہ) قرار پائے ہیں۔ ان کے مضامین شائع کئے جارہے ہیں۔ ادارہ انعام یافتگان کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

پہلا انعام یافتہ مضمون

موافقت

محمد بن مالک

پڑھائی کے لئے "پٹائی" ضروری ہے۔

بلاشبہ یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت سے وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو یاتو "پڑھ" نہیں سکے، یا پھر پڑھنے کے دوران کچھ زیادہ ہی پٹ گئے ان "منکرین" کی ایک تیسری اور سب سے بڑی قسم بھی ہے جس کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔

سب سے پہلے تو پڑھائی سے قطع نظر، عام زندگی میں پٹائی کی اہمیت کا اندازہ کر لینا چاہئے۔ پٹائی صرف بچوں کے لئے ہی ہوتی ہے، کیونکہ انہیں بُرے بھلے کی تمیز یا شعور نہیں ہوتا۔ ان کے سرپرست اور والدین انہیں یہ شعور دلانے کے لئے ہی انہیں سمجھاتے بجھاتے ہیں، ڈانٹتے بھی ہیں اور بالآخر پٹائی بھی کر دیتے ہیں۔ پٹائی کی نوبت اسی وقت آتی ہے جب ان پر پیار سے سمجھانے اور ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ کا کوئی اثر نہیں ہو پاتا۔ ظاہر ہے کہ وہ انسان کے ہی بچے ہیں جس کی سرشت میں ضد اور سرکشی ہے، جو فطری طور پر سزا سے ہی قابو میں آتی ہے۔ بچہ پٹائی اور سزاؤں کے خوف سے والدین کا کہا ماننے لگ جاتا ہے اور پھر جوں جوں وہ بڑا اور باشعور ہوتا جاتا ہے، اسے یہ احساس ہوتا چلا جاتا ہے کہ محبت کرنے والے والدین اسے بلاوجہ نہیں مارتے پیٹتے تھے۔ اس طرح اس کی ابتدائی تربیت اس کی ساری زندگی کے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ گویا پٹائی بچے کی تربیت کا لازمی جزو ہے۔

یہی کچھ اس وقت ہوتا ہے جب بچے کا تعلیمی کیریئر شروع ہوتا ہے۔ بچے کو علم کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ بقول شخصے اس کی کھیلنے کودنے کی عمر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا دھیان اور دلچسپی بھی ان چیزوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ پڑھنے لکھنے میں اسے کوئی مزا نہیں آتا۔ نہ ہی اس میں کوئی فائدہ نظر آتا ہے۔ بلکہ ایک بوجھ سا محسوس ہوتا ہے۔ والدین اور اساتذہ اسے پیار سے سمجھاتے ہیں۔ پڑھائی کے فائدے گنواتے ہیں، اپنی مثالیں دے کر سمجھاتے ہیں کہ دیکھو ہم پڑھ لکھ کر ہی اس مقام تک پہنچے ہیں۔ بچہ کبھی جوش اور کبھی بد دلی کا مظاہرہ کرتا ہے جس پر اسے کبھی کبھار ڈانٹ بھی پڑ جاتی ہے۔ لیکن صرف ڈانٹ سے اس کا بھلا کیا بگڑتا ہے، وہ اپنی جگہ "ثابت قدم" رہتا ہے۔ مجبوراً اساتذہ کو اس کی پٹائی لگانا پڑتی ہے کہ تمہارے لئے پڑھے بنا چارہ نہیں۔ اگر شوق سے نہیں پڑھتے تو پٹائی کے خوف سے ہی پڑھو، مگر پڑھو ضرور۔ اس موقع پر یہ پٹائی اس کے لئے گویا ایک ٹانک ثابت ہوتی ہے۔ (کڑواہی سہی) جس کی اگر بروقت "ڈوز" نہ دی جائے تو اس کی تعلیم کی بنیاد ہی کمزور رہ جائے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً موقع کی

مناسبت سے اسے "خوراکیں" ملتی رہتی ہیں۔ (جن کا موقع وہ خود اپنی حرکتوں سے فراہم کرتا ہے) اور اس طرح وہ ان پٹائیوں کی بھٹی میں تپ تپ کر کُندن بن جاتا ہے۔

یہ بات ہرگز نہیں ہے کہ والدین کو اپنی اولاد یا اساتذہ کو اپنے شاگردوں کی پٹائی لگا کر مزا آتا ہے یا دلی سکون نصیب ہوتا ہے۔ بلکہ وہ اپنی پیار بھری نصیحتوں کو رائیگاں جاتے دیکھ کر بادلِ ناخواستہ "مولابخش" کا سہارا لیتے ہیں۔ اس ضمن میں دی جانے والی سزائیں مثلاً مرغا بنانا، اٹھک بیٹھک وغیرہ بھی پٹائی کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان سب پٹائیوں اور سزاؤں وغیرہ سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ طالبِ علم سدھر جائے اور راہِ راست اختیار کر لے۔ ورنہ آپ خود ہی سوچئے کہ کیا اساتذہ کو اپنے شاگردوں سے کوئی دشمنی ہوتی ہے؟ اگر ایسی بات ہوتی تو پھر تو وہ اپنے تمام شاگردوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے، جس میں نکمے طالب علم بھی پٹتے رہتے اور ہونہار بھی۔ اگر خراب طالب علم اساتذہ کے زیرِ عتاب رہتے ہیں تو اچھے طالب علم ان کے منظورِ نظر بھی تو ہوتے ہیں۔

ہر بچہ اپنے مزاج اور فطرت کے لحاظ سے دوسرے بچے سے مختلف ہوتا ہے۔ کوئی سیدھا سادا اور کم گو ہوتا ہے اور کوئی شریر اور چلبلا۔ سیدھے سادے بچے تو خیر نرم الفاظ سے ہی رام ہو جاتے ہیں لیکن سب بچے تو سیدھے سادے نہیں ہوتے! اکثر شرارتی بچے تو پٹائی سے بھی بڑی مشکل سے قابو میں آتے ہیں، کجا یہ کہ ان کو مسلسل ڈھیل ملتی رہے۔ ایسے بچوں کو جب ان کے تعلیمی نکمے پن اور نافرمانیوں پر کچھ نہیں کہا جاتا، محض "پیار سے" سمجھا دیا جاتا ہے تو یہ مزید شیر ہو جاتے ہیں اور اپنی نافرمانیوں میں حد سے بڑھ جاتے ہیں کیونکہ ان کو کسی بات کا ڈر نہیں ہوتا۔ نتیجتاً پڑھائی میں یہ کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ارد گرد نظر دوڑائی جائے تو اسی فطرت کے بچے زیادہ تر نظر آتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کو معلوم ہونا چاہئے کہ بچوں پر ہمیشہ ایسی سمجھانے والی باتیں اور پند و نصائح اثر نہیں کرتے کیونکہ بچے نادان ہوتے ہیں اور نادان پر کلام نرم و نازک بے اثر ہوتا ہے۔

کچھ "مدعیان علم" غالبًا اپنے "علمی کاروبار" کی دکان چمکانے کے لئے یہ نعرہ بلند کرتے ہیں کہ ہم بچوں پر پڑھائی کے نام پر ظلم و تشدد کے خلاف ہیں۔ ہم ان معصوم پھولوں کو پیار و محبت کے ساتھ تعلیم دینے کا حامی ہیں، وغیرہ وغیرہ .... جس چیز کو یہ لوگ مبالغے سے کام لے کر ظلم و تشدد قرار دیتے ہیں، آج کے طالب علم کی بہتری اسی میں پوشیدہ ہے۔ سچ کی طرح یہ سزائیں اور پٹائیاں بھی کڑوی معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کے ذریعے طالب علم کا ناتا پڑھائی سے جڑا رہتا ہے۔ پھر جب آگے چل کر ان پٹائیوں کا مثبت نتیجہ نکلتا ہے تو اسے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اعتدال ہر چیز میں اچھا

ہے۔ نہ تو ایسا ہو کہ بچوں کو پڑھائی میں تساہل برتنے پر کچھ کہا ہی نہ جائے اور نہ ایسا ہو کہ بچوں کو بات بے بات ڈراتے دھمکاتے رہا جائے اور معمولی معمولی باتوں، جیسے ہوم ورک مکمل نہ کرنے یا سبق یاد نہ کرنے پر کڑی سزائیں دی جائیں یا پٹائی لگائی جائے بلکہ درمیانی راہ نکالی جائے یعنی نصیحت کے وقت نصیحت اور پٹائی کے وقت پٹائی یا سزا۔ اور پٹائی بھی ایسی نہ ہو کہ طالب علم صاحب فراش ہی ہو کر رہ جائے۔ انتہا پسندی اور زیادتی ہر حال میں نامناسب ہیں۔ یہ ایک اچھے استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ محسوس کرے کہ کب اسے اپنے شاگرد کو سزا دینی ہے اور کب معاف کر دینا ہے۔ پٹائی ایک مصلح کی مانند ہوتی ہے جو طالب علم کی بروقت اصلاح میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ درحقیقت تعلیم کے سلسلے میں پٹائیوں اور سزاؤں کی اہمیت سے سبھی واقف ہیں مگر آج کی ترقی سند بلکہ سہل پسند ذہنیت کا کیا کیا جائے کہ انقلاب زمانہ اور نئے نظام کو متعارف کرانے کی کوشش میں بظاہر ان چیزوں کی اہمیت سے انکاری ہے۔ حالانکہ اس ذہنیت کے علمبردار خود ان مراحل سے گزر کر اونچے اونچے مقامات تک پہنچتے ہیں...... اور وہی کیا جتنے بھی لوگ آج بلند بلند عہدوں اور منصبوں پر فائز ہیں ان میں سے بھی کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو گا جس نے اپنے تعلیمی کیریئر میں کبھی مار نہ کھائی ہو۔ چلئے، پٹائی کی اہمیت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک بچہ آپ کے پاس پڑھنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ بچے کو پڑھنے کا بالکل شوق نہیں، وہ چوبیس گھنٹے بس کھیلتے رہنا چاہتا ہے۔ آپ اسے مختلف طریقوں اور ہتھکنڈوں سے پڑھانا چاہتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوتا، بلکہ (جدید نسل کا پروردہ ہونے کے ناتے) تاڑ جاتا ہے کہ آپ اسے کھیل ہی کھیل میں پڑھانا چاہتے ہیں، چنانچہ وہ آپ کے ساتھ کھیلنے سے بھی انکار کر دیتا ہے۔ آپ اسے پیار سے چمکارتے پچکارتے ہیں، سمجھاتے ہیں، پڑھنے کے فائدے بتاتے ہیں لیکن بچہ آمادہ نہیں ہوتا۔ آپ ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکیوں پر اتر آتے ہیں، مگر سب بے سود اب آپ ہی بتایئے کہ آپ کے پاس کیا راستہ رہ جاتا ہے؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ ان کی نافرمان قوم پر نو دفعہ عذاب آیا۔ ہر مرتبہ یہ عذاب موسیٰ علیہ السلام کی دعاؤں سے ٹل جاتا کہ شاید یہ قوم اب سدھر گئی ہو۔ مگر وہ سدھرنے والی نہ تھی۔ آخر کار ان کی قوم فرعون سمیت دریائے نیل میں غرق ہو گئی۔ اگرچہ یہ ایک انتہائی نافرمان اور بدترین قوم کا حال تھا، مگر اس سے یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان جب نافرمانی پر اتر آئے تو اسے سزا دینا لازمی ہو جاتا ہے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی سنت ہے اور اللہ نے اس کے ذریعے انسان کو نافرمانیوں پر سزا دینے کی تربیت دی ہے، چہ جائیکہ یہ نافرمانیاں تعلیم کے سلسلے میں ہوں، جن کا حصول بطور مسلمان ہم سب پر فرض ہے..........!

دوسرا انعام یافتہ مضمون

مخالفت

سہیلہ فیاض، چکوال

میں جانتی ہوں جبینوں پہ بل پڑینگے مگر
زباں کا قرض ہے آخر ادا تو ہونا ہے

جی ہاں جناب صدر!!

یقیناً میرے مخالفین کی جبینوں پر بل ضرور پڑیں گے کہ جن کی آنکھوں پر ایسی بے رحم پٹی پڑی ہوئی ہے کہ نہ توانہیں اپنے پیارے بھانجے، بھتیجے نظر آرہے ہیں اور نہ ہی ان کی نظریں اپنے ننھے بھائی، بہنوں پر پڑ رہی ہیں۔ بلکہ وہ نہایت سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایوان کی رائے کی حمایت کر رہے ہیں۔

صدر محترم!

ایوان کا کہنا ہے کہ "آج کا طالب علم شوق سے نہیں خوف سے پڑھتا ہے۔ اس لئے پٹائی ضروری ہے۔" میں تو یہ دلیل سن کر محض کفِ افسوس مل سکتی ہوں۔ کیا میرے مخالفین اس بات کا جواب دے سکتے ہیں کہ یہ خوف بچوں میں کس کا پیدا کردہ ہے؟ کیونکہ میرے خیال میں وہ اس قسم کا کوئی خوف دل میں لے کر اس دنیا میں نہیں آتے اور نہ ہی یہ ان پر اوپر سے نازل کیا گیا ہے۔ درحقیقت انہیں پڑھائی سے متنفر کرنے اور ان میں علم سے خوف پیدا کرنے میں اساتذہ معاشرے اور والدین کا ہاتھ ہے۔

جناب والا!

والدین اپنے بچوں کو بھاری فیسیں ادا کر کے شاندار اسکولوں میں تعلیم دلواتے ہیں۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے لاپرواہو جاتے ہیں۔ والدین کی بے توجہی بچوں کو تعلیم سے غافل کر دیتی ہے اور پھر جب وہی والدین اپنے بچوں کی ڈائریاں شکایات سے پُر دیکھتے ہیں تو مشتعل ہو کر بچوں کو دُھن کر رکھ دیتے ہیں۔ مجھے بتایئے کہ کیا یہ چیز بچوں میں پڑھائی کا خوف پیدا کرنے میں معاون نہیں؟؟

کچھ تم ہی بتاؤ چارہ گرو
ہم درد کا درماں کیا کرتے

صدرِ ذی وقار!

آج یہ بات کثرت سے دیکھنے میں آتی ہے کہ اساتذہ مجبوراً یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ قابل طلباء میڈیکل، انجینئرنگ اور دیگر اعلیٰ شعبوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن جس کو اس کی نااہلی کے سبب کوئی ملازمت نہیں ملتی وہ پی ٹی سی کورس کر کے استاد کہلاتا ہے۔ اس طرح استاد اپنے رجحانات کے خلاف اس پیشے کو اختیار کرتا ہے۔لہٰذا وہ صحیح طور پر اپنا فرض ادا کرنے اور معمول کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لائق فائق اور قابل اساتذہ اور پڑھے لکھے والدین بچوں کو مارنا پسند نہیں کرتے تو یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہمدردی اور نرم دلی کا تعلق علم و مرتبے سے زیادہ انسانیت سے

ہے۔ اور سنگ دلی تو صرف ایک جذبۂ حیوانیت ہے۔

صدرِ محترم!

طلبا تو مسافر ہیں اور تعلیم کے اس سفر میں اساتذہ ان کے راہنما۔ جب سال بھر کی مسافت و مشقت کے باوجود طلبا کو اپنی منزل کا سراغ نہ ملے تو اس میں قصور رہرو کا نہیں رہنما کا ہے۔

کوئی تو سمجھے میرے کرب کا لب و لہجہ
یہ آرزو ہے مجھے کوئی ہم زباں تو ملے

صدرِ گرامی!

طالب علم کا ذہن اپنے بڑوں (خصوصاً اساتذہ اور والدین) کے کردار و اخلاق کو اپنانے کی لاشعوری کوشش کرتا ہے۔ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ اگر آج کا طالب علم گستاخ ہے، علم کی تقدیس کی دھجیاں اڑاتا ہے تو اس میں قصور کس کا ہے؟؟ اس دور کے طالب علم کو اگر راستہ کی کجی ملی ہے تو اس کے ذمہ دار صرف بڑے ہیں۔

یوں جنابِ صدر!

آج کے اساتذہ اور والدین معمارِ قوم کا کردار ادا نہیں کر رہے۔ وہ ہاتھ جنہیں قوم کی معصوم کلیوں کو پھول بنانا تھا اپنے ہی ہاتھوں سے انہیں مسل رہے ہیں۔ ایوان کی حمایت میں بولنے والے، طالب علم کو قصور وار ٹھہرا رہے ہیں، مگر طالب علم تو خام لوہے کی مانند ہے۔ جس سانچے میں ڈھالیں گے ڈھل جائے گا۔ وہ ایک ایسی نرم اور زرخیز زمین کی مانند ہیں جس سے آپ اپنی مرضی کی ہر فصل پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کے ذہن میں تشدد اور غصے کے بیج بوئیں گے تو جواباً آپ کو بھی گستاخی اور بے ادبی کا پھل ملے گا۔

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔ "پس تم خوشخبری دو اور "تنگی" نہ کرو۔" ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں سے اس قدر پیار تھا کہ وہ راستے میں کوئی بچہ دیکھ لیتے تو اسے پیار کرتے تھے اور ساتھ ہی فرماتے تھے "تم تو ایک پھول ہو۔" چنانچہ مسلمان ہونے کے ناطے بھی ہمیں ایک پھول جیسے نرم و نازک بچے کو زدو کوب کرنے کا کوئی حق نہیں۔

یہ تو ایک فطری بات ہے جس کا عام مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور کسی بھی ماہر نفسیات سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا ایسا بچہ جس کو علم کا ایک ایک لفظ ڈنڈے کے زور پر پڑھایا جائے، اس بچے کی مانند خود اعتمادی اور حوصلے سے اپنا علمی سفر جاری رکھ سکتا ہے، جس کے اساتذہ اور والدین نے اس کی نفسیات سمجھ کر پیار سے تعلیم دی ہو؟؟؟ نہیں! ہر گز نہیں۔ کم از کم آج کے دور میں، میں ایسا ہونا ممکن نہیں سمجھتی۔

جنابِ والا!

میں ان دلائل کی رو سے اپنے کو برحق سمجھتی ہوں اور صرف یہی کہہ سکتی ہوں!

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے،
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

تیسرا انعام یافتہ مضمون

مخالفت

طارق رفیق بھٹی، اوکاڑہ۔

ڈنڈے کا استعمال کسی بھی طرح کسی بھی قسم کے طالب علم کے لئے ایک بُری چیز ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کا طالب علم شوق سے نہیں خوف سے پڑھتا ہے لیکن یہ خوف پیدا کرنے والا کون ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہم سب کو معلوم ہے۔ "روسو" کے مطابق تو تعلیم فطری ماحول میں بچے کی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما کا نام ہے۔" لیکن کیا آج کا اسکول اور استاد بچوں کو فطری ماحول مہیا کرتا ہے؟ ہرگز نہیں ...... کیونکہ بچے اسکول جاکر یہ خیال کرتے ہیں جیسے کسی جیل میں آگئے ہوں۔ بچوں کو اظہار خیال کی کوئی آزادی نہیں ہے۔ اگر کوئی فطین بچہ استاد سے سوال کرتا ہے تو استاد اس کے سوال کو اہمیت نہیں دیتا اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کر بٹھا دیتا ہے۔ اس طرح بچہ آئندہ سے اس خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اگر پھر سوال کیا تو استاد مارے گا اور اسی خوف کی وجہ سے بچے کی صلاحیتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ اساتذہ کا یہ رویہ "پرسی نن" کی تعریف کی نفی کر دیتا ہے "تعلیم سے مراد بچے کی انفرادیت کو کمال کے درجے تک پہنچانا ہے۔"

بچے، استاد یا ڈنڈے کے خوف سے سبق یاد تو کر لیتے ہیں لیکن یہ ایک ناقص طریقِ تعلیم ہے کیونکہ اس طرح بچے کی سبق میں عدم دلچسپی سے وہ مقاصد حاصل نہیں ہو پاتے جو تعلیم کا خاصہ ہیں۔ تعلیم تو بچے کی جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی، جمالیاتی اور معاشرتی نشوونما کا نام ہے۔ لیکن ڈنڈے کے خوف سے بچے میں نشوونما نہ ہونے کی برابر ہوتی ہے۔ اس وقت تک بچے کو کوئی چیز نہیں سکھائی جا سکتی جب تک کہ وہ سیکھنے پر آمادہ نہ ہو۔ اور بچے کو آمادہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی خواہشات کا خیال رکھا جائے۔ اگر بچوں کو اسکول میں گھر جیسا ماحول دیا جائے تو بچے خوف سے نہیں شوق سے پڑھیں گے۔ ڈنڈے کی مدد سے تو جانور سدھائے جاتے ہیں۔ اگر بچوں کو بھی ڈنڈے کے ذریعے تعلیم دی جاتی رہے تو جانور اور بچوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ دوسرے ممالک میں بچے شوق سے کیوں پڑھتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچوں کو گھر جیسا ماحول فراہم کرتے ہیں۔ وہ بچوں کو کھیل ہی کھیل میں پڑھاتے ہیں۔ بچوں کے فطری تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ ڈنڈا نام کی کوئی چیز ان کے ہاں نہیں ہے۔

المختصر میرے خیال میں ڈنڈے کے ذریعے بچوں کو تعلیم دینا ایک ناقص تعلیم دینے کے مترادف ہے کیونکہ اسی ڈنڈے کی وجہ سے اکثر بچے اسکول سے کنارا کر جاتے ہیں۔

استاد محنت سے بچنے اور اپنی کم علمی کو چھپانے

کے لئے "مولا بخش" کا سہارا لیتے ہیں۔
یہ حقیقت ہے کہ اساتذہ بچوں پر اپنا خوف بٹھانے کے لئے ڈنڈے کا استعمال کرتے ہیں۔ بچہ جب پہلے دن اسکول جاتا ہے تو اس کے لئے یہ ایک نیا ماحول ہوتا ہے۔ وہ گھر جیسی بارونق جگہ کو چھوڑ کر ایک انجانی جگہ آتا ہے۔ اس وقت اس کا ذہن ایک صاف سلیٹ کی طرح ہوتا ہے کہ جو اس پر لکھا وہ نقش ہو گیا۔ یہ وقت بچے کے لئے بہت قیمتی ہوتا ہے کیونکہ اس وقت جو کچھ وہ سیکھتا ہے ساری زندگی اس پر عمل کرے گا۔ اس لئے یہاں اساتذہ کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ پرائمری سطح پر ایسے استاد ہوتے ہیں جو خود ایک درخواست بھی نہیں لکھ سکتے وہ ننھی کونپلوں کی آبیاری خاک کریں گے اور اسی وجہ سے اپنی کم علمی چھپانے کے لئے بچوں پر اپنا خوف قائم کر دیتے ہیں۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ بچے خوف کی وجہ سے اپنی جگہ پر ہی پیشاب کر دیتے ہیں لیکن استاد کو نہیں بتاتے کہ پیشاب آیا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے صبح اسکول آنے سے پہلے رونا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اسکول نہیں جانا، ماسٹر صاحب مارتے ہیں۔ بچوں پر اگر استاد کا اتنا خوف طاری ہو گا تو وہ خاک پڑھیں گے۔

"ارسطو" کے نزدیک تعلیم بچے میں نیکی اور عمدہ اخلاق پیدا کرنے کا نام ہے۔" لیکن آج کا استاد بچے میں یہ اوصاف پیدا کرنے میں ناکام ہے۔ بچے استاد کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کی وجہ سے کوئی سوال کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اگر کوئی سوال کر بھی لے تو استاد صاحب فرماتے ہیں میرے سر میں درد ہے کل بتاؤں گا۔ یہ ہمارے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ملک ترقی کرے تو ہمیں ابتدائی تعلیم پر بہت زور دینا ہو گا۔ پرائمری اسکولوں میں ایسے تربیت یافتہ اساتذہ کو لگنا ہو گا جو بچوں کی خواہشات کا احترام کریں انہیں کھیل ہی کھیل میں سبق پڑھائیں۔ جدید تدریسی طریقوں سے بچوں کو پڑھائیں۔ بچوں کی رائے کو اہمیت دیں۔ کیونکہ جدید نظریۂ تعلیم میں بچوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اساتذہ ڈنڈے سے نہیں پیار سے بچوں کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو اجاگر کریں۔ اور مولا بخش کے خوف کو دلوں سے دور پھینک دیں۔

تحریری مباحثے میں حصہ لینے والوں کا نام

درویش خان، پشاور۔ محمد صابر، کراچی۔ محمد نوید شہزاد، مردان۔ صائمہ نادر حسن، حیدر آباد۔ سیما مستنصر باللہ (؟) عبدالوہاب، رحیم یار خان۔ سید حسن احمد زیدی، کراچی۔ سیدہ قرۃ العین حسن نقوی، کراچی۔ سیدہ رافعہ الیاس (؟) رفیق شاہ، پاک پتن۔ سید مقداد علی، لاہور۔ حنا محمد یحییٰ، کراچی۔ محمد طلحہ اقبال، کراچی۔ نورین فاطمہ چوہان، بہاولپور۔ فاروق

حسن چانڈیو، کراچی۔ نعمان محمود کاشمیری، گوجرانوالہ۔ ایم سرور مرزا، گوجرانوالہ۔ عبدالقدیر انڈھڑ، پنو عاقل۔ سید وقار حیدر، راولپنڈی۔ سید علی عظیم، کراچی۔ عامر آفتاب، کھوٹہ۔ نشاط رینہ، ملتان۔ سید ناصر محمود گیلانی، کھوٹہ۔ سدرہ صباح، لالہ موسیٰ۔ مجاہد حسین، کراچی۔ محمد اطہر حسین، حاصل پور۔ مدثر سجاد، ہری پور۔ فرحین طاہر شمسی (؟) ملیحہ ثانیہ سحرش، واہ کینٹ۔ سید سجاد حیدر کریم شاہی، گجرات۔ نازیہ جبین ردا، اسلام آباد۔ عائشہ انیس، راجن پور۔ نصراللہ خان، منڈی بہاءالدین۔ نادیہ، لاہور۔ بشیراحمد بھٹی، بہاول پور۔ مدیحہ بخاری، کراچی۔ عائشہ ہمدان، کراچی۔ عمران مجید، کراچی۔ ذیشان ندیم، رحیم یار خان۔ بتول فاطمہ، کراچی۔ سید راحت حسین نقوی، کراچی۔ صوفی میڑاد، اٹک۔ قاسم بن نظر، کراچی۔ عامر اعجاز، ڈنگہ۔ سید محمد احسن، کراچی۔ سیدہ مریم سعدیہ شعیبی، محمد راشد اقبال، کراچی۔ خرم مصطفےٰ جان، سرگودھا۔ طارق فاروق، بھکر۔ شاہد اقبال نواب شاہ۔ نازلی رضا (؟) رزتاش سعود (؟) ماہ بانو سید، ایبٹ آباد۔ شمائل شکیل، کراچی۔ اسما حسن، کراچی۔ اویس انیس، جام پور۔ خرم طارق جگنو، گوجرانوالہ۔ سید اقبال جمیل، کراچی۔ سیدہ مریم جعفری، کراچی۔ صائمہ اختر فاروقی، کراچی۔ عابد انور، کراچی۔ محمد امین، کراچی۔ ابو ذر غفاری، کوٹ ادو۔ صوفیہ رحمٰن، مردان۔ صباحت بتول، واہ کینٹ، سید حسین عباس ہمدانی، ناصر آفتاب، خالد محمود، کھوٹہ۔ زاہد حسین ابڑو، عمر کوٹ۔ عبدالحمید شیخ، نوشہرو فیروز۔ قیصر بشیر، اوکاڑہ۔ سعدیہ یاسمین، راولپنڈی۔ نثار احمد ہاشمی، کراچی۔ اسما اقبال، کراچی۔ زاہدہ عبدالرشید، کراچی۔ شبانہ زمان، ہری پور۔ سجاد حسین، پشاور۔ ثمینہ یاسمین، کراچی۔ زیب النساء، لاہور۔ محمد افضل ساگر، مچھ بولان۔ حماد الرحمٰن، کلور کوٹ۔ محمد امین جہلم، محمد عبدالسلام، کراچی۔ نوید احمد گوشی، وزیر آباد۔ ازکیٰ اسلام گل، ملتان۔ عین الحق مبین، کراچی۔ چودھری فیصل، اوکاڑہ۔ نسیم اختر، منڈی بہاءالدین۔ سید علی عمران زیدی، حیدر آباد۔ خورشید انور، کراچی۔ مرتضیٰ رضوی، کراچی۔ عمران احمد، حیدر آباد۔ نعیم شریف، کراچی۔ عنبرین سلطانہ، ربوہ۔ منوج کمار، حیدر آباد۔ سحر خالد، گجرات۔ نائلہ نبی، اسکردو۔ فہد آفتاب، کراچی۔ ثمن زہرہ، کراچی۔ رفعت سلطان جان، ایبٹ آباد۔ محمد شکیل، حیدر آباد۔

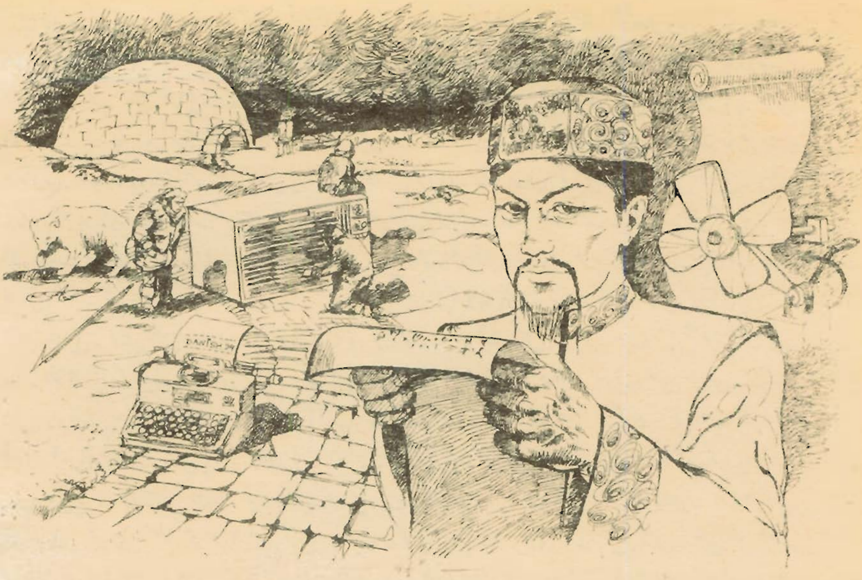

عقل کے کرشمے

یاسر اعجاز

انسان نے شعور کی آنکھ کھولی تو یہ دنیا اسے بہت بڑی محسوس ہوئی۔ اور یہاں کے مسائل بھی اسے خاصے پریشان کر دینے والے لگے۔ لیکن پھر اس نے اپنی عقل کی مدد سے ان مسائل پر قابو پانا شروع کیا۔ ذیل میں ان مسائل سے بچنے اور ان پر قابو پانے کے طریقے درج کئے جارہے ہیں جو انسان نے پہلے پہل اختیار کئے۔ اور ساتھ ہی چند ایجادات کا بھی ذکر کیا جارہا ہے۔ ان سے انسان کی ابتدائی ترقی کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔

لوگ پہلے گرمی سے کیسے بچتے تھے؟

ابتدا میں جب گرمی کا موسم آتا تھا تو ہندوستانی، یونانی اور رومی باشندے اپنے گھروں کے دروازوں پر گیلے کپڑے لٹکالیا کرتے تھے چنانچہ عمل تبخیر سے گھروں کے اردگرد کی ہوا ٹھنڈی ہو جاتی تھی اور یوں وہ دھوپ کی تپش اور لو کے تھپیڑوں سے بچ جاتے تھے۔ جنوبی افریقہ میں صحرائے کالاہاری کے لوگ ٹھنڈی گھاس اور جھاڑیوں سے بنے گھروں میں رہتے تھے۔ شمالی

نائجیریا کے لوگ مٹی کے بنے ہوئے گھروں میں رہتے تھے جبکہ جنوبی آسٹریلیا کے لوگ زیرِ زمین رہتے تھے۔ ۱۵۰۰ء میں اٹلی کے لی نارڈو ڈاونشی نے پہلا پنکھا ایجاد کیا۔ ۱۵۵۳ء میں انگریز زمین کے اندر کانوں میں پنکھے استعمال کرتے تھے۔

پہلے لوگ سخت سردی سے کیسے بچتے تھے؟

انتہائی سرد موسموں میں لوگ جانوروں کی کھالوں سے لباس تیار کر لیتے تھے اور پھر اسے پہنتے تھے اور آگ سینکتے تھے۔ اس کے علاوہ پتھر اور لوہے کے آتش دان بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ کینیڈا کے منجمد خطوں میں رہنے والے اسکیمو، سردیوں میں "اگلو" یا برف کے گھروں میں رہتے تھے۔ وہ برف کے بلاکوں سے گنبد نما مکان بنا لیتے تھے۔ اس کے اندر ایک تیل والا لیمپ جلایا جاتا تاکہ حرارت اور روشنی حاصل ہو سکے۔

سب سے پہلا ایئر کنڈیشنر کس نے بنایا؟

۱۹۰۲ء میں ایک امریکی "ولس کیریئر" نے ایئر کنڈیشنر ایجاد کیا۔ ایئر کنڈیشنر ہوا کو ٹھنڈا یا گرم کرتے ہیں وہ ہوا سے نمی لیتے ہیں یا ہوا میں نمی کا اضافہ کرتے ہیں، ایئر کنڈیشنر فضا کی صفائی بھی کرتے ہیں۔ "بالی مور" اور "ارہیوریل روڈ" نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں امریکہ میں ایئر کنڈیشنر کو ٹرینوں میں استعمال کیا جبکہ ۱۹۴۰ء میں اسے بسوں اور ۱۹۵۰ء کے عشرے میں کاروں میں استعمال کیا گیا۔

سب سے پہلے سڑک کس نے بنائی؟

چینیوں نے ۲۷۰۰ قبل مسیح میں سڑکیں بنائیں۔ امریکیوں نے کوہ اینڈیز کے ساتھ ساتھ شمالی امریکہ میں ۴۸۰۰ کلو میٹر لمبی سڑک بنائی۔ رومیوں نے بھی ۸۰،۰۰۰ کلو میٹر لمبی سڑکیں بنائیں۔ ۱۸۱۵ء میں ایک سکاٹ، "جان میک ایڈم (John Me Adam)" نے ایک خاص سخت سطح والی سڑک بنائی۔

سب سے پہلے کاغذ کس نے ایجاد کیا؟

کاغذ چینیوں نے ایجاد کیا۔ ۱۰۵ء میں ایک چینی "تسائی لن" (Ts'ai Lan) نے شہتوت کی لکڑی کو گودے میں تبدیل کر کے اس سے کاغذ بنایا۔ بعد ازاں چینیوں نے کپڑے کے چیتھڑوں سے بھی کاغذ بنایا۔ ۷۵۱ء میں عربوں نے چینیوں سے جنگیں کیں وہ چینی کاغذ بنانے والوں کو بغداد لے گئے۔ وہاں سے کاغذ بنانے کا فن شمالی افریقہ اور یورپ میں پھیل گیا۔

پہلا ٹائپ رائٹر کس نے بنایا؟

۱۸ویں اور ۱۹ ویں صدی میں لوگوں نے انگلینڈ اور امریکہ میں ٹائپ رائٹر بنانے کا تجربہ کیا مگر یہ ٹائپ رائٹر زیادہ مفید نہ تھے۔ ۱۸۶۷ء میں امریکیوں، کرسٹوفر لیتھم شولز، کارلس گلڈن اور ایس۔ ڈبلیو۔ ساؤل (S.W.Saule) نے ایک جدید ٹائپ رائٹر بنایا۔ یہ کاغذ پر حروف تہجی بڑی

ادارہ

عکس ادھورے کیجئے پورے

اِس مقابلے میں ہم ہر ماہ کسی ایک شعبے سے تعلق رکھنے والی، دُنیا کی دو معروف شخصیات کے ادھورے خاکے شائع کرتے ہیں۔ آپ کو ان شخصیات کو پہچاننا ہے اور ان کی وجۂ شہرت بتانا ہے۔ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے آئندہ ماہ ہم صحیح جوابات کے ساتھ ان لوگوں کے مختصر حالاتِ زندگی بھی شائع کریں گے۔ بالکل صحیح جواب دینے والے ساتھی کو تین ماہ کے لیے ماہنامہ آنکھ مچولی مفت ارسال کیا جائے گا۔ ایک سے زیادہ درست حل موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ مقابلے میں شرکت کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

- ☐ جوابات الگ کاغذ پر صاف صاف تحریر کیے جائیں۔
- ☐ ہر ماہ کی دس تاریخ تک ادارہ کو موصول ہو جائیں۔
- ☐ جوابات کے ساتھ بھیجنے والے کا مکمل پتا ضرور ہو۔

ان تین شرطوں میں سے کسی ایک بھی شرط کے پورا نہ ہونے پر جوابات کو مقابلے سے خارج کر دیا جائے گا!

پتا: انچارج انعامی مقابلہ "عکس ادھورے، کیجئے پورے"
ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۔ بی آئی بی کالونی، کراچی ۷۵۸۰۰

گزشتہ ماہ کے

درست جوابات

"سلیم ملک"

وجہ شہرت — کرکٹ

موجودہ پاکستانی کرکٹ ٹیم کے کپتان سلیم ملک نے ۱۶ اپریل ۱۹۶۳ء کو زندہ دلوں کے شہر لاہور میں آنکھ کھولی۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں نیوزی لینڈ کی ٹیم کے خلاف ٹیسٹ کیریئر کا آغاز کیا۔ اور اپنے پہلے ہی ٹیسٹ میں سنچری اسکور کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔

سلیم ملک اب تک ۳ ٹیسٹ میچز میں پاکستان کی ٹیم کی قیادت کر چکے ہیں جس میں ۲ پاکستان کی ٹیم نے جیتے جب کہ ایک میچ ڈرا ہوا۔ سلیم ملک نے اب تک ۱۲ ون ڈے میچوں میں بھی ٹیم کی قیادت کی ہے جس میں پاکستان نے ۸ میچ جیتے ۳ ہارے اور ایک نتیجہ نہ نکل سکا۔

سلیم ملک نے اب تک پاکستان کی جانب سے ۷۵ ٹیسٹ میچز میں حصہ لیا ہے اور ۴۲ رنز کی اوسط سے ۳۹۶۷ رنز اسکور کئے ہیں جن میں ۱۱ سنچریاں اور ۲۱ نصف سنچریاں شامل ہیں۔ سلیم ملک اب تک ۱۸۶ ون ڈے میچز میں ۳۰ رنز کی اوسط سے ۴۵۳۲ رنز اسکور کر چکے ہیں۔ جس میں ۶ سنچریاں اور ۲۵ نصف سنچریاں شامل ہیں۔

شعیب

وجہ شہرت — کرکٹ

شعیب محمد کا شمار پاکستانی کرکٹ کے ایک کامیاب بیٹسمین کے طور پر ہوتا ہے۔ شعیب نے ۸ جنوری ۱۹۶۱ء کو لٹل ماسٹر حنیف محمد کے گھر میں آنکھ کھولی۔ کرکٹ کا کھیل ان کا خاندانی کھیل ہے۔ ان کے والد، چچا سب اچھے کرکٹرز رہ چکے ہیں، اسی وجہ سے کرکٹ کا کھیل شعیب کے انگ انگ میں رچا بسا ہوا ہے۔

شعیب نے اب تک ۴۲ ٹیسٹ میچوں میں ۴۶ رنز کی اوسط سے ۲۶۲۲ رنز بنائے ہیں، بہترین اوسط کے لحاظ سے شعیب کا شمار میانداد کے بعد دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ شعیب کی یہ بدقسمتی ہے کہ ان پر صرف ٹیسٹ کرکٹ کے کھلاڑی ہونے کی چھاپ لگا کر ون ڈے کرکٹ سے دور رکھا گیا۔ مگر یہ الزام غلط تھا۔ اس بات کا ثبوت شعیب وقتاً وقتاً ملنے والے مواقع کے دوران دیتے رہے۔ اب تک شعیب ۶۳ ایک روزہ میچوں میں ۱۲۶۹ رنز بنائے ہیں، ون ڈے کرکٹ میں شعیب کو پاکستان کی جانب سے دوسرا سب سے بڑا انفرادی اسکور (۱۲۶) کرنے کا بھی **اعزاز حاصل ہے۔**

قرعہ اندازی کے ذریعے انعام حاصل کرنے والے خوش نصیب

غلام فرید کٹیار، بلوچستان

بالکل درست جواب دینے والوں کے نام

بلال فاروق، لاہور۔ بشریٰ ریاض، شیخوپورہ۔ محمد حسن معظم، لاہور۔ عزیر عبداللہ صدیقی، کراچی۔ ذاکرہ وسیم، پشاور۔ وسیم مشتاق گل، کلر کہار۔ مس نویدہ مشتاق، کلر کہار۔ لبنیٰ خان تونسوی، تونسہ شریف۔ ناصر حفیظ، ملتان۔ خرم ندیم، کراچی۔ سید صولت علی جعفری، حیدر آباد۔ کیڈٹ طارق محبوب میمن، پشاور۔ احمر فرقان، ملتان۔ رابعہ ارشاد، لاہور۔ خرم نذر وڑائچ، لاہور۔ محمد کلیم ولی، ٹنڈو آدم۔ عفت ولی، ٹنڈو آدم۔ طارق محمود، کراچی۔ یسریٰ نیاز، نواب شاہ۔ ارشاد، بھکر۔ محمد ریحان، اسلام آباد۔ فرخ سیر گوندل، چونیاں۔ ندیم احمد، نذیر احمد، کاموکے۔ سید یحییٰ حسینی، کراچی۔ سید نیر آفاق سبزواری، راولپنڈی۔ تنزیل رضا محمود، ڈی جی خان۔ فہمینہ برڑو، ٹھٹھہ۔ شمیلہ عندلیب، حیدر آباد۔ عامر رضا ہاشمی، لیاقت پور۔ ہریش کمار ڈیونداس، عمرکوٹ۔ لطف الاسلام، راولپنڈی۔ اقبال حسین نواز، پشاور۔ یاسر لغاری، سندھ۔ میر راحیل پرویز، میر فہد پرویز، میر عدیل پرویز، مظفر آباد آزاد کشمیر۔ صالحہ صدف، منگلا کینٹ۔ سید اصغر عباس نقوی، شیخوپورہ۔ خرم شہزاد، ڈیرہ غازی خان۔ ایم اے قریشی، فراز انجم، علی عباس، فرقان واجد، خرم مورس، محمد علی اعوان، تنویر حسن اعوان، فیصل گھمن، حسین صبیح، غلام عباس، اسلام آباد۔ طلحہ احمد طاہر، سرگودھا۔ اطہر مسعود ملک، راولپنڈی۔ جمیل احمد، ٹنڈو آلہ یار۔ عشرت یوسف، جمشید یوسف، کراچی۔ محمد قذافی، حیدر آباد۔ رحمت اللہ بشیر، رمضان بشیر، گجرات۔ محمد عدنان عبد العزیز، کراچی۔ مجیب ربانی، خانیوال۔ ماریہ چوہدری، خانیوال۔ آمنہ چوہدری، خانیوال۔ حسین علی، گوجرہ۔ مختار حسین ہاشمی، رحیم یار خان۔ ادیبہ مہوش سنگھانوی، کراچی۔ ریاض اسرار بیگ، کراچی۔ سید علی عمران فریدی، کراچی۔ صائمہ اکرم، رحیم یار خان۔ رضوان اکرم، رحیم یار خان۔ سجاد جان قریشی، ٹنڈو محمد خاں۔ عدیم اختر معین، میرپور خاص۔ عمران خالق، کراچی۔

بابو شرط باز

جدون ادیب

نام تو ان کا مرزا حشمت بیگ تھا مگر وہ بابو شرط باز کہلاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ "لگا لو شرط" ان کا تکیہ کلام تھا۔ دبلے پتلے لمبے قد کے مالک تھے۔ چہرہ بارعب ہوتا تھا اور آنکھوں پر نظر کا چشمہ سجائے، ہاتھ میں ایک چھڑی لئے پُر وقار انداز میں چلتے تھے۔ سابقہ ٹیچر رہ چکے تھے لہٰذا ان کی آواز کرخت تھی۔ پانچ وقت کے نمازی تھے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں تنہا رہتے تھے۔ گزر بسر کے لئے اخبارات و رسائل فروخت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تھوڑی بہت پینشن بھی مل جاتی تھی۔

بچوں سے بہت پیار کرتے تھے مگر بچوں کو ڈانٹنا اور ایک آدھ ہاتھ ار دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ شرارتی بچے تو انہیں دیکھ کر ہی غائب ہو جاتے تھے۔ شام کو میدان میں آجاتے اور کھیلنے والے بچوں کو کچھ نہ کچھ سمجھانے لگ جاتے۔ ایک دن میچ ختم ہونے کے بعد مشتاق جوش سے سب کو بتا رہا تھا۔ "میں نے آج کیا شاندار بولنگ کی، چھ وکٹیں لیں اور بیٹنگ بھی میری لاجواب تھی۔"

بابو شرط باز پاس ہی کھڑے تھے۔ مشتاق کو اپنی طرف بلایا اور کہنا شروع کیا۔ "اماں! میاں! یہ تم اپنے منہ سے اپنی تعریفیں کر رہے ہو...... اپنے منہ

میاں مٹھو بن رہے ہو ...... میاں! یہ غلط بات ہے۔ اپنی تعریف کا حق دوسروں کے پاس رہنے دو۔ خود نہ سناؤ بلکہ ان کی سنو کہ تمہارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں۔ اگر خود اپنی تعریف کرتے رہو گے تو دوسرے لڑکے تم پر ہنسیں گے............ "کیوں میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

مشتاق بوکھلا گیا۔

"جج...... جی ہاں ...... مرزا صاحب۔"

وہ پھر بولنے لگے۔ "تعریف انسان کو کھا جاتی ہے۔ انسان خوشامد پسند ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے ہی شو مارتے رہے نا...... ترقی نہیں کر سکو گے...... لگا لو شرط......!"

وہ اتنا کہہ کر چلے گئے۔ پھر مشتاق نے کبھی اپنے آپ کو بڑا کہنے کی کوشش نہ کی۔ ایک دن سفیر کی جو شامت آئی، اس نے کچرا گلی کے کونے پر پھینک دیا۔

بابو شرط باز نے اسے پکڑ لیا اور گھورتے ہوئے بولے ...... "اماں یہ کیا حرکت ہے؟"

"جی ...... حرکت ...... حرکت میں ہی برکت ہے......" سفیر نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

"میاں کیا بات کہہ رہے ہو...... خدا کی قسم جی خوش کر دیا۔" وہ خوشی سے بولے۔ "حرکت میں ہی برکت ہے تو یہ کچرا ذرا آگے پڑے ہوئے ڈرم میں کیوں نہ ڈالا؟"

"مرزا صاحب! غلطی ہو گئی۔" سفیر نے سر جھکا کر کہا۔

"غلطی ہو گئی...... تو پھر اس کا کفارہ بھی ادا کرو ...... چلو اٹھاؤ کچرا۔" انہوں نے چھڑی لہراتے ہوئے کہا۔

سفیر نے جلدی جلدی کچرا اٹھا کر ٹوکری میں ڈالا اور کچرے کے ڈرم میں ڈال دیا۔ بابو شرط باز اس سے کہہ رہے تھے۔

"میاں! یہ تمہارا محلّہ ...... تمہارا ملک ہے، اس کی صفائی تمہارا فرض ہے ...... کچرا ڈرموں میں ڈالا کرو ورنہ گندگی پھیلتی ہے اور کئی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ اگر تم ایسے ہی کچرا ادھر ادھر پھینکتے رہے نا! تو یہ محلّہ گندگی کا ڈھیر بن جائے گا، لگا لو شرط۔"

اور سفیر سر جھکائے ادب سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

ایک دن ہم میچ کھیلنے کے بعد ستا رہے تھے کہ جمشید نے کہا،

"دوستو! کیوں نا آج باغ سے آم توڑ کر کھائے جائیں......"

"اور وہ جو چوکیدار ہے بڑی بڑی مونچھوں والا......" اورنگزیب فوراً بول پڑا۔

"اس وقت چوکیدار سو رہا ہو گا۔" جمشید نے کہا۔

تھوڑی دیر بحث کے بعد ہم آٹھ دوستوں نے باغ سے آم چرانے کا فیصلہ کر لیا۔ چوکیدار واقعی سو رہا تھا ہم دیوار پھلانگ کر اندر گھس گئے۔ جمشید درخت پر چڑھ گیا اور آم توڑ توڑ کر نیچے ہماری طرف پھینکنے لگا۔ ہمیں خبر ہی نہ ہوئی کہ مالی سر پر

آن پہنچا۔ اگر ہم چاہتے تو بھاگ جاتے مگر جمشید جو درخت پر چڑھا ہوا تھا وہ پکڑا جاتا لہٰذا ہم نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔

چوکیدار ہم آٹھوں دوستوں کو لے کر باغ کے باہر آ گیا اور بولا،

"چلو مجھے اپنے اپنے گھر دکھاؤ۔" اچانک ہی بابو شرط باز کہیں سے آن ٹپکے۔ انہیں ساری بات کا پتہ چلا تو وہ چوکیدار پر غصے ہونے لگے۔

"اماں! تم نے بچوں کو چور سمجھ رکھا ہے؟"

چوکیدار بولا،

"مرزا صاحب انہوں نے باغ سے چوری چھپے آم توڑے ہیں۔"

"ہیں...... تو پھر کیا بتا کر توڑتے...... تم انہیں توڑنے دیتے......؟" وہ غصے سے چوکیدار پر برس پڑے۔

پھر انہوں نے اپنی جیب سے چوکیدار کو جرمانہ دیا اور ہمیں لے کر چھاؤں میں آ گئے اور بولے...... "میاں تم لوگوں کو یہ آم کھانے کی کیا سوجھی اور وہ بھی اس دوپہر میں!" چند لمحے چپ رہنے کے بعد بولے۔ "تم لوگ اسکول پڑھتے ہو اچھے بچے ہو...... یہ چوری چکاری گندے بچوں کا کام ہے...... کیا سمجھے؟" جمشید آگے بڑھ کر بولا،

"مرزا صاحب! ہمیں معاف کر دیں......!"

بابو شرط باز نے اس کی کمر پر ایک ہاتھ مارا اور بولے،

"ایسی چھوٹی چھوٹی چوریوں سے ہی ذہن خراب ہوتا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو یقین کرو آگے جا کر تم بڑے بڑے مجرم بن جاؤ گے...... لگا لو شرط۔"

ہم نے ان سے معافی مانگ کر عہد کیا کہ ہم آئندہ کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے۔ انہوں نے ہمیشہ ہم بچہ پارٹی کی حمایت کی تھی مگر آج عملاً ثابت کر دیا تھا۔ لہٰذا ہمارے دل میں ان کے لئے پہلے سے زیادہ عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔

اگلی صبح ہم معمول کے مطابق ناشتہ کر کے اسکول گئے۔ گھر آ کر کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر آرام کیا پھر کھیلنے چلے گئے۔ اگرچہ یہ ہم سب بچوں کا معمول تھا مگر آج ہمیں کسی چیز کی کمی کا احساس ہو رہا تھا پھر سہیل بول پڑا۔ "ارے بابو شرط باز نظر نہیں آئے آج سارا دن......"

ہمارے ذہنوں سے بوجھ سا ہٹ گیا۔ ہاں ہمیں انہی کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ عارف بولا۔

"ابو کہہ رہے تھے کہ وہ بیمار ہیں......"

"ہائیں بیمار!!............ کل تو ٹھیک ٹھاک تھے۔" اقبال حیرت سے بولا۔

"بیماری اور کراچی کی بسیں کبھی پوچھ کر آتی ہیں؟" جمشید نے مزاحیہ انداز میں کہا اور سب کو سنجیدہ دیکھ کر خود ہی ہنس پڑا۔

ہم نے طے کیا کہ بابو شرط باز کی تیمار داری کی

جائے۔

یہ سوچ کر ہم سب ان کے گھر کی طرف چل پڑے۔ وہ واقعی بیمار تھے۔ انہیں سخت بخار تھا ہمیں دیکھ کر وہ کھل اٹھے۔

رسمی گفتگو کے بعد بولے "آج تم لوگ ٹیوشن نہیں گئے......؟"

"نہیں آج ہم نے چھٹی کا ارادہ کیا ہے۔" مشتاق نے جلدی سے کہا۔

"اماں میاں چھوڑو یار۔ ہمیں دیکھنے آ گئے اور ٹیوشن چھوڑ دیا۔ غضب کر دیا......!"

وہ غصے سے بولے مگر لہجے میں اپنائیت تھی۔

"اماں ہم مر تھوڑی گئے تھے...... جو لوگ پڑھنے سے جی چُراتے ہیں ان کو نقل و دھونس کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ بڑی کلاسوں اور کالج میں جا کر زبردستی نقل کرتے ہیں اور اساتذہ کو مارتے ہیں۔ مجھے بھی میرے شاگردوں نے مارا تھا...... یہ تو اب رواج بن چکا ہے......۔" طالب علموں کا کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی۔ پھر بولے،

"ایسے طالب علم آگے جا کر کلرک وغیرہ ہی بن سکتے ہیں یا ڈاکو لٹیرے...... میاں تم لوگ ایسا نہ کرنا ہاں......!"

ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کی باتوں میں دکھ تھا گہرا دکھ......

وہ پھر ہم سے مخاطب ہوئے۔ "یہ نقل کرنے والے طالب علم یہ نہیں سوچتے کہ یہ تو چھوٹا سا دنیاوی امتحان ہے، اس میں نقل کر رہے ہیں مگر آخرت کے امتحان کا کیا ہو گا...... لگالو شرط بری طرح فیل ہونگے......۔"

وہ چند لمحے رکے اور پھر کہنے لگے۔ "ہم عام زندگی میں کتنے ہی جھوٹ بولتے ہیں...... ایک دوسرے کی برائی یعنی غیبت کرتے ہیں...... گالی گلوچ کرتے ہیں...... لڑتے ہیں چوری چکاری کرتے ہیں۔ ڈنڈی مار جاتے ہیں...... میاں تم لوگ مجھے بتاؤ اپنے پیارے نبیؐ کو ہم کیا منہ دکھائیں گے؟ کیا وہ ہمیں دیکھنا چاہیں گے؟ ہماری بخشش کروائیں گے؟...... ہمارے سر ان کے سامنے جھکے ہوئے ہوں گے...... ہم دوزخ میں جائیں گے...... کیونکہ ہم نام کے مسلمان ہیں ہم کلمہ تو ضرور پڑھتے ہیں مگر کلمے کا حق ادا نہیں کرتے۔ میاں ہمارا ٹھکانہ جہنم ہے جہنم' لگالو شرط......!" پھر وہ چپ ہو گئے ہم انہیں خدا حافظ کہہ کر واپس آ گئے۔

اگلے دن ان کے انتقال کی خبر ہمیں ملی...... ہم بچہ پارٹی رونے لگے...... ان کی کہی ہوئی باتیں ہمیں یاد آ رہی تھیں ایک دفعہ انہوں نے ہمیں کیا خوب کہا تھا "اماں! زندگی کا کیا بھروسہ...... موت ہر کسی کو آنی ہے...... ہر جاندار کو...... لگالو شرط......" ہم پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے دکھ سے ہمارا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا...... افسوس بابو شرط باز ہم سے بچھڑ گئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے...... ہم آنسوؤں بھری آنکھوں سے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے اب ہم سے کون کہے گا...... "لگالو شرط۔"

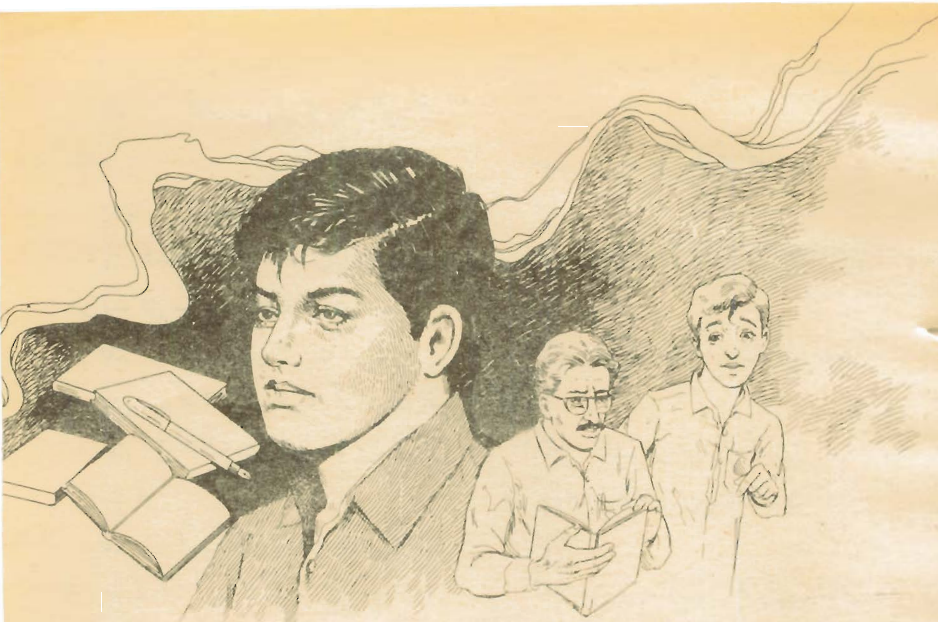

گھر کا کام

عنایت علی خان

پہلا سین ......

(دو لڑکے اسکول کے احاطے میں داخل ہوتے ہیں)

پہلا...... السلام علیکم بھائی پرویز۔

پرویز...... بھائی حامد وعلیکم السلام۔ جنت المقام دوزخ الحرام تمہارے بال بچے ہمارے غلام۔

حامد...... بہت چمک رہے ہو لگتا ہے اس مرتبہ گھر کا کام کر کے لائے ہو۔

پرویز...... گھر کا کام ہم ہمیشہ کرتے ہیں۔

حامد...... ہر سال کرتے ہیں تو پھر پٹائی کیوں ہوتی ہے چھٹیوں کے بعد پہلے دن!

پرویز ...... پٹائی تھوڑی ہوتی ہے۔ ہاتھ ذرا سرخ ہو جاتے ہیں، کچھ دیر کے لئے۔ دو مہینے قلم گھسنے سے تو بہتر ہے ذرا دیر کو ہاتھ سرخ کرالیں۔

حامد...... اس کا مطلب ہے گھر کا کام بالکل نہیں کیا؟

پرویز...... بالکل کیا ہے!

حامد ...... تمہارے پاس تو بستہ بھی نہیں ہے۔

پرویز ...... (نیفے میں اڑوسی ہوئی کاپی قمیص سے باہر نکالتے ہوئے) سوسنار کی ایک لوہار کی۔ آج کے کام کے لئے یہ ایک کاپی کافی ہے۔

حامد...... سارا کام اس میں ہے گھر کا؟

پرویز...... کہہ جو دیا کہ گھر کام کر تارہا ہوں۔ سارا کام آج تھوڑا ہی دیکھ لیں گے سر۔ (گھنٹی بجتی ہے)

حامد...... عجیب آدمی ہو، چلو کلاس میں پتہ چل جائے گا۔ میں بستہ کلاس میں رکھ کر آتا ہوں۔

پرویز...... اپنا بستہ تو اپنے نیفے میں رہتا ہے۔ (کاپی نیفے میں اُڑس لیتا ہے)

دوسرا سین

(کلاس روم میں لڑکے بیٹھے ہیں،استاد صاحب آتے ہیں)

استاد...... السلام علیکم

طلبہ...... وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ

استاد...... کیا حال ہے سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں، چھٹیاں ٹھیک ٹھاک گزاریں۔ کام وام کیا تعطیلات کا؟

(طلبہ خاموش رہتے ہیں)

استاد...... جن لوگوں نے گھر کا پورا پورا کام کیا ہو ہاتھ اٹھائیں، پورا کام نامکمل نہیں...... بس ایک نے؟ وہ بھی پرویز نے شاباش! باقی سب لوگ کیا کرتے رہے؟

حامد...... سر وہ کیا تو ہے مگر تھوڑا سا رہتا ہے اردو کا۔

استاد...... ہاں اردو تو گھر کی لونڈی ہے نا اس کی کون پروا کرتا ہے۔

حامد...... سر انشاء اللہ پورا کر کے کل دکھا دوں گا۔

استاد...... ایک دن تو دیر ہو گئی نا...... اور تم سلیم تم تو ہوشیار لڑکوں میں سے ہو تم نے بھی پورا نہیں کیا؟

سلیم...... سر وہ ہو تو جاتا مگر ہم لوگ لاہور چلے گئے میری عربی کی کتاب رہ گئی تھی، بس اس کا کام رہ گیا۔ دو دن میں انشاء اللہ پورا کر کے دکھا دوں گا۔

استاد...... وجہ کچھ رہی ہو مکمل تو بس ایک ہی لڑکے نے کیا ہے نا اور وہ بھی پرویز نے جب پرویز کر سکتا تھا تو سب کر سکتے تھے۔

اگر ہر روز کام کرتے تو کبھی کا ختم ہو جاتا۔ پرویز تم ہر روز کرتے ہو گے نا؟

پرویز...... یس سر میں تو ہر روز گھر کا کام کرتا تھا۔

استاد...... (محمود سے) اور مانیٹر صاحب آپ کو کیا ہو گیا تھا۔ آپ کا کام کیوں مکمل نہیں ہوا؟

محمود...... سر وہ میرا بس ایک جغرافیہ کا نقشہ رہ

گیا ہے۔ وہ بنانا ہے۔

استاد ...... نقشہ بنانا تھا یا ملک کہ دو مہینے میں نہیں بنا۔

محمود ...... نو سر، وہ میرا پڑوسی بھی اسی کلاس میں پڑھتا ہے نقشوں کی کتاب وہ لے گیا تھا وہ شہداد پور سے رات کو واپس آیا ہے، میں انشاء اللہ آج ہی نقشہ بنالوں گا باقی کام پورا ہے۔

استاد ...... آپ میاں منگتے باہر کھڑے درویش۔ اپنا کام مکمل نہیں ہوا دوسروں کی مدد ہوتی رہی۔ بہرحال آپ سب لوگ کھڑے ہو جائیں بس پرویز بیٹھا رہے۔ اس نے کام مکمل کیا ہے۔

حامد ...... (آہستہ سے پرویز کے کان میں) یار تم تو کہہ رہے تھے کہ ......

پرویز ...... ہش (اسے خاموش کرتے ہوئے) سر میں نے گھر کا کام ......

استاد ...... ہاں تم نے تو کر لیا ہے نا سب باقی لڑکوں سے پوچھ لوں ایسا ہے آپ سب لوگ پہلے تو کھڑے ہو جائیں اور شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو سلامی دیں بعد میں میں ایک ایک سے پوچھوں گا۔ آیئے پرویز آپ باہر آجایئے۔ یہاں کھڑے ہو کر ان نالائقوں کی سلامی لیجئے۔

(کھسیانا ہو کر)

پرویز ...... نہیں سر رہنے دیں۔

استاد ...... رہنے کیوں دیں۔ ہم جو کہہ رہے ہیں۔ آپ باہر آجایئے۔ تکلف نہ فرمایئے ممکن ہے آپ کو سلامی کے علاوہ کوئی اچھی سی کتاب بھی انعام میں مل جائے اور وہ بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کے ہاتھوں سے اسمبلی میں دعا کے وقت۔

پرویز ...... لیکن سر وہ ......

استاد ...... لیکن ویکن کچھ نہیں آیئے باہر

(پرویز جھجھکتے ہوئے قدموں سے باہر آتا ہے)

استاد ...... ریڈی! سلیوٹ ٹو پرویز، کلاس سلیوٹ! اور آپ سب لوگ سیدھے تن کر سیدھے ہاتھ سے سلامی دیں گے ریڈی ......

پرویز ...... لیکن سر میں نے تو گھر کا ......

استاد ...... ہاں ہاں گھر کے کام ہی کا انعام مل رہا ہے۔

پرویز ...... مگر سر وہ انعام والی بات نہیں ہے۔

استاد ...... ہمارے نزدیک تو ہے نا بس خاموشی سے سلامی لو سلامی لیتے ہوئے بات چیت نہیں کرتے۔ ریڈی، سلیوٹ ٹو پرویز، کلاس سلیوٹ۔

(پوری کلاس سلیوٹ کرتی ہے)

استاد ...... (حامد کو ہنستا ہوا دیکھتے ہوئے) یہ تم ہنس کیوں رہے ہو۔ نالائق نہ خود کام کرتے ہو نہ دوسروں کی عزت برداشت کر سکتے ہو۔ (پرویز سے) میاں تم نے نام تو بادشاہ کا رکھ لیا سلامی لینی نہیں آتی۔ سلامی لو! (کھڑے ہو کر اس کی کمر سیدھے کرتے ہوئے) اس طرح تن کر...کبڑے کیوں ہوئے جارہے ہو کوئی کوڑے پڑ رہے ہیں پیٹھ پر؟

(حامد کی ہنسی کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھتے ہیں) تم اوپر کھڑے ہو جاؤ بینچ پر پاگلوں کی طرح ہنسے جا رہے ہو۔

(حامد ضبط کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر پرویز پر نظر پڑتی ہے تو پھر بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے)

استاد ...... (غصے سے) ادھر آجاؤ۔ پہلے تمہاری تاج پوشی ہو جائے۔

(حامد ہنسی روک کر باہر آتا ہے)

استاد ...... کس بات پر ہنسی چھوٹ رہی ہے تمہاری؟

حامد...... سر یہ پرویز دعا سے پہلے کہہ رہے تھے (پرویز کو دیکھ کے پھر ہنسنے لگتا ہے پرویز اسے خوشامد کی نظروں سے دیکھتا ہے)

استاد...... (ڈانٹ کر) پھر وہی بد تمیزی، میں پوچھتا ہوں، ہنس کیوں رہے؟ کیا کہہ رہے تھے پرویز تم دعا سے پہلے۔جس پر اسے اتنی ہنسی آرہی ہے؟

پرویز...... سر میں خود آپ سے ...... میں خود کہہ رہا تھا کہ میں روزانہ گھر کا کام ......

استاد...... (حامد سے) اسی بات پر ہنس رہے ہو کہ یہ روزانہ گھر کا کام کرتا تھا اس لئے چھٹیوں کا کام مکمل کر لیا ...... اور تم روزانہ نہیں کرتے تھے اس لئے پھسڈی رہ گئے۔ یہ ہنسنے کی بات ہے کہ رونے کی۔ الٹا اس پر ہنس رہے ہو۔

حامد...... نہیں سر آپ پرویز سے پوچھیں تو...... کہ گھر کا کام

استاد...... پوچھ تو لیا کیا حلف نامہ لکھوا کر تمہیں دکھاؤں؟

پرویز...... (بیچ میں بولتے ہوئے) نہیں سر آپ سمجھے نہیں میں تو اسکول کے کام کا نہیں کہہ رہا تھا، گھر کے کام کا کہہ رہا تھا۔

استاد...... اسکول کا کام ابھی کہاں دیا ہے بات تو گھر کے کام ہی کی ہو رہی ہے نا وہ تو تمہارا پورا ہے نا؟

پرویز...... وہ سر میرا مطلب تھا میں گھر کا کام تو روز کرتا تھا، تعطیلات کا کام ......

استاد...... ایک ہی بات ہے۔گھر کا کام کہو، تعطیلات کا کہو ویکیشن کا کہو!

پرویز...... مگر سر میرا مطلب تو یہ تھا کہ مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی ...... گھر کے کام کے نام سے سر

استاد...... کیسی غلط فہمی؟ صاف بتاؤ۔ چھٹیوں کا جو کام دیا تھا وہ پورا کیا یا نہیں؟ ہاں یا ناں میں جواب دو۔

پرویز...... وہ تو نہیں کیا......

استاد...... پھر کون سا کام کیا روزانہ؟

پرویز...... سر وہ گھر کا، میرا مطلب ہے۔ مجھے غلط فہمی۔

استاد...... ہاں وہی تو میں جاننا چاہ رہا ہوں کہ تمہیں کیا غلط فہمی ہو گئی تھی (طلبہ سے مخاطب ہو کر) آپ سب لوگ ابھی بیٹھ جائیں میں ذرا ان شہنشاہ ایران خسرو پرویز صاحب سے نمٹ لوں، جی تو کیا مطلب سمجھا تھا آپ نے گھر کے کام سے؟

پرویز...... سروہ میں روزانہ گھر کا کام کرتا تھا۔

استاد......جی وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا کام کرتے تھے گھر کا سبزی ترکاری لاتے تھے، سودا سلف لاتے تھے؟

پرویز...... یس سر، اور کپڑے بھی لے جاتا تھا لانڈری پر...... اور سر واپس بھی لاتا تھا۔

استاد...... اچھا؟ واپس بھی لاتے تھے؟ اور کیا کام کرتے تھے گھر کا

(طلبہ ہنستے ہیں)

جی، شہنشاہ سلامت اور کیا کام کرتے تھے۔

(پرویز خاموش رہتا ہے)

استاد...... خاموش کیوں ہو گئے اور بھی کئی کام کئے ہوں گے گھر کے۔ آخر پورے دو مہینے گھر کا کام کرتے رہے تھے۔ یاد کر کے بتایئے۔

پرویز...... سر معاف کر دیجئے۔ آئندہ نہیں کروں گا......

استاد...... کیا نہیں کروں گا؟ گھر کا کام؟ گھر کے کام کرنے پر تو ابھی تو سلامی ملی ہے وہ تو ضرور کرنا......

پرویز...... نہیں سر اب جھوٹ نہیں بولوں گا۔ ...... معاف کر دیں۔

استاد...... جھوٹ آپ نے کب بولا ہے، آپ تو روزانہ گھر کا کام کرتے رہے ہیں ابھی تو میں بھی آپ کو سلامی دوں گا، ذرا کان قریب لایئے۔ آپ کی غلط فہمی دور کر دوں۔

پرویز...... سر آئندہ نہیں کروں گا؟

پانچ ہزار بار گھونسلے کے چکر

انڈوں سے نکلنے کے بعد اڑنے چگنے کے قابل ہونے تک چڑیا کا جوڑا اپنے بچوں کے لئے کم از کم پانچ ہزار بار گھونسلے کے چکر لگاتا ہے۔

استاد...... (کان کھینچتے ہوئے) کیا نہیں کروں گا؟ غلط فہمی۔

پرویز...... نہیں سر بد تمیزی۔

استاد...... اور جو کی ہے اس کی سزا تو ملنی چاہئے نا؟

پرویز...... سر معاف کر دیں۔ آئندہ نہیں کروں گا۔

استاد...... آئندہ نہیں کرو گے تو آئندہ سزا بھی نہیں ملے گی۔ مگر اس دفعہ تو گھر کا کام کرنے کا انعام پورا پورا ملے گا۔ (طلبہ سے) آپ سب نے انہیں ایک بار تو سلامی دے دی اب دوسری بار دوسرے طریقے سے سلامی دیں۔ ایک ایک کر کے آئیں ان کے دونوں کان دونوں ہاتھوں میں لے کر مروڑیں اور پوچھیں "شہنشاہ سلامت! گھر کا کام کر لیا؟" جب تک یہ نہ کہیں۔ "کر لیا" اس وقت تک کان نہ چھوڑیں۔ انہیں بھی یاد رہے نا کہ انہوں نے گھر کا کام کر لیا ہے۔ آیئے مانیٹر پہلے آپ آیئے! (مانیٹر آتا ہے) ان کے کان پکڑ کر مروڑیئے اور پوچھئے "شہنشاہ سلامت گھر کا کام کر لیا" اور ان سے کہلوایئے...... "کر لیا"

(مانیٹر ایسا ہی کرتا ہے)

پرویز...... (تکلیف سے تقریباً روتے ہوئے مری ہوئی آواز سے) کر لیا۔

(ایک ایک کر کے دو اور لڑکے آتے ہیں اور یہی عمل دہراتے ہیں چوتھے لڑکے پر پرویز رونے لگتا ہے)

استاد...... میرا خیال ہے اب تمہیں اچھی طرح یاد رہے گا کہ تم نے گھر کا کام کر لیا ہے۔ اب میں کام نہ کرنے کے لئے دس روز دیتا ہوں کیا سمجھے نہ کرنے کے لئے! سمجھے؟

پرویز...... یس سر کام کرنے کے لئے!

استاد...... کون سا کام گھر یا تعطیلات کا؟ اب تو غلط فہمی نہیں ہو گی؟

پرویز...... تعطیلات کا......

استاد...... جی اور اگر دس روز کے اندر کام مکمل نہ ہوا تو اسی سین کا ایکشن ری پلے ہو گا۔ سمجھ گئے؟ یا ایکشن ری پلے کا مطلب بھی سمجھاؤں۔

پرویز...... نہیں سر، سمجھ گیا؟

استاد...... ٹھیک ٹھیک سمجھ گئے نا؟ کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گی؟

پرویز...... نو سر!

استاد...... جائیے بیٹھئے اپنی جگہ پہ۔

باباۓ

باباۓ قوم	قائد اعظم محمد علی جناح
باباۓ کیمیا	جابر بن حیان
باباۓ ہومیوپیتھک	ڈاکٹر ہانیمن
باباۓ عمرانیات	ابن خلدون
باباۓ معاشیات	ایڈم اسمتھ
باباۓ حیاتیات	ارسطو
باباۓ طب	بقراط
باباۓ تواریخ	ہیرو ڈوٹس
باباۓ پشتو ادب	خوشحال خان خٹک
باباۓ اردو	مولوی عبدالحق
باباۓ صحافت	مولانا ظفر علی خان

مرسلہ:۔ رشید احمد خان، کراچی

سبق

آج کل کے دور میں پتنگ بازی محض لطف لینے کی خاطر کی جاتی ہے۔ مگر ہمارے قائد اعظم نے پتنگ بازی سے جو سیکھا اس کی وضاحت کے لئے درج ذیل واقعہ دیا جاتا ہے۔

بچپن میں ایک دن قائد اعظم پتنگ اڑا رہے تھے کہ کسی شریر لڑکے نے نیچے سے ڈور کاٹ دی۔ قائد کی نظریں پتنگ پر تھیں۔ اور انہیں ڈور کے کٹنے کا احساس تک نہ ہوا۔ چنانچہ جب انہوں نے پتنگ کو ڈھیل دی۔ تو ڈور ختم ہو گئی، اور اس طرح پتنگ ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ قائد اعظم نے اس واقعہ سے ایک بڑا سبق سیکھا اور وہ یہ کہ "جب نظریں آسمان کی طرف ہوں تو زمین سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔"

مرسلہ:۔ رحمت اللہ بشیر گجرات

ہم نے بنایا سیب کا حلوہ

ناصرہ فیضی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ...... لیکن ٹھہریئے پہلے ہم اپنا تھوڑا سا تعارف کروا دیں۔ ہم ذرا موجد قسم کی چیز ہیں اور نت نئے تجربات و ایجادات کرنا ہمارا مشغلہ ہے۔ اب آپ کہیں گے کہ تجربات کرنے کے لئے تو لیبارٹری کی ضرورت ہوتی ہے تو جناب ایک عدد لیبارٹری ہمارے گھر ہی میں موجود ہے اور اس میں تمام ضروری چیزیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً نمک، مرچ، مصالے، سوجی، چینی، بیسن، لہسن، پیاز، گھی وغیرہ وغیرہ۔ ایک جانب چولھے بھی ہیں جو لیبارٹری کا سب سے اہم جزو ہیں۔ دوسری طرف سنک بھی لگا ہوا ہے اور برتن رکھنے کی الماریاں بھی ہیں۔ اوہو...... تو آپ سمجھ گئے۔ جی ہاں یہ ہمارا "کچن شریف" کہلاتا ہے لیکن ہمارے لئے لیبارٹری ہے کیونکہ ہم اس میں آئے دن تجربات جو کرتے رہتے ہیں۔

تو جناب! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمیں

خیال سوجھا کہ کیوں نہ سیب کا حلوہ بنایا جائے۔ آخر اس سے پہلے بھی تو ہم پیاز کی کھیر، لہسن کے پکوڑے، ٹماٹر کے چپس اور آلو کے کوفتے بنانے کے "کامیاب" تجربات کر چکے ہیں۔ اب ہماری تمام تر کوشش یہ تھی کہ کبھی لیبارٹری خالی مل جائے تو ہم اپنے تجربات میں ایک اور کا اضافہ کر لیں لیکن امی جان کے گھر میں موجود ہوتے ہوئے یہ کام خطرہ سے خالی نہ تھا کیونکہ انہیں ہمارا لیباٹری میں کام کرنا سخت ناگوار گزرتا ہے حالانکہ ہم نے امی سے کئی مرتبہ عرض بھی کیا تھا کہ کام سے غلطی، غلطی سے تجربہ، تجربہ سے خیال اور خیال سے نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں لیکن امی کا کہنا ہے کہ نئی چیزوں کے وجود میں آنے سے لیباڑی کی پرانی چیزوں کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔

بہر حال! ہم موقع کی تاک میں تھے یا موقع ہماری تاک میں تھا کچھ بھی سمجھ لیں۔ آخر کار وہ سہانا دن بھی آ ہی گیا جب امی کو کسی پارٹی میں جانا پڑ گیا۔ چونکہ ابو جان نے ہمیشہ امی جان کے برعکس ہمارے تجربات کی حوصلہ افزائی کی ہے اس لئے امی کے گھر سے نکلتے ہی ہم تیر کی طرح ابو کے کمرے کی طرف لپکے اور چھوٹتے ہی کہا۔

"ابو سیب کا تھوڑا سا حلوہ بنانا ہے، پانچ کلو سیب چاہئیں۔"

"اچھا ابھی لاتا ہوں۔" ابھی ہم ای کی کفایت شعاری پر کڑھ کڑھ کر ابو کی سخاوت شعاری پر خوش ہو رہے تھے کہ ابو اچانک چونک کر بولے۔

"ہیں! کیا کہا؟ پانچ کلو؟"

"چلئے کچھ کم لے آیئے گا۔" ہم نے جلدی سے کہا۔

ادھر ابو گھر سے نکلے اور ہم اس رسالے کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے جس میں سوجی کے حلوے کی ترکیب لکھی تھی۔ رسالہ مل گیا تو ہم نے ترکیب بیس پچیس مرتبہ پڑھی (کیونکہ ہم بے حد ذہین واقع ہوئے ہیں۔ صرف بیس پچیس دفعہ ہی کوئی چیز پڑھ لیں تو ازبر ہو جاتی ہے۔) اب مسئلہ تھا تجربے کے لئے مطلوبہ اشیا کے حصول کا۔ تلاشِ ڈبہ جات کے مرحلے میں سب سے پہلے ہم نے چینی کا ڈبہ ڈھونڈ نکالا اور گھی کا ڈبہ بھی لیبارٹری کے ایک خفیہ خانے سے بر آمد ہو گیا۔ ہم نے سب چیزیں بڑے سلیقے سے رکھیں اور دل ہی دل میں منصوبہ بنانے لگے کہ جب امی آئیں گی تو ہم مزیدار حلوہ چاندی کے ورق لگا کر امی کی خدمت میں پیش کریں گے اور آج تو امی بھی ہمارے سگھڑاپے کی معترف ہو جائیں گی۔

اتنے میں بیل بجی۔ دروازہ کھولا تو ابو تھے۔ ہم نے ان کے ہاتھ سے سیبوں کا لفافہ تقریباً چھینا اور فوراً لیبارٹری میں گھس گئے۔ لفافہ کھولتے ہی سرخ سرخ سیب مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ ابھی ہم انہیں جواباً مسکرا کر دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ کوئی چیز سیدھی ہم پر آ گری۔ یہ محترمہ چھپکلی صاحبہ تھیں جو سیبوں پر نثار ہونے کے لئے چھت سے سیدھی ہمارے ہاتھ میں پکڑے

ہوئے لفافے پر "لینڈ" کر گئی تھیں۔ پھر کیا تھا ہمارے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی، سیبوں کا لفافہ ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آرہا اور ہم ان سیبوں پر اسکیٹنگ کرتے نظر آنے لگے۔

بڑی مشکل سے اپنے حواس کو قابو کیا اور نگاہیں دوڑائیں تو چھپکلی صاحبہ کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ ہم نے جلدی جلدی سیبوں کو سمیٹا اور سوجی کے حلوے کی ترکیب ذہن میں دہرانی شروع کی۔ "سب سے پہلے الائچی کو گھی میں کڑکڑائیں اور سوجی کو بھونیں۔" تو گویا پہلے سیبوں کو بھوننا چاہیے۔ آخر سیبوں کو بھوننے کے لئے ہم نے ایک قدیم دیگچے کو دریافت کیا۔ اسے چولھے پر رکھ کر گھی کا ڈبہ اس میں انڈیل دیا اور اس کے بعد یکے بعد دیگرے سب سیب اس میں ڈال دیئے لیکن پھر بھی تین عدد سیب بچ گئے۔ فوراً ہمیں کسی سیبوں کے ڈاکٹر کا اوہو معاف کیجئے گا انسانوں کے ڈاکٹر کا یہ قول یاد آگیا کہ روزانہ ایک سیب کھایئے اور ڈاکٹر سے دور رہیے۔ اس کے بعد اگلی بات یاد آئی کہ ہم نے پچھلے دن سے سیب نہیں کھایا اس لئے ہم نے پہلے تین عدد "باقی ماندہ" سیبوں کو اپنے معدے میں پہنچایا اور جونہی چوتھا سیب دیگچے سے نکالنا چاہا تو ہمارے ہاتھ سے چپک کر رہ گیا اور ہماری چیخیں نکل گئیں۔ سیب کو ہم نے فوراً سنک میں پھینکا اور فریج کھول کر اپنا ہاتھ کچھ دیر تک فریزر میں رکھا تب جا کر کچھ چین آیا۔ پھر ہمیں یاد آیا کہ ابھی تو ہمیں سیبوں کو بھوننا بھی ہے۔ اس کے بعد ہم مسلسل آدھ گھنٹہ تک سیبوں کو بھونتے رہے لیکن خوشبو نہ آئی۔ حالانکہ ترکیب میں تو لکھا تھا کہ سوجی تھوڑی دیر تک بھوننے کے بعد خوشبو آنے لگے گی۔ ہمیں بے حد غصہ آیا کہ رسالہ میں سوجی کے حلوے کی ترکیب ہی بالکل غلط لکھی ہوئی ہے ورنہ اگر یہ ترکیب درست ہوتی تو پھر سیب کے بھوننے سے خوشبو آنی چاہئے تھی۔ بہر حال ہم نے ایک سیب بذریعہ کفگیر نکال کر پلیٹ میں رکھا اور چاقو سے اس کے دو ٹکڑے کئے لیکن یہ تو اندر سے بالکل کچا تھا اور اس کے "حلوہ" بننے کے کوئی آثار نہ تھے۔

اب تو یہی ہو سکتا تھا کہ اس "تجربے" کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہم اپنی دماغی صلاحیتیں بروئے کار لائیں۔ سو ہم نے سیبوں کو پریشر ککر میں گلانے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے جلدی جلدی تمام سیبوں کو پریشر ککر میں منتقل کر کے چولھے پر رکھا۔ ابھی ہم اپنے جلے ہوئے ہاتھ کا جائزہ لے لے کر سوجی کے حلوے کی ترکیب کو کوس ہی رہے تھے کہ ہم نے اپنی لیبارٹری میں ایک اڑن طشتری سی اڑتی دیکھی۔ یہ چیز اڑتی ہوئی سیدھی ہماری طرف آ رہی تھی۔ ہم نے بھی ریسلنگ کا داؤ دکھایا اور نیچے بیٹھ گئے۔ یہ چیز سیدھی برتنوں کی الماری کا شیشہ توڑتی ہوئی اندر گھس گئی۔ ہم ڈرتے ڈرتے الماری کے پاس پہنچے اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو ککر کا ڈھکنا ہے جو ویٹ نہ دینے کی وجہ سے

سن ہجری کی ابتدا

مرسلہ...... آصف بن شرف، پنجگور

۲۱ ہجری میں حضرت عمر فاروق ؓ کے سامنے سرکاری تحریر پیش ہوئی، اس پر صرف "شعبان" لکھا ہوا تھا آپ ؓ نے کہا "یہ کیسے معلوم ہو کہ کون سے سال کا شعبان ہے؟" اس وقت مجلس شوریٰ منعقد کی گئی، جس میں بڑے بڑے صحابہ ؓ شریک تھے۔ حضرت علی ؓ کے مشورے سے طے پایا کہ اسلامی سن کی ابتدا ہجرت نبوی سے ہونی چاہئے۔

اور حضرت عثمان غنی ؓ کی رائے سے طے ہوا کہ ہجری سال کی ابتدا محرّم سے ہوگی۔

ستاروں پر کمند ڈالنے جا رہا تھا۔ ہم نے دوبارہ گگر کو بند کیا اور پندرہ منٹ بعد کھولا تو سیب گل چکے تھے۔ ہم نے انہیں جلدی سے مکسر میں ڈال کر ان کا پیشگی حلوہ بنانا شروع کیا جب آدھے سیب پس گئے تو ہم نے تھوڑا سا چکھا لیکن اس میں سے تو پیاز کی شدید بو آ رہی تھی۔ ہم نے جلدی سے باقی سیبوں کو سل پر پیسنے کا ارادہ کیا اور جب باقی سیب بھی سل پر پس گئے تو ہمیں پتہ چلا کہ بقیہ سیبوں میں سے ادرک کی بو آ رہی ہے۔ اب کیا ہو سکتا تھا بہر حال ہم نے سوچا کہ الائچی ڈال کر اس کی بو دور ہو جائے گی اور چینی بھی زیادہ ڈال دیں گے۔

فوراً ہم نے گرم مصالحے کے ڈبے سے تمام الائیچیاں نکال کر گھی میں کڑکڑائیں اور پسے ہوئے سیبوں کو ڈال کر اچھی طرح بھونا۔ اس کے بعد چینی کا ڈبہ بھی انڈیل دیا۔ چکھ کر دیکھا تو چینی کچھ زیادہ محسوس ہوئی۔ اسے کم کرنے کے لئے نمک کے دو بڑے چمچے ڈالنا پڑے۔ حلوے کا رنگ ہمیں کچھ "ایٹریکٹ" نہیں کر رہا تھا اس لئے ہم نے سوچا کہ کیوں نہ اس میں زرد رنگ ڈال دیا جائے جب زرد رنگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تو ہم نے سرخ رنگ ڈالنے کا فیصلہ کیا کہ آخر روح افزا بھی تو سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔

حلوہ تیار ہونے پر ہم نے ڈونگے میں ڈالا اور اس پر بادام، کھوپرا وغیرہ سجایا۔ رسالے والی ترکیب کے آخر میں لکھا تھا کہ حلوہ بنانے کے بعد اس پر روح کیوڑہ چھڑک دیں لیکن ہمیں کیوڑے کی خوشبو بالکل بھی پسند نہیں اس لئے ہم نے امی کے بیڈ روم سے جا کر ڈریسنگ ٹیبل سے چارلی پرفیوم کی شیشی اٹھائی اور حلوے پر اسپرے کرنے کا سوچا ہی تھا کہ دماغ نے کہا۔ "چارلی ہے مہنگا!"

لیکن ہم نے فوراً ہی اسے جھڑک دیا۔ "میرے حلوے سے زیادہ تو نہیں۔"

چارلی کے اسپرے کے بعد ہم نے حلوہ سجا کر میز پر رکھا اس اثنا میں امی بھی گھر واپس آ چکی تھیں۔ ہم نے سب کو "حلوہ پارٹی" عرف عام میں اپنے "کامیاب تجربے کی رونمائی" کی دعوت دی۔ اس کے بعد کیا ہوا...... یہ نہ پوچھئے۔ البتہ اتنا ضرور ہم آپ کو بتا دیتے ہیں کہ اب جب امی جان کو کہیں جانا ہوتا ہے تو وہ لیبارٹری کو تالا لگا کر جاتی ہیں!!

وہ کیا راز تھا؟

قسط نمبر ۹

چیخ کی آواز نے جواد کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اس کے بھائی کی چیخ تھی۔ ٹرین میں اس کے ہم سفر ایک پراسرار شخصیت ثابت ہوئے۔ انہوں نے دارالحکومت میں ٹھہرنے کے لئے ہوٹل اسپا کا کارڈ دیا جو بعد میں ہوٹل اسپائیڈر نکلا۔
اس پورے ہوٹل میں آٹھ کا ہندسہ گردش کر رہا تھا۔ آٹھ ٹانگوں والی خونی مکڑیاں سفید سفوف کھا کر بڑی بڑی عفریتوں میں تبدیل ہوگئیں تو بڑی تیزی کے ساتھ ڈرامائی واقعات پیش آنے لگے۔ مکڑیوں کو ہلاک کر دیا گیا تو وہ دوبارہ زندہ ہو گئیں اور انہوں نے جواد، منیجر اور ملازمین کو مار ڈالا پھر وہ اڑنے والے پرندوں کے پیچھے باغ میں چلی گئیں تو لاشیں زندہ ہو گئیں۔ ایک لاش نے غرا کر کہا۔ "ہمیں کوئی نہیں مار سکتا...... ہم نے سفید سفوف کھایا ہے۔" مر کر زندہ ہونے والوں نے آبِ حیات سے غسل کیا تو سب کے زخم بھر گئے۔

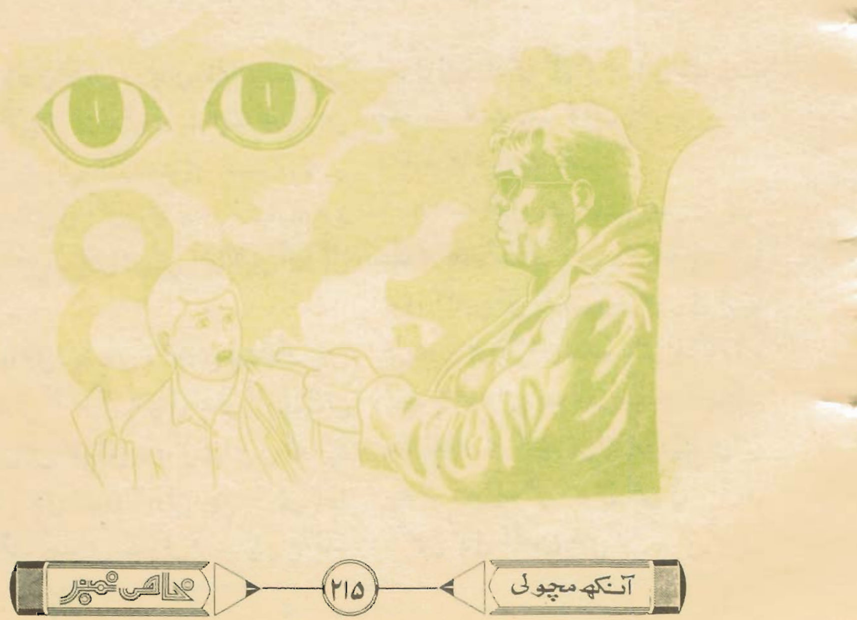

دوبارہ زندہ ہونے کے بعد جواد کا قد بے انتہا بڑھ گیا اور اس کے دماغ میں ایسی لہریں پیدا ہو گئیں جو کسی بھی دماغ میں چپکے سے اپنی جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ یہ ٹیلی پیتھی کی صلاحیت تھی۔

جواد نے عجیب و غریب بونے کو سجدہ نہیں کیا تو اس کی آنکھوں سے بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ ہال کی دیوار ٹوٹ گئی اور جواد باغ میں جا گرا جہاں خونی مکڑیاں اسے بھنبھوڑنے لگیں جواد خوف سے چیخنے چلانے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ زمین میں دھنس رہا ہے اسی وقت ایک زور دار دھماکہ ہوا...... اور جواد نے خود کو بستر پر پایا۔ "اف کتنا بھیانک خواب تھا!" جواد بڑبڑایا پھر اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس کے سامنے وہ باغ موجود تھا۔ جس میں بونے نے اسے پھینکا تھا۔

جواد سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے تکیہ پھینک کر چند مکڑیاں مار دیں تو ملازم ناراض ہونے لگا پھر ملازم کے جانے کے بعد گھرر گھرر کی مدہم آوازوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو چپکے سے وہ راہداری میں نکل آیا۔ راہداری کی اوپری منزل سے اس نے ہوٹل کے عقبی حصے کا منظر دیکھا جہاں کچھ ٹرک کھڑے تھے اور ان میں سے سینکڑوں کی تعداد میں چپٹی ناکوں والے بونے اتر رہے تھے۔ جواد کو پتہ چلا کہ ان بونوں کو کھینچنے والی شعاعوں کی مدد سے دیوارِ قید سے آزاد کرایا گیا ہے۔ بونوں کی یہ عجیب و غریب نسل پوری دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ جواد نے ہرے رنگ کا مشروب پیا تو اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو وہ ریلوے اسٹیشن کی ایک بنچ پر پڑا تھا اور حیرت سے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا جہاں اٹھ انگلیاں اگ آئی تھیں، پوری آٹھ ....!!

(اب آپ آگے پڑھیے)

جواد ہاتھ کی انگلیوں کو دیکھ ہی رہا تھا اس کے پاؤں میں بھی بڑی تیز خارش ہونے لگی۔ گھبرا کر اس نے اپنے پاؤں جوتوں سے باہر نکالے اور پھر یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے مزید پھیل گئیں کہ پاؤں میں بھی آٹھ انگلیاں اگ آئی تھیں۔

وہ ابھی اپنے پاؤں کو کھجانا ہی چاہتا تھا کہ پاؤں کی خارش ختم ہو گئی، پاؤں کی خارش ختم ہوتے ہی ہاتھوں میں کھجلی بھی بند ہو گئی پھر اس کی نگاہ اپنے بیگ پر پڑی جسے وہ "ہوٹل اسپائیڈر" میں چھوڑ آیا تھا۔ بیگ اس کے بالکل قریب بنچ پر پڑا تھا۔ اس کی زِپ آدھی کھلی تھی اور اس کھلے ہوئے حصے سے کالے رنگ کا ایک چشمہ اور دو عدد دستانے جھانک رہے تھے۔

جواد نے جلدی سے دستانے ہاتھوں میں پہن لئے پھر کالا چشمہ دیکھ کر ٹھٹھک سا گیا۔ "کیا میری آنکھیں بھی پرندوں کی آنکھوں کی طرح گول ہو گئی ہیں؟" اس کے بیگ میں ایک چھوٹا سا آئینہ پڑا تھا۔ اس نے جلدی سے، وہ آئینہ بیگ سے نکالا اور پھر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھیں الّو کی آنکھوں جیسی گول ہو گئی تھیں۔

جواد نے کالا چشمہ آنکھوں پر لگالیا تو اس کی گول آنکھیں چشمے کے پیچھے چھپ گئیں۔

ڈرامائی واقعات جس تسلسل کے ساتھ پیش آئے تھے اور اس کے جسم میں جو حیران کن تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، جواد ان واقعات سے وقتی طور پر پریشان ہوا تھا۔اس بات کا اسے یقین تھا کہ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

اس نے اپنے جسم میں ہونے والی تبدیلیوں کو اس وقت تک کے لئے قبول کرلیا جب تک وہ اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے قابل نہ ہو جاتا۔ "مجھے ہوٹل اسپائیڈر" جانا ہو گا اور بغیر کسی ڈر کے اس چیز کو معلوم کرنا ہو گا جسے چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ "

جواد نے بیگ کاندھے پر ڈالا اور جوتے پہن کر بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر اگلی بنچ پر بیٹھا شخص بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے وہ ماحول سے بالکل لاتعلق بنا اخبار پڑھ رہا تھا۔ جواد کو اٹھتا دیکھ کر اس نے اخبار سمیٹا، رول بنایا اور اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں ڈال کر جواد کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے فلیٹ ہیٹ سر پر اوڑھا ہوا تھا، آنکھوں پر کالا چشمہ تھا اور کوٹ کے اونچے کالر نے اس کی گردن کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس حالت میں اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا کہ وہ کون ہے؟

جواد تیز تیز قدموں سے اسٹیشن کی حدود سے باہر آنے لگا۔ یہ راولپنڈی اسٹیشن تھا۔ جواد سوچ رہا تھا۔ "مجھے اسٹیشن سے باہر کسی گاڑی میں بیٹھنا ہو گا اور شکر پڑیاں جانا ہو گا۔لیکن میں "ہوٹل اسپائیڈر" کو کس طرح تلاش کروں گا۔ اس جگہ تک پہنچنے کے لئے راستہ تو مجھے نہیں معلوم ....!!" پھر اک دم سے جواد کو کچھ یاد آیا اور وہ مسکرا اٹھا۔ اسے یاد آیا جب ہوٹل کی گاڑی اسے انٹرویو کی جگہ لے جارہی تھی۔ تو اس نے ہوٹل کی حدود سے باہر نکلتے ہی ایک گول چورنگی کو کراس کیا تھا۔ اس چورنگی کے دائیں بائیں کچھ دکانیں تھیں ان میں سے ایک دکان اسے یاد رہ گئی تھی کیونکہ اس پر ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا تھا جس پر جلی حرفوں میں "سرگم پوائنٹ" لکھا تھا۔

" اس دکان تک پہنچ گئے تو سمجھو ہوٹل اسپائیڈر" تک پہنچ گئے۔ " جواد نے سوچا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اسٹیشن کے باہر چلا گیا جہاں روڈ پر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ پھر ایک کوچ قریب آکر رکی۔ "اسلام آباد ...... اسلام آباد ...... آب پارہ ...... زیرو پوائنٹ، شکر پڑیاں، شکر پڑیاں!!" کنڈیکٹر آواز لگا رہا تھا۔ جواد جھٹ سے کوچ میں چڑھ گیا اور ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کوچ چلنے لگی تو کنڈیکٹر نے گیٹ پر زور سے ہاتھ مارا۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک جھٹکے سے روکی۔ گاڑی میں سوار لوگ چلانے لگے۔ "گاڑی چلاؤ بھئی! ذرا ذراسی جگہوں پر گاڑی روکتے

جواہر پارے

مرسلہ ...... زرمینہ مرتضٰی، پشاور

○ اپنی بھلائی دوسروں کی بہتری کے اندر تلاش کرو۔
○ شیریں زبان نہایت اعلیٰ ہتھیار ہے۔
○ بدترین اندھاپن دل کا اندھاپن ہے
○ ناامید ہونے سے عمر گھٹتی ہے۔

ہو۔"

"اوبھائی صاحب! ہمیں لوگوں کو اتارنا چڑھانا بھی ہوتا ہے۔کیا لوگوں کو اتاریں چڑھائیں بھی نہیں" کنڈیکٹر نے کہا پھر گیٹ سے گردن نکال کر زور سے چلّایا۔

اوبھائی ہیٹ والے! جلدی سے دوڑ کر آ، ٹہلتا ہوا آرہا ہے۔" کنڈیکٹر کی یہ بات سن کر ہیٹ والا تقریباً دوڑتا ہوا کوچ میں سوار ہو گیا اور کوچ فراٹے بھرتی ہوئی چل دی۔ ہیٹ والا پچھلی سیٹ پر جاکر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی! کہاں جانا ہے؟"

"شکر پڑیاں!" جواد نے مختصر سا جواب دیا اور پانچ روپے کنڈیکٹر کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اسی وقت جواد کے برابر بیٹھے ہوئے شخص نے کنڈیکٹر کو مخاطب کیا۔

"اومیاں! مجھے اترنے میں دو تین اسٹاپ رہ گئے ہیں۔ سو کا نوٹ دیا تھا۔ باقی پیسے واپس کرو۔"

"آپ نے مجھے سو کا نوٹ دیا تھا۔ شرم کریں۔ ہم کنڈیکٹر لوگ ایک ایک مسافر کو یاد رکھتے ہیں کہ کس نے کتنے پیسے دیئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے آپ نے مجھے دس کا نوٹ دیا تھا اور میں نے پانچ روپے آپ کو واپس بھی کر دیئے تھے۔" کنڈیکٹر بولا تو گاڑی میں سوار سارے مسافر اس شخص کو مڑمڑ کر دیکھنے لگے۔ جواد نے بھی گردن موڑ کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔ اسی وقت اس شخص نے جواد سے کہا۔ "دیکھئے تو ذرا اس بے ایمان کو ...... سو کا نوٹ دیا ہے اور کس طرح انکار کر رہا ہے۔"

گاڑی میں موجود سارے مسافر کنڈیکٹر کو حق پر سمجھ رہے تھے اور اس شخص کو بے ایمان۔ جواد بھی یہی سمجھ رہا تھا لیکن اس شخص کی آنکھوں میں جھانکتے ہی اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ جواد اس کے دماغ میں پہنچ گیا تھا۔ وہ شخص واقعی حق پر تھا اور اس نے کنڈیکٹر کو سو کا نوٹ دیا تھا۔

جواد کو اپنی ٹیلی پیتھی کی حاصل کردہ صلاحیت پر قطعی حیرت نہیں ہوئی تھی ڈرامائی واقعات جس تیزی کے ساتھ اس کے ساتھ پیش آرہے تھے آہستہ آہستہ حیرت کا پہلو ختم کر رہے تھے۔

جواد کنڈیکٹر کے لب و لہجے کو پکڑ کر اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ وہ اندر سے سخت گھبرایا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنے جھوٹ کو کس طرح نبھائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور جھوٹ بولتا، جواد نے اس کے دماغ پر قبضہ کر لیا۔ اب جواد اس کے اندر تھا۔

جواد نے پہلے تو اس کے دماغ کو ایک ہلکا سا

جھٹکا دیا۔ کنڈیکٹر سر پکڑ کر تکلیف سے چیخ اٹھا۔ پھر جواد نے اسی سے کہلوایا۔ ”میں بے ایمان ہوں۔ اس بھائی نے مجھے سو کا نوٹ دیا تھا۔ میں اسے ہضم کرنے کے چکر میں تھا۔“ اتنا کہہ کر اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے روپوں میں سے پچانوے روپے نوٹ والے شخص کو واپس کئے اور پھر گاڑی میں سوار لوگوں کو مخاطب کر کے بولا۔

”چونکہ میں نے بے ایمانی کی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ سب لوگ اٹھ کر میرے سر ایک ایک جوتا ماریں۔“

”بڑا بے شرم آدمی ہے۔“

”پہلے بے ایمانی کی اب اپنے سر پر جوتے پڑوانا چاہتا ہے۔“

”اب شرمندہ ہے تو کیا اسے جوتے ماریں؟“

گاڑی میں سوار لوگ آپس میں بولنے لگے۔

جواد ابھی تک کنڈیکٹر کے دماغ میں تھا۔ چیخ کر بولا۔ ”بے شک! میں شرمندہ ہوں لیکن اگر آپ لوگوں نے ایک ایک جوتا میرے سر پر نہ مارا تو میں آئندہ بھی بے ایمانی کروں گا اور سمجھوں گا کہ آپ لوگ بھی بے ایمان ہیں۔“

کنڈیکٹر کے ان جملوں نے گاڑی میں سوار لوگوں کو مشتعل کر دیا اور سب سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے لوگوں نے اسے ایک کی جگہ دو دو تین تین جوتے رسید کئے۔ اسی وقت جواد کنڈیکٹر کے دماغ سے نکل آیا۔ کنڈیکٹر نے لوگوں کو اپنے اوپر پل پڑتے دیکھا تو چیخنے چلانے لگا۔

”مجھے کیوں مار رہے ہو۔ میں نے کیا کیا ہے؟؟“ اس پر لوگوں نے اس کی اور پٹائی لگا ڈالی۔ کنڈیکٹر کا برا حال دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی روکی اور کنڈیکٹر کو لوگوں کے نرغے سے یہ کہہ کر چھڑایا کہ آپ لوگ اس کی پٹائی نہ لگائیں، میں اسے خود پولیس کے حوالے کروں گا۔ تب لوگ بکتے جھکتے واپس سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔

شکر پڑیاں تک کا سفر لوگوں کے تبصروں اور ڈرائیور کا کنڈیکٹر کو مسلسل باتیں سنانے میں کٹا۔ شکر پڑیاں کا اسٹاپ آنے پر جواد بیگ سنبھال کر کوچ سے نیچے اتر آیا۔ کنڈیکٹر کو اس نے نظر انداز کر دیا تھا۔ دو ایک مسافر بھی اترے۔ان میں ہیٹ والا بھی شامل تھا لیکن جواد کو نہیں معلوم تھا۔

گاڑی گول چورنگی پر ہی رکی تھی۔ سامنے وہ دکان نظر آرہی تھی جس پر ”سرگم پوائنٹ“ لکھا تھا۔ جواد تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دکان پر پہنچ گیا۔ دکان پر رش نہیں تھا۔ جواد نے دکاندار سے کہا۔ ”معاف کیجئے گا جناب! آپ کو زحمت دے رہا ہوں ...... کیا آپ بتا سکتے ہیں ”ہوٹل اسپائیڈر“ کو کون سا راستہ جاتا ہے؟“

”ہوٹل اسپائیڈر؟“ دکاندار شش و پنج میں پڑ گیا۔ ”جناب! اس نام کا تو کوئی ہوٹل یہاں ہے

ہی نہیں...... بلکہ پورے اسلام آباد میں اس نام کا ہوٹل نہیں۔" دکاندار نے کہا تو جواد چونک اٹھا۔

"لیکن میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور کل رات زبردست بارش بھی ہوئی تھی۔" جواد نے کہا تو دکان دار نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہو سکتا ہے آپ اس نام کے کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوں لیکن کل رات تو کوئی بارش نہیں ہوئی۔ بارش ہوتی تو آپ کو جگہ جگہ پانی کھڑا نظر آتا۔"

"حیرت ہے......!!" جواد بولا۔ "میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ اسلام آباد میں نکاسی کا انتظام بہت عمدہ ہے،اس لئے پانی روڈوں اور گلیوں میں کھڑا نظر نہیں آرہا ہے۔"

"یہ تو نام ہی کا اسلام آباد رہ گیا ہے جناب!" دکان دار مسکرایا تو جواد وہاں سے ہٹ گیا اور اپنے اندازے سے اس طرف جانے لگا جہاں سے اس کے خیال میں آٹھ پہیوں والی گاڑی آئی تھی۔جواد نے گھوم پھر کر شکر پڑیاں کے چاروں طرف کئی چکر لگا ڈالے لیکن "ہوٹل اسپائیڈر" اسے کہیں نہ ملا بلکہ اس نے جس جس سے اس کے متعلق پوچھا تو اکثریت نے یہی جواب دیا کہ "ہوٹل اسپائیڈر" نام کا ہوٹل اس علاقے میں موجود ہی نہیں ہے۔

جواد تھک ہار کر ایک ٹُنڈ مُنڈ سے پارک میں آبیٹھا اور ایک ٹوٹی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے؟ پھر اس نے دستانے اتار کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا ہاتھوں میں آٹھ انگلیاں تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ انگلیاں پیدائشی ہوں۔ انگلیوں کو بغور دیکھنے کے بعد جواد نے بیگ سے چھوٹا آئینہ نکالا اور چشمہ اتار کر اپنی گول گول آنکھوں کو دیکھنے لگا جو چمک رہی تھیں۔ ان کا رنگ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ اب وہ ہلکے سبز رنگ کی تھیں۔

"اگر میں ہوٹل اسپائیڈر نہ پہنچ سکا تو میری یہی حالت رہے گی۔" جواد نے آنکھوں کو چشمے سے ڈھانپتے ہوئے سوچا۔ اس وقت وہ سچ مچ پریشان نظر آرہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ ہاتھوں میں دستانے پہنے اور پھر پارک کی بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ہولے ہولے اسٹاپ کی طرف آنے لگا۔ اسی وقت اس کی آنکھیں جیسے چمکنے لگیں۔ "میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ اس وقت میرے پاس ٹیلی پیتھی جیسی عجیب و غریب صلاحیت موجود ہے اور میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہوں۔" جواد کے ہونٹوں پر پُر اسرار مسکراہٹ دوڑنے لگی۔

اس نے منیجر کے لہجے کو یاد کیا اور اس لہجے کو پکڑ کر منیجر کے دماغ میں پہنچ گیا۔ منیجر اس وقت کھانا کھا رہا تھا اور بری طرح کھانس رہا تھا۔کھانا کھاتے ہوئے اچانک اسے ٹھسکا لگا تھا جس کی وجہ سے وہ کھانس رہا تھا۔ ایک ملازم پانی کا گلاس لے کر دوڑتا ہوا آیا اور منیجر کے سامنے رکھتے

ہوئے بولا۔ "جناب! یہ لیجئے...... پانی...... آپ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔"

منیجر کے دماغ میں نیلی پیلی روشنیاں ناچ رہی تھیں۔ کوئی مرچ اس کے منہ میں آگئی تھی اور گوشت سمجھ کر اس نے اسے چبا ڈالا تھا پھر جب وہ مرچ اس کے حلق میں اترنے والی تھی تو اسے ٹھسکا لگ گیا تھا۔

اس نے ملازم کے ہاتھ سے گلاس پکڑنے کی کوشش کی تو پانی چھلک گیا۔

"لگتا ہے بہت زوروں کا ٹھسکا لگا ہے۔" ملازم بولا تو منیجر کے منہ سے اوں ہاں کی آواز ہی نکل سکی۔ جواد منیجر کی یہ حالت دیکھ کر اس کے دماغ سے نکل کر ملازم کے دماغ میں پہنچ گیا۔ ملازم نے ایک دم سے اپنا سر پکڑ لیا اور چیخ کر منیجر سے بولا۔ "سر! کوئی اس وقت میرے دماغ میں موجود ہے۔"

"کک...... کک...... کیا بک رہے ہو!؟"

منیجر کھانستے ہوئے بولا پھر اچانک ہی اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا۔ وہ پانی کے دو تین گھونٹ لے کر چیخا۔

"ہمارا تجربہ کامیاب ہو گیا۔"

"کیسا تجربہ سر؟" ملازم بولا۔ اپنا سر اس نے ابھی تک تھام رکھا تھا۔

"اس وقت تمہارے دماغ میں جواد موجود ہے۔" منیجر تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

"اپنی سانس روک لو...... جواد واپس چلا جائے گا۔" ملازم نے سانس روک لی۔ جواد کی سوچ کی لہریں واپس آگئیں۔ اب وہ ملازم کے دماغ میں دوبارہ نہیں جاسکتا تھا۔ چنانچہ منیجر کے دماغ میں پہنچ گیا اور پوچھنے لگا۔

"یہ سب کیا چکر ہے؟ تم کس تجربے کی بات کر رہے ہو؟" جواد کی یہ بات سن کر منیجر زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

"ہم تمہارے ذریعے ایک تجربہ کر رہے ہیں۔ اس کا ایک حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ جب کہ دوسرا اور آخری حصہ ابھی باقی ہے۔"

"یہ کیا پہیلیاں بجھوا رہے ہو میں بہت پریشان ہوں۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ یہ کیا چکر ہے۔ مجھے ہوٹل کے لئے راستہ بتاؤ یا پھر گاڑی بھیجو میں گول چورنگی کے پاس کھڑا ہوں۔"

"گاڑی ضرور بھیجیں گے لیکن ابھی نہیں۔"

"ابھی کیوں نہیں؟" جواد نے پوچھا۔

منیجر بولا۔ "ابھی وقت نہیں آیا ہے۔"

"میری بات تو سنو!" جواد نے چیخ کر کہا لیکن اس کی سوچ کی لہریں واپس آگئیں۔ منیجر نے سانس روک لی تھی۔ جواد نے دوبارہ کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

ابھی وہ غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہی تھا کہ اسے کچھ شور سا سنائی دیا۔ کچھ لوگ اس کے قریب سے بھاگے۔

"آگ لگ گئی ہے۔"

"کہاں؟"

"ارم پیلس میں۔"

جواد نے اپنے دائیں طرف ایک دس بار منزلہ بلڈنگ سے دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوئے دیکھے۔ بلڈنگ چورنگی سے بے حد قریب تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بلڈنگ کے نیچے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ کسی نے فائر بریگیڈ کو فون کر دیا۔ تھوڑی دیر ہی بعد فائر بریگیڈ والے آ گئے اور آگ بجھانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے ان کے کارکن بلڈنگ میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بڑی تیزی سے باہر نکالنے لگے تھے۔

آگ پانچویں منزل پر لگی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے شعلے ساتویں منزل تک پہنچ گئے۔ عجیب افراتفری کا منظر تھا۔ لوگ ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ پولیس کے جوان بھی آ گئے تھے۔ ایک عورت ہجوم میں کھڑی چلا رہی تھی۔ "میرے بچے کو بچالو۔ وہ نویں منزل میں پھنسا ہوا ہے۔" لوگ اسے تسلیاں دے رہے تھے۔ ایک امدادی کارکن اپنے افسر سے کہہ رہا تھا۔ "سر! ہم اس خاتون کے بچے کو نہیں بچا سکتے۔ آگ اور دھواں اندر اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ جو بھی اندر جائے گا موت کا شکار بن جائے گا اور آگ تو اب ویسے بھی نویں منزل تک پہنچنے والی ہے ...... ہاں اگر بلڈنگ کے پچھلے حصے سے کوئی سیڑھی لگا دی جائے تو ہم اوپر چڑھ سکتے ہیں۔"

"لیکن اتنی لمبی سیڑھی ہم لائیں گے کہاں سے؟" افسر پریشان ہو کر بولا۔ اسی وقت عورت نے زور سے چیخ ماری اور غم سے بے ہوش ہو گئی۔ جواد یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ "کاش میں اس عورت کے بچے کو بچانے کے لئے کچھ کر سکتا!" پھر کچھ سوچ کر جواد بڑی تیزی کے ساتھ بلڈنگ کے پچھلے حصے کی طرف دوڑا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بلڈنگ کے پائپوں کے ذریعے اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن اس بلڈنگ کے پچھلی سائیڈ میں پائپوں کا انتظام نہ تھا وہ ایک سیدھی سپاٹ سی دیوار تھی جو بارہویں منزل تک چلی گئی تھی۔ اسی وقت جواد کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم میں بجلی بھر گئی ہو۔

اس نے دستانے اور جوتے اتار کر بیگ میں ٹھونسے بیگ کاندھے پر ڈالا اور پھر اپنے ہاتھوں اور پیروں کی گرفت سے بڑی تیزی کے ساتھ سپاٹ دیوار پر کسی ماہر بازی گر کی طرح اوپر چڑھنے لگا۔ وہ جس مہارت سے سپاٹ دیوار پر چڑھ رہا تھا لگ رہا تھا جیسے کوئی مکڑی دیوار پر دوڑ رہی ہو۔

جواد دیوار پر کسی مکڑی کی طرح اوپر کی طرف پھسل رہا تھا اور نیچے ہیٹ والا ایک طاقتور کیمرے سے اس عجیب و غریب منظر کی تصویر کھینچ رہا تھا۔"

جاری ہے ...... (اس سنسنی خیز کہانی کے مزید دلچسپ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں!!)

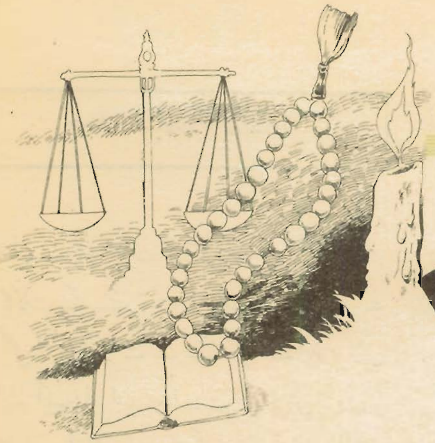

قلم دوست

ان کی تحریریں جو ادیب بننا چاہتے ہیں

فرمانِ الٰہی

محمد سلیم امام، متحدہ امارات

شیطان کھلا دشمن ہے!

اے آدم کی اولاد! ہم نے تم سے کہہ نہیں دیا تھا کہ شیطان کو نہ پُوجنا۔ وہ تمہارا کُھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا یہی سیدھا راستہ ہے اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا تو تم سمجھتے نہیں تھے۔

(۶۰ یٰسین ۶۲)

اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے!

وہ ذات پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہت ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔

(۸۳ یٰسین ۸۴)

روشن مثال

مرسلہ: عثمان حسنی، لاہور

ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کائنات کے لئے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ آپؐ نے کبھی بھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ ایک دفعہ لبید بن اعصم اور اس کی بیٹیوں یا بہنوں نے حضورؐ پر جادو کر دیا۔ جس میں اگرچہ آپؐ کی حیثیت نبوت بالکل مُتاثر نہیں ہوئی لیکن آپؐ اپنی ذاتی زندگی میں اسے محسوس کر کے پریشان ہوتے رہے۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے مدد کے لئے دُعا مانگی۔ اسی وقت آپؐ کو نیند آ گئی۔ جب آپؐ جاگے تو آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے جو پوچھا تھا اس کا مجھے جواب مل گیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے پوچھا وہ کیا بات ہے؟ آپؐ نے فرمایا: دو آدمی (یعنی فرشتے) نیند میں میرے پاس آئے۔ ایک سرہانے کھڑا تھا دوسرا پائینتی کی طرف۔ ایک نے پوچھا کہ انہیں کیا ہوا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ ان پر جادو ہوا ہے۔ پہلے نے پوچھا کہ کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے پہلے نے پوچھا کہ کس چیز میں جادو کیا ہے؟

دوسرے نے جواب دیا کہ کنگھی اور بالوں میں، ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر ــ پہلے نے پوچھا وہ کہاں پر ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ بنی زریق کے کنویں کی تہہ کے پتھر کے نیچے ہے۔ پہلے نے پوچھا اب اس کے لئے کیا کیا جائے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ کنویں کا پانی سونت کر

اسے پتھر کے نیچے سے نکال لیا جائے۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ کرام کو بھیجا۔ بعد میں آپؐ خود بھی وہاں پر تشریف لے گئے۔ نبی زریق کے کنویں کا پانی نکالا گیا اور پھر پتھر کے نیچے سے غلاف بر آمد کیا گیا۔ غلاف میں کنگھی اور بالوں کے ساتھ ایک تانت کے اندر گیارہ گرہیں پڑی ہوئی تھیں اور موم کا ایک پتلا بھی تھا جس کے اندر سوئیاں گھسی ہوئی تھیں۔ جب یہ سب چیزیں بر آمد ہو گئیں تو حضرت جبرائیلؑ آئے اور انہوں نے آپؐ کو بتایا کہ آپؐ معوذتین (یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھیں۔ چنانچہ حضورؐ نے ایک ایک کر کے سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی گیارہ آیتیں پڑھیں۔ ہر آیت کے پڑھنے کے ساتھ ایک گرہ کھلتی رہی اور سوئیاں نکلتی رہیں۔

آخر کار جب تمام گرہیں کھل گئیں اور ساری سوئیاں نکل گئیں تو حضورؐ جادو کے اثر سے باہر نکل آئے۔

پھر آپؐ نے لبید بن اعصم کو بلوایا اور اس سے باز پرس کی۔ لبید بن اعصم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا لیکن آپؐ نے اسے معاف کر کے چھوڑ دیا۔ اس واقعہ سے ہمیں آپؐ کی بزرگی اور بڑائی کا پتا چلتا ہے

نام اور مطلب

مختلف جگہوں کے ناموں کے مطلب یہ ہیں۔

مرسلہ: نہال احمد، کراچی

○ اسپین ــــــ	خرگوشوں کی سرزمین
○ مدینہ ــــــ	شہر
○ ہمدان ــــــ	اکٹھا ہونے کی جگہ
○ خرطوم ــــــ	ہاتھی کی سونڈ
○ لبنان ــــــ	سفیر
○ کویت ــــــ	چھوٹا قلعہ
○ ہالینڈ ــــــ	خالی زمین
○ ریاض ــــــ	باغ

تین چیزیں

○ــ تین چیزیں کرنے والا نادان ہوتا ہے۔

ــ ایک وہ جو احسان کر کے جتائے۔

ــ دوسرا وہ جو بھلائی کرنے سے روکے اور شکریئے کا طلب گار ہو۔

ــ تیسرا وہ جو بُرائیاں کر کے بھلائیوں کی اُمید رکھے۔ مرسلہ: ارقم اسامہ، نیو کراچی

چینی کہاوتیں

○ ۔ اگر تم چاہتے ہو دھوکہ نہ کھاؤ تو تین دکانوں سے قیمت دریافت کر لو۔

○ ۔ ہوشیار آدمی اکثر بے وقوفوں کے نوکر دیکھے جاتے ہیں۔ مرسلہ: صدف مظفر، راولپنڈی

دو مہینے قبر میں

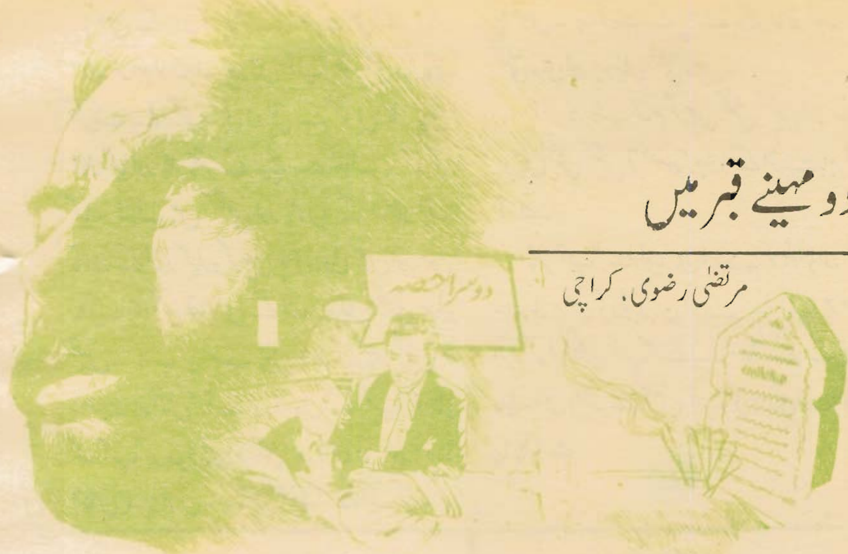

مرتضیٰ رضوی، کراچی

دن اور تاریخیں اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھیں کیونکہ اسے وقت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس نے اپنا سارا حساب کتاب "سونے" اور "جاگنے" سے کر رکھا تھا۔

سفرے جب بھی نیند سے بیدار ہوتا، کھانا کھاتا یا سونے لیٹتا تو اوپر امدادی کیمپ کو فون پر اس کی اطلاع دیتا۔ وہ انہیں اپنی نبض کی رفتار اور جسم کے درجہ حرارت سے بھی آگاہ کرتا۔ امدادی کیمپ کے ارکان اس کے بتائے ہوئے وقت کے اندازے سے حقیقی وقت کا موازنہ کرتے مگر انہیں سختی سے اس بات کی تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ اپنی کسی حرکت یا لہجے سے سفرے پر اصل وقت کا اظہار نہ کریں۔ اگر سفرے آدھی رات کو بھی فون کرتا ہے تو وہ اسی طرح تروتازہ آواز میں جواب دیتے جیسے کہ یہ دن کا وقت ہے۔ ایک روز سفرے نے پانچ بج کر پچاس منٹ پر فون کیا اور انہیں بتایا کہ وہ ناشتہ کر رہا ہے۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹے بعد سات بجے انہیں فون آیا کہ "اس کا دن پورا ہو گیا ہے اور وہ سونے کی تیاری کر رہا ہے" دن اور رات کے نہ ہونے سے سفرے کا وقت اور زمانے کا پتا چلانے کا احساس بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔

زیر زمین جانے کے چار روز بعد سفرے نے گلیشیر پر واقع برف کی قلموں کے بارے میں کچھ ارضیاتی مطالعہ کا ارادہ کیا۔ وہ کچھ تصویریں لینے کے لئے جیسے ہی نکلا، اپنا توازن قائم نہ کر سکا اور

نیچے گر پڑا۔ وہ تو خیر ہو گئی اس نے ایک ہاتھ سے ایک چٹان کا سہارا لے لیا ورنہ نزدیکی کھائی میں اس کا پتہ بھی نہ چلتا۔ اس کے بعد وہ باہر نکلتا تو جوتوں میں ایک ڈوری باندھ لیتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ سفرے کے ڈائری میں ارضیاتی مطالعے اور تحقیق کے بجائے کھانے پینے کی اور آرام کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھرمار ہونے لگی۔ اس کا ذہن اب صرف خود کو زندہ رکھنے کی ترکیبیں سوچنے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ سردی کی شدت کی وجہ سے اسے ڈائری لکھنے کے بجائے سونے کے تھیلے میں آرام کرنے میں زیادہ مزا آنے لگا تھا۔ دو مہینوں کے ختم ہونے تک سفرے ڈائری سے اکتا گیا تھا اور اس کی انگلیاں بھی قلم پکڑنے کے قابل نہ رہی تھیں۔

شروع شروع میں وہ دو تین وقت کھانا کھایا کرتا تھا مگر پھر ایک وقت کھانا بھی اس کے لئے کافی ہونے لگا۔ وہ اب سست اور کاہل ہو گیا تھا اور فرائی پین سے ہی کھانا کھانے لگ گیا تھا اور برتن بھی نہیں دھوتا تھا۔ اس کی سستی کی وجہ سے خیمے کے باہر کوڑے کے انبار لگ گئے تھے اب اس کا دل کھانے کے بجائے سونے کے تھیلے میں آرام کرنے کو چاہتا تھا۔

سفرے کو احساس نہیں تھا کہ وہ اعصاب کو سست کرنے والی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اس کا درجہ حرارت بھی معمول سے کم ہونے لگ گیا تھا۔ نظر بھی کم ہو گئی تھی اور بار بار چکر آنے لگ گئے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر وقت لیٹے رہنے کو پسند کرتا تھا۔

سفرے نے دنوں اور تاریخوں کا جو اندازہ قائم کر رکھا تھا وہ حقیقی تاریخ سے پچّیس روز پیچھے تھا۔ جس روز وہ ۲۰ اگست کی تاریخ خیال کر رہا تھا، اس وقت ۱۴ ستمبر تھی جب اسے امدادی جماعت نے بتایا کہ اس کا تجربہ مکمل ہو گیا ہے تو وہ بہت خوش اور حیران ہوا۔

دو روز بعد امدادی جماعت کے ارکان اسے اٹھانے اور اس کا سامان اٹھانے کے لئے غار میں آئے۔ وہ اتنا کمزور اور تھکا ماندہ ہو گیا تھا کہ انہیں باقاعدہ اسے اوپر اٹھانا پڑا۔ اس احتیاط کے تحت کہ دو مہینے زمین کے نیچے رہنے کے بعد اچانک سورج کی روشنی اسے اندھا نہ کر دے۔ اسے تین عدسوں کا چشمہ پہنایا گیا۔ سفرے کی اس جان جوکھوں والی مہم کے بعد جن ڈاکٹروں نے اس کا طبّی معائنہ کیا تو وہ حیران رہ گئے کہ جسمانی طور پر اس پر بہت کم اثرات ہوئے تھے۔ اس تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ انسان جس ماحول میں رہتا ہے۔ اس سے قطعی مختلف ماحول میں بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے اس کو اپنے اندر زبردست قوت ارادی اور ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لینے کی صلاحیت پیدا کرنا ہوتی ہے۔

ایک دن کی بات ہے

نور السحر، کراچی۔

ایک دن ہوا یوں کہ ہم گھر میں تھے۔ اچانک تیز بارش ہونے لگی بارش ہوتا دیکھ کر سب بچے فلیٹوں سے نیچے اُتر آئے ہر طرف بارش اور بچوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ بچوں کو بارش میں کھیلتا دیکھ کر ہمارا بھی جی للچایا کہ ہم بھی نہائیں ہم نے جاکر امی سے پوچھا تو انہوں نے ڈانٹنا شروع کر دیا۔ "ہر وقت بیمار رہتی ہو، کھانسی، نزلہ، زکام، بخار اور اس پر ان صاحبہ کو بارش میں نہانے جانا ہے۔" ہم اپنا سا منہ لے کر واپس اپنے کمرے میں آگئے۔ تھوڑی دیر بعد پتا نہیں امی کو کیا سوجھی کہ ہمارے کمرے میں آکر بولیں۔ "سُنو نوری میں تمہیں اس شرط پر نہانے دوں گی کہ پہلے تم گھر کی صفائی کرو گی۔" یہ سُنتے ہی ہم اس طرح اُٹھ بیٹھے جیسے ہم میں چابی بھر گئی ہو۔ جلدی جلدی سارا کام نپٹایا اور پھر تھوڑی دیر میں گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا ہم جیسے ہی نہانے کے کپڑے پہن کر باہر نکلے۔ پتا چلا کہ بارش ختم ہو گئی ہے۔ اب تو ہمیں بہت غصہ آیا خاص کر امی پر۔ اس دن ہم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا اور اپنے کمرے میں جاکر سو گئے شام پانچ بجے آنکھ کُھلی تو امی ہمیں جھنجھوڑ کر اُٹھا رہی تھی۔ "اے نوری! اُٹھو...... باہر بڑی تیز بارش ہو رہی ہے جاؤ جاکر نہالو۔" امی کی یہ بات سُنتے ہی ہم بغیر چپلوں کے باہر دوڑے اور پھر بارش میں خوب نہائے اور جب بارش رُکی تو تب کہیں جاکر واپس آئے۔ امی باورچی خانے میں پکوڑے تل رہی تھیں۔ پکوڑوں کی سوندھی سوندھی خوشبو ہمارے معدے میں ہلچل مچانے لگی تو جلدی جلدی ہم نے اپنا جسم خشک کیا اور پکوڑے اُڑانے باورچی خانے میں پہنچ گئے!!

.... ○ ....

اصل نام

- ○ شہنشاہ بابر، — ظہیر الدین
- ○ شہنشاہ اکبر، — جلال الدین
- ○ شاہجہان، — شہاب الدین
- ○ بہادر شاہ ظفر، — معراج الدین
- ○ ابن بطوطہ — ابو عبید اللہ

سفین اللہ دالنبدین

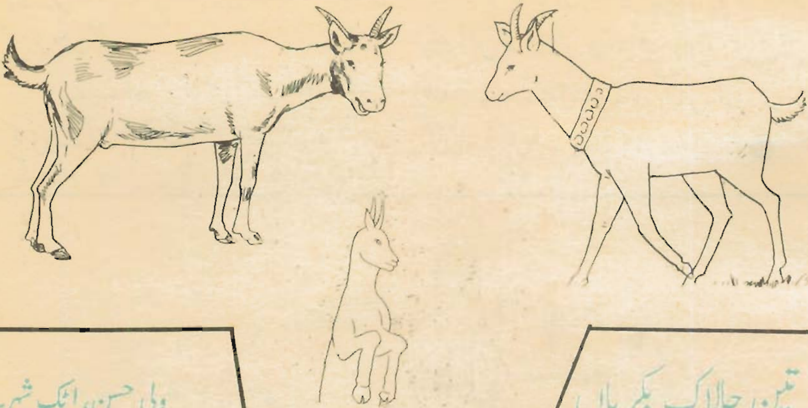

تین چالاک بکریاں

ولی حسن، اٹک شہر۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ تین بکریاں تھیں۔ ان میں سے ایک بہت چھوٹی ایک اس سے بڑی اور ایک سب سے بڑی تھی۔ وہ ایک کھیت میں رہتی تھیں۔ اس کھیت میں سے ایک دریا گزرتا تھا۔ جس کے اوپر ایک پُل تھا۔ اس پُل کے نیچے ایک خطرناک بونا رہتا تھا۔ وہ ان بکریوں کو کھانا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ تین بکریاں پُل کے اوپر نہ جاتی تھیں۔ حالانکہ پُل کے اس پار بہت ہری گھاس، سیب اور بیری کے درخت تھے۔ لیکن وہ خطرناک بونے سے خوفزدہ تھیں۔

ایک دن چھوٹی بکری نے کہا، "میں پُل کے اس پار جا رہی ہوں وہاں پر بہت اچھی گھاس ہے۔"

دوسری بکریوں نے کہا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو بونا تمہیں پکڑ لے گا۔

چھوٹی بکری نے کہا، "میں ڈرتی نہیں، وہ مجھے نہیں کھائے گا میں بہت چھوٹی ہوں۔"

اور وہ چلتی ہوئی پل پر سے گزرنے لگی۔

جب بونے نے چلنے کی آوازیں سُنی تو اس نے پوچھا۔ "یہ کون میرے پُل سے گزر رہا ہے۔ میں تمہیں کھا جاؤں گا۔"

تو چھوٹی بکری نے کہا، "نہیں میں چھوٹی ہوں۔ ابھی بڑی بکری آئے گی تو تم اسے کھا لینا۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

جب بڑی بکری نے دیکھا کہ وہ آرام سے چلی گئی اور بونے نے اسے کچھ نہیں کہا تو وہ بھی پُل پر سے گزری۔ بونے نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میرے پیچھے بڑی بکری آئے گی تم اسے کھا لینا۔ بونے نے اسے جانے دیا۔ جب سب سے بڑی بکری نے یہ دیکھا کہ بونے نے ان دونوں کو

کچھ نہیں کہا تو مجھے بھی کچھ نہیں کہے گا۔ اور وہ بھی پُل پر چڑھ گئی۔

بونے نے کہا، "آہا میں تمہیں کھاؤں گا۔ تو بکری نے کہا، "تم مجھے نہیں کھا سکتے، کوشش کر کے دیکھو" بونا پُل پر چڑھ آیا۔ بکری نے اسے سینگوں پر اُٹھا لیا اور دریا میں پھینک دیا اور کہا تم مجھے نہیں کھا سکتے اور وہ بھی پُل کے پار چلی گئی پھر ان سب نے بیری سیب اور گھاس کھائی اور سو گئیں۔ انہیں اب بونے کا ڈر نہ تھا۔ ●

آزادی دو

مرسلہ..... طاہر فخر الدین، کراچی۔

کشمیر کی یہ وادی ہے یہ وادی بولے آزادی دو
آزادی دو
یہ اپنا لہو بہا دے گی اسے آزادی دو
آزادی دو
اس وطن کے بچے ہر باشندے کی زبان پر ہے آزادی دو
آزادی دو
اس کی ہر ایک وادی بولے آزادی دو
آزادی دو
تم ظلم کرو گے جتنا بھی ہم لے کر رہیں گے آزادی
آزادی دو

مرزا صاحب

مولا بخش، کراچی

سر پر پھندنے والی ٹوپی، منہ میں پان، دبلا پتلا جسم جس پر اچکن، لکڑی جیسی ٹانگیں جن پر سفید پاجامہ، چلتے تو ٹانگیں آٹھ کا ہندسہ بناتیں، دوڑتے تو تقریباً ۱۰۰ میٹر یا اس سے کچھ زیادہ ہی یہ حلیہ تھا مرزا صاحب کا جو ہمارے پڑوسی ہیں۔ مسلسل بولنے میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ زیادہ تر لوگ انہیں برداشت ہی کیا کرتے ہیں۔

ایک روز کچھ کتابیں خریدنی تھیں۔ میں گھر سے باہر نکلا تو مرزا صاحب ٹکرا گئے۔ حال احوال کے بعد پوچھنے لگے کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ میں نے بتایا کہ طارق روڈ کتابیں خریدنے جا رہا ہوں تو وہ بھی چلنے کے لئے ضد کرنے لگے۔ "کیا کہہ رہے ہیں مرزا صاحب! طارق روڈ اور اس حلئے میں!!" میں نے انہیں ٹالنا چاہا۔

"تو کیا ہوا بھائی کتابیں ہم نے خریدنی ہے نا کہ حلئے نے" مرزا صاحب بلبلا کر بولے "مگر نئی دکان اور یہ حلیہ...... دوکان والا دکان میں گھسنے ہی نہ دے گا۔" ہم نے خدشہ ظاہر کیا تو مرزا صاحب چراغ پا ہوگئے۔ دکان دار کو خوب صلواتیں سنائیں اور ہمیں بھی...... خیر ہم انہیں ساتھ لے جانے پر راضی ہوگئے کہ مرتا نہ کیا کرتا کی مثال سچ ثابت ہو رہی تھی۔

طارق روڈ کے لئے گاڑی میں سوار ہوئے تو مرزا صاحب مسلسل بک بک رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگ انہیں مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے جب کہ ہم بور ہو رہے تھے۔

گاڑی سے اترنے لگے تو کنڈیکٹر بولا۔ "یہ ریڈیو کہاں کا ہے؟" وہ تو شکر ہوا مرزا صاحب نے

یہ جملہ نہیں سنا ورنہ وہ وائس آف امریکا بن جاتے۔

قصہ مختصر ہم طارق روڈ پر واقع ایک بڑے سے کتاب گھر میں داخل ہوئے جہاں قسم قسم کی کتابیں سجی تھیں۔ کتابیں دیکھ کر مرزا صاحب کی رال ٹپک پڑی اور وہ ہم سے پہلے ہی کتابوں پر جت گئے۔ ہم نے تو صرف دو ہی کتابیں خریدیں جب کہ مرزا صاحب نے پوری پندرہ کتابیں خرید لیں۔

کتابیں خرید کر جب ہم واپس آرہے تھے تو کچھ لڑکوں نے مرزا صاحب پر آواز لگائی۔ "چچا چھکن!" ایک بہت ہی شریر لڑکے نے یہ سن کر کہا۔ "چچا چھکن نہیں چچا اچکن" اس کے اس جملے پر زور دار قہقہہ پڑا۔

"کیا ردی بیچنے جارہے ہو چچا؟" اسی لڑکے نے جملہ کسا تو مرزا صاحب جو کافی دیر سے انہیں برداشت کر رہے تھے غصے سے پھٹ پڑے۔ "شرم نہیں آتی شیطانو! اماں ابا نے یہی تمیز سکھائی ہے۔ بڑوں سے بات کرنے کا سلیقہ تک نہیں۔ ایک ایک کے دماغ درست کر دوں گا۔" غصے سے وہ اپنی اکلوتی چھڑی ہوا میں زور زور سے لہرانے لگے۔ بڑی مشکلوں سے ہم نے انہیں قابو میں کیا۔ گنے کا رس پلایا اور پنواڑی کی دکان سے سونف خوشبو کا پان کھلایا تو تب کہیں جا کر ان کا غصہ رفع ہوا۔

شریر لڑکے تو بھاگ گئے تھے (حالاں کہ ہمیں بھاگنا چاہئے تھا) اور مرزا صاحب مسلسل ہمارے دماغ کا گودا کھا رہے تھے۔

گاڑی آئی تو مرزا صاحب کو سہارا دے کر گاڑی میں بیٹھے اور خدا خدا کر کے گھر پہنچے لیکن مرزا صاحب ہماری جان چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ہم ان سے جان چھڑانے کی کوئی اچھی سی ترکیب سوچنے لگے پھر ایک ترکیب ذہن میں آئی تو انہیں ڈرایا کہ ابا جان آج بہت غصے میں ہیں کہیں وہ اپنا غصہ ان پر ہی نہ اتار دیں ہماری ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور مرزا صاحب ابا جان کا نام سنتے ہی فوراً رفو چکر ہو گئے!! ○

روشنی

مرسلہ ...... سمیرا معین، کراچی

○ ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرو۔
○ خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔
○ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی غرور ہوگا وہ جنّت میں نہیں جائے گا۔
○ جنّت ماں کے پیروں تلے ہے۔
○ حلال روزی کمانے والا خدا کا دوست ہے۔

خوشبو

مرسلہ: جنید اختر، کراچی

پھول خوشبو کے لئے
تعلیم زندگی سنوارنے کے لئے
زندگی دوسروں کے لئے
چاند روشنی کے لئے
باغ پھولوں کے لئے

کہہ رہا ہے چھ ستمبر

مرسلہ

ثنا اختر قریشی اسلام آباد۔

کہہ رہا ہے چھ ستمبر دوستو   بن کے رہنا شیرِ ببر دوستو
شمعِ آزادی پہ تم پروانہ وار   جان کر دینا نچھاور دوستو

جان نثارانِ وطن کی یاد کو
تازہ کرنا آج گھر گھر دوستو

جو تمہارے دیس کی جانب بڑھے   اس کو کر دو خاکِ بر سر دوستو
پہرہ دینا سرحدوں پر ڈٹ کے تم   ہے عدو اک کینہ پرور دوستو

جب ضرورت ہو تمہاری دیس کو
پیش کرنا خود کو بڑھ کر دوستو

جنگ لڑنا سب جلا کر کشتیاں   مثلِ طارق تم سراسر دوستو
سکّہ جرأت بٹھا دو آج سے   مثلِ خالد سب جہاں پر دوستو

تم نے پینسٹھ میں دکھایا جو کمال
اس کو دہرانا برابر دوستو
تاب تم سے غازیوں کی لائے کون
کون ہے تم سا دلاور دوستو

کہہ رہا ہے چھ ستمبر

مرسلہ
ثنا اختر قریشی اسلام آباد۔

کہہ رہا ہے چھے ستمبر دوستو — بن کے رہنا شیرِ ببر دوستو
شمعِ آزادی پہ تم پروانہ وار — جان کر دینا نچھاور دوستو

جان نثارانِ وطن کی یاد کو
تازہ کرنا آج گھر گھر دوستو

جو تمہارے دیس کی جانب بڑھے — اس کو کر دو خاکِ برسر دوستو
پہرہ دینا سرحدوں پر ڈٹ کے تم — ہے عدو اک کینہ پرور دوستو

جب ضرورت ہو تمہاری دیس کو
پیش کرنا خود کو بڑھ کر دوستو

جنگ لڑنا سب جلا کر کشتیاں — مثلِ طارق تم سراسر دوستو
سکہ جرأت بٹھا دو آج سے — مثلِ خالد سب جہاں پر دوستو

تم نے پینسٹھ میں دکھایا جو کمال
اس کو دہرانا برابر دوستو
تاب تم سے غازیوں کی لائے کون
کون ہے تم سا دلاور دوستو

غار کیا ہیں؟

فہم عزیز، کراچی

غار زمین پر قدرتی خلا کو کہا جاتا ہے۔ زمین کے بعض ٹکڑے پانی کے مسلسل گرنے سے پگھل کر کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔ ایسے غار اکثر چونے کے ٹیلے یا پہاڑوں میں پائے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ کافی چھوٹے ہوتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بڑھتے رہتے ہیں۔ اور صدیوں میں یہ پیچیدہ شکل اختیار کر جاتے ہیں کیونکہ پانی کے بخارات میں تبدیل ہونے سے مادے کی تہیں عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ فرش پر جو مادہ ٹپکتا ہے اس کو اسٹلیکٹسائٹس کہتے ہیں اور جو زمین پر موجود ہوتا ہے اسے اسٹیلمائٹس کہتے ہیں۔ چکر دار یا تھوں کی طرح بھی ہوئی شکلوں کو ہیلیکٹائٹس کہتے ہیں۔ قدرت کی اس دیدہ زیب کاریگری سے طرح طرح کی شکلیں بن جاتی ہیں کہیں کہیں تو حسین رنگوں کی رونق بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اس رنگینوں کی وجہ یہ ہے کہ پانی میں معدنیات ابھر آتی ہیں۔ زمین میں لوہے کی موجودگی سے لال، ہری اور اودی لکیریں پڑ جاتی ہیں۔ غار دنیا کے ہر کونے میں موجود ہیں۔ اور کئی غار تو ہزاروں میٹر لمبے ہوتے ہیں۔

اٹلی کے نیسلے گروٹو غار مشہور ہیں۔ فرانس میں تو ایسے گہرے غار بھی موجود ہیں۔ جس میں ابتدائی انسان نے جانور اور شکار کے خاکے بنائے ہیں اور یہ خاکے ہڈیوں سے بنائے گئے ہیں۔ برش کا کام سرکنڈوں سے لیا گیا ہے۔ مختلف رنگوں کی مٹی کو چکنائی سے ملایا گیا ہے۔ تاکہ رنگین مٹی دیواروں پر چپک سکے۔ انگلستان کے ساحل پر چاک کے غاروں کو اسمگلر استعمال کرتے تھے۔ امریکہ میں کئی مشہور غار ہیں۔ ہوائی غاروں میں ہوا کے عجیب عجیب جھونکے ملتے ہیں۔ دنیا کے دو سب سے بڑے غاروں کا سلسلہ امریکہ کے ممتھ غار اور نیو

میکسیکو کے کالز باڑ غار ہیں یہ بہت غار میں پورے سال درجہ حرارت برابر رہتا ہے۔ چاہے سورج کی تپش بہت زیادہ ہو یا برف پڑ رہی ہو۔ ان غاروں کے اس سلسلے میں سورج کی روشنی کبھی نہیں پہنچتی گہرے اندر پانی کے تالابوں میں ایسی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جن کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ صدیوں اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے انکی بینائی کی قوت شل ہو گئی ہے۔ ایسے جھینگر بھی ہیں جو دھوپ سے محروم ہو کر پیلے پڑ گئے ہیں۔ وہاں پر چمگادڑیں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ ابتدائی انسان غاروں میں رہتا تھا یہاں اس کو موسم کی سختی اور جانوروں سے حفاظت مل جاتی تھی۔ بھارت کے ارجنتا غاروں میں بت مت کے بھگشوؤں نے اپنے عبادت خانے قائم کئے ہوئے ہیں۔ ان غاروں کی دیواروں پر گوتم بدھ کی بے شمار تصویریں ملیں گی۔ مکہ معظمہ کے قریب غار حرا اسلامی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

○

بچے کیا ہیں!

مرسلہ ..... ممتاز الدین احمد، کراچی

اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے کہ بچے کیا ہیں اس بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف رائے ہے:۔

ادیب نے کہا

بچے ایک کتب کی مانند ہیں جس کو جتنا پڑھو اتنا ہی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

طبیب نے کہا

بچے ایک ایسی دوا کی حیثیت رکھتے ہیں جو دل و دماغ کو سکون اور پہنچاتی ہے جو صحت کے لئے ضروری ہے۔

مصوّر نے کہا

بچے ایک ایسی تصویر کی طرح ہیں جس میں جتنا زیادہ اور خوبصورت دیدہ زیب رنگوں کا ملاپ کیا جائے۔ وہ اتنی ہی خوبصورت نظر آئے گی۔

ماں نے کہا

بچے پھول ہیں جو طرح طرح کی خوشبوؤں اور دیدہ زیب رنگوں میں دنیا کے ہر باغ میں موجود ہیں۔

بچوں کی قوالی

کیڈٹ عرفان احمد
پٹارو

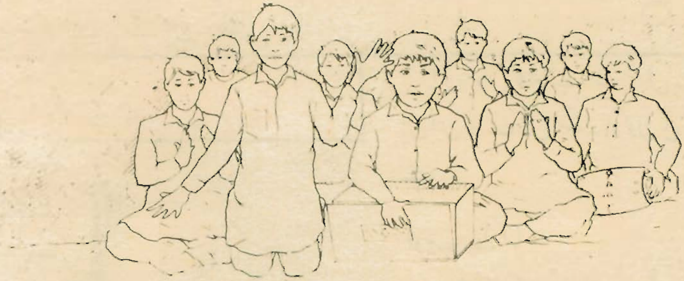

غم دل سنانے کو جی چاہتا ہے
جماعت میں گانے کو جی چاہتا ہے
نہ حلوہ نہ پوری نہ لڈو نہ برفی
میرا کھیر کھانے کو جی چاہتا ہے
کہیں دیکھتا ہوں جو مرغ مسلم
وہاں بیٹھ جانے کو جی چاہتا ہے
جہاں کوئی جوہڑ ہو یا کوئی نالا
وہاں پر نہانے کو جی چاہتا ہے
ریاضی کے گھنٹے میں جانے سے پہلے
بہانے بنانے کو جی چاہتا ہے
سنے کون عرفان مرے دل کی باتیں
بہت کچھ سنانے کو جی چاہتا ہے

جلیبیاں

مرسلہ: آصف اقبال، کراچی

بیشتر لوگ افریقہ کے صحرائے اعظم کے بارے میں یہ سوچتے ہیں کہ میلوں تک صرف ریت ہی ریت ہو گی حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس صحرا کا صرف چھٹا حصہ ریت سے ڈھکا ہوا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ سخت اور پتھریلا ہے اور یہ چپٹا بھی نہیں ہے۔ افریقہ کا صحرائے اعظم بے حد کوہستانی ہے۔

مرسلہ: فہد احمد شجراہ، کندھ کوٹ

جنوبی امریکہ کے ملک پیرو (PERU) کے لاما سے ہوشیار رہئے۔ یہ اونٹ جیسا جانور اگر اپنے سوار سے ناراض ہو جاتا ہے تو رک جاتا ہے اور گردن گھما کر سوار پر تھوک دیتا ہے۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا۔ ایک بار لندن کے چڑیا گھر میں ایک لاما کو انگریزوں کی اونچی ہیٹ ناگوار گزری چنانچہ جب بھی کوئی شخص اونچی ہیٹ پہنے اس کے قریب آتا تو لاما اس ہیٹ پر اس زور سے تھوکتا کہ ہیٹ دور جا گرتی۔

مرسلہ: عمر عالم خان، کراچی

انڈونیشیا کے ایک جزیرے میں ڈوبتی عورت کو بچانے والے کو سزا دینے کا قانون رائج ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ عورت سے نفرت کرتے ہیں بلکہ وہاں کی عورتیں دنیا کی مانی ہوئی تیراک ہیں۔

مرسلہ: محمد ریحان، کراچی

شاید ہی کوئی آدمی یہ پسند کرے کہ اسے دفن کر دیا جائے لیکن امریکہ کے ایک شخص ایمرٹ (E-mmert) کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ ایک بار وہ ایک تابوت میں پینتالیس دن زمین کے نیچے دفن رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے پڑھنے کے لئے فرصت درکار تھی۔

چپکے سے وہ کہتی ہے

جبران غ گوہر

کچھ کالی سی کچھ گوری سی، اک پیاری سی بچّی ہے
نام ہے اس کا بی بی گڑیا، وہ شیطان کی چچی ہے
چہرے پہ اک ناک ہے تیکھی، صورت اس کی پیاری ہے
امّی کی وہ آنکھ کا تارا، ابو کی دُلاری ہے

بی بی گڑیا کی اپنی بھی اک پیاری سی گڑیا ہے
کپڑے اس کے رنگ رنگیلے، لگتی وہ کوئی بڑھیا ہے
کھیلتے کھیلتے سو جائے جب، گڑیا اس کی کو تکتی ہے
کھانا اپنے ساتھ کھلاتی، دل سے لگا کر رکھتی ہے

بی بی گڑیا کا اچھا سا دادا ہے اور دادی ہے
سُنتی ہے ہر رات کہانی تب گڑیا سو پاتی ہے
اس کا نام ہے ہر اک لب پر ہر اک دل میں رہتی ہے
میری باتیں ختم کرو اب، چُپکے سے وہ کہتی ہے

اوس کیا ہے؟

مرسلہ: جاوید سلیم سوہل، کاموکے

ہوامیں اگرچہ نمی محسوس نہیں ہوتی لیکن اس میں چھوٹے چھوٹے نظر نہ آنے والے پانی کے بہت سے ذرّات موجود ہوتے ہیں۔ رات کو جب سورج چھپ جاتا ہے تو گھاس ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہوامیں موجود پانی کے یہ ننھے ننھے ذرّات گھاس کے قریب آجاتے ہیں اور ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اور نیچے اُترتے ہیں اور ان میں سے کچھ گھاس سے چمٹ جاتے یں۔ ان ذرّوں پر دوسرے ذرّات بھی گرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ سب مل کر ایک بڑا سا قطرہ بن جاتے ہیں۔ انہی قطروں کو شبنم یا اوس (Dew Drops) کہتے ہیں۔

سزا

فرخ ناز معین، کراچی

سیف ایک اچھا لڑکا تھا لیکن غریب تھا پھر وہ ایک آنکھ سے کانا اور کبڑا بھی تھا۔

گلی کے سب ہی لڑکے اسے حقیر جانتے اور اس کا مذاق اُڑاتے۔ لیکن وہ ہمیشہ صبر کرتا۔ ایک دن اس نے اپنی امی سے پوچھا کہ آخر اللہ میاں نے مجھے کانا اور کبڑا کیوں بنایا ہے اس کی امی نے کہا "بیٹا! یہ سب خدا کی مرضی ہے اللہ جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔ تمہیں لڑکوں کی باتوں کا بُرا نہیں ماننا چاہئے۔ صبر کرنا چاہئے۔" سعد جو کہ ایک بد تمیز لڑکا تھا شیطانوں کی ٹولی کا سربراہ تھا۔ اس نے لڑکوں کو سیف کی بے عزتی کرنے کو کہا اور وہ خود بھی اس کو بہت شرمندہ کرتا کبھی "کانا" تو کبھی "کبڑا" کہہ کر اس کا مذاق اُڑاتا۔ ایک دن شیطانی ٹولی کے ساتھ وہ سڑک پر ایک بڑھیا کو پریشان کر رہا تھا کہ سامنے سے ایک تیز رفتار کار آئی اور سعد کی ٹانگیں کچلتی ہوئی چلی گئی۔ لوگ سعد کو فوراً قریبی اسپتال میں لے گئے جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی.............. سعد ہسپتال سے آیا تو گلی میں کسی شیطان لڑکے نے آواز لگائی "لنگڑا آیا ہے۔" سعد کے کان میں جونہی یہ جملہ پڑا اس کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ آج اسے پتہ چلا! تھا کہ کسی کا دل توڑنے کی سزا کیا ہوتی ہے!!

کیا اُڑن طشتریاں واقعی کوئی چیز ہیں؟

مرسلہ : نعیم احمد نعیم، کراچی

آسمان پر بہت سی عجیب و غریب چیزیں دیکھنے میں آتی ہے۔ جب موسم بالکل صاف ہو تو فضا میں روشنی کے حلقے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض لوگ ان روشنی کے حلقوں کو اُڑن طشتریاں سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ طشتریاں نہیں ہوتیں اور نہ یہ اُڑتی رہتی ہیں۔ جب ہوا میں برف کے صاف شفاف ریزے تیر رہے ہوں تو ان پر سورج کا عکس پڑتا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ طشتریاں اُڑ رہی ہیں۔ سائنس داں موسمی تبدیلیوں کا کھوج لگانے کے لئے بعض آلوں کو پلاسٹک کے غباروں کے ذریعے فضا میں بھیجتے ہیں۔ جب سورج کی روشنی کسی غبارے پر پڑتی ہے تو لوگ اسے اُڑن طشتری خیال کرتے ہیں۔

نیند ہو گئی اس کی خراب

مرسلہ ...... سلمان مراد، کراچی۔

کل رات ببلو نے دیکھا ایک سپنا
محل نما سا گھر ہے اس کا اپنا
رکھے ہیں دو دیو محل کے اس نے پہریدار
ٹیبل پر ہیں طرح طرح کے کھانے مزیدار
سونے کے چمچے ہیں اور پلیٹیں ہیں چاندی کی
رکھی ہے سرہانے اس کے کرسی کسی شہزادی کی
ابھی وہ پورا دیکھنے بھی نہ پایا تھا یہ سہانا خواب
ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، ہو گئی نیند اس کی خراب

سائنس کارنر

زمین پر بجلی کس طرح گرتی ہے؟

بادلوں میں بجلی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہوا بجلی کا اچھا موصل نہیں۔ اس لئے بجلی عموماً زمین تک نہیں آتی۔ لیکن بعض دفعہ بادل زمین کے بہت قریب آجاتے ہیں اور اس کے اور زمین کے درمیان میں فرق کم رہ جاتا ہے اور کوئی بلند عمارت یا درخت واسطے کا کام دیتا ہے تو بجلی تیزی سے زمین میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کو بجلی کا گرنا کہتے ہیں۔ یہ بجلی بہت تیز قوت کی ہوتی ہے اور چیزوں کو جلا کر خاک کرتی ہے۔ لیکن تار لگی ہوئی ہو تو بجلی اس تار کے ذریعے زمین میں چلی جاتی ہے اور عمارت کو نقصان نہیں پہنچتا۔

مرسلہ: نوشابہ اکرام، رحیم یار خان

○ آسمان، سات ہیں۔
○ ایک ہفتے میں دن اور رات بھی سات ہوتے ہیں۔
○ صفا اور مروہ میں سات مرتبہ دوڑنے کا حکم ہے۔
○ خانہ کعبہ کے گرد سات مرتبہ طواف کیا جاتا ہے۔
○ اصحاب کہف کی تعداد سات ہے۔
○ سورہ فاتحہ میں سات آیات ہیں۔
○ رنگوں کی تعداد سات ہے۔
○ "پاکستان" کے حروف کی تعداد سات ہے۔

مرسلہ: شیخ ہلال احمد قادری

آٹوگراف

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسولؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی ناک خاک آلودہ ہو یعنی ذلیل و خوار ہو یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! کون ذلیل ہو؟ اور آپؐ یہ جملہ کس کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: "وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور ان میں سے ایک کی بھی خدمت کر کے جنت میں داخل نہ ہوا۔"

مرسلہ: سید محمد اسامہ، راولپنڈی

○ — سگریٹ کے ایک سرے پر آگ اور دوسرے سرے پر احمق ہوتا ہے۔
(اسکاٹ)

○ — سگرٹ نوش جب سگرٹ سُلگاتے ہیں تو دراصل وہ اپنی زندگی کا قیمتی وقت ایک بے کار کام میں صرف کر رہے ہوتے ہیں۔
(کولٹیا)

مرسلہ: نویدالرحمان، کراچی

۱۹۲۸ء میں نیو ساؤتھ ویلز میں ایک شخص کو برقی رو کا ایک زبردست جھٹکا لگا۔ لیکن خوش قسمتی ہے، اس کے ساتھی نے بروقت سوئچ بند کر کے اُسے مرنے سے بچالیا۔ اس حادثے سے پہلے وہ شخص گنجا تھا لیکن آپ یقین کریں کہ اس حادثے کے بعد اس کے سر پر بال اُگنا شروع ہو گئے۔

مرسلہ: محمد شبیر احمد خان

○ — جو چیز نہ آتی ہو اس کے سیکھنے میں شرم محسوس نہ کرو۔
○ — جہاں بیٹھو اپنے مرتبے کا خیال رکھو۔
○ — احمق کی عقل اس کی زبان کے پیچھے اور عقلمند کی زبان اس کی عقل کے پیچھے ہوتی ہے۔
○ — طلوعِ آفتاب کے وقت نہ سو، اس لئے کہ اس وقت سونا بد بختی ہے۔ مرسلہ: ناصر حسین قادری

گپ شپ

بابر حسین، کراچی

جون میں سردی بڑھتی جائے ننھی جان ٹھٹھرتی جائے
مُرغے کی آواز کو سُن کر گدھا بھی میٹھا پان چبائے
نزلے اور سردی نے پکڑا بھالو اپنی نبض دکھائے
چڑیا کو جب کچھ نہ سُوجھے بلّی کو وہ آنکھ دکھائے
فاختہ کی جب صورت دیکھی بازمیاں کا دل گھبرائے
گیدڑ صاحب سیر کو نکلے چیتا اس کی کار چلائے
رستے میں ایک چُوزہ دیکھا منہ میں نقلی دانت لگائے
ڈھول بجاتا مکڑا دیکھا پاس ہی مکھی گیت سنائے
دیکھی جو تصویر چوہے کی بلّی اپنے بل میں جائے

خاص نمبر میں جم جم دیکھو
بابر گپ شپ خوب سنائے

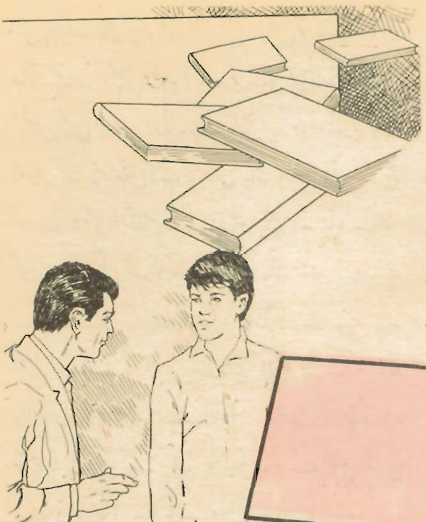

کاغذ سب سے پہلے چین کے لوگوں نے ایجاد کیا۔ اس سے پہلے لوگ درخت کے پتوں چھال، پتھر وغیرہ پر لکھتے تھے۔ ۱۷۹۹ء میں فرانس کے ایک مستری لوئی رابرٹ نے کاغذ بنانے کی مشین ایجاد کی۔ پہلے پہل کاغذ بنانے کے لئے لوگ کتان اور کپڑے کے چیتھڑے کو بہترین اجزا خیال کرتے

کاغذ کی ایجاد

مرسلہ: محمد اظہر خان، کراچی

تھے۔ لیکن آجکل ریشے دار پودے، جنگلات کی لکڑی صنوبر، سفیدے، سن، بانس اور مختلف گھاسوں کو بہترین اجزا سمجھا جاتا ہے۔ معمولی کاغذ بنانے کے لئے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کاٹ اور پیس کر لبری تیار کی جاتی ہے۔ چونکہ اس کا ریشہ اچھا نہیں ہوتا اس لئے کاغذ گھٹیا اور کمزور بنتا ہے۔

کاغذ کو عمدہ بنانے کے لئے کیمیائی اشیا کا استعمال ضروری ہے۔ "لبری کو خوب صاف کر کے سوڈا کاسٹک اور سوڈیم سلفیٹ کی مدد سے اس کا پھولا ہوا گودا دبیز تیار کیا جاتا ہے اور پھر کاغذ کو مضبوط بنانے کے لئے چند کیمیائی اجزا کے ذریعے اس گودے کو آہستہ آہستہ گرم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد خوب دھو کر رنگ کاٹ دیا جاتا ہے۔ اس شفاف گودے کو اچھی طرح سے کوٹا پیٹا جاتا ہے۔ مشین گودے کو اور بھی ملائم کر دیتی ہے۔ رنگ جو ڈالنا ہوتا ہے۔ کاغذ کو چکنا بنانے کے لئے تھوڑی سی چینی مٹی یا کوئی مناسب کیمیکل بھی شامل کیا جاتا ہے۔

گودا تیار کرنے کے بعد ایک مشین جس کو فورڈ رینز کہا جاتا ہے، استعمال کرتے ہیں۔ (یہ مشین اس قدر مکمل ہے۔ کہ ایک طرف سے گوداد ڈالا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف سے کاغذ تیار ہو کر نکل آتا ہے)

پہلے گودے کو پانی میں ملا کر خوب پتلا کر لیا جاتا ہے۔ مشین کے جس حصے میں پتلا گودا ڈالا جاتا ہے وہاں ایک باریک جالی لگی ہوتی ہے جس کو ضرورت کے تحت سلنڈروں پر حرکت دی جا سکتی ہے۔ وہ دائیں بائیں آگے پیچھے حرکت کرتی رہتی ہے تاکہ گودے کے ریشے چاروں طرف یکساں جمتے رہیں

اس باریک جالی کی رفتار اگر کم کر دیں تو کاغذ موٹا ہو جاتا ہے۔ چوڑائی کم یا زیادہ کرنے کا باقاعدہ انتظام مشین میں موجود ہوتا ہے۔ جالی پر گودے کی ایک ہموار تہہ جم جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پانی خارج کرنے کا بھی انتظام ہوتا ہے جو نیچے بہہ جاتا ہے۔ گودے کی پتلی تہہ کو تار کے ایک ہلکے بیلن کے نیچے سے نکالنے کے بعد بھاری سلنڈر کے نیچے سے گزارا جاتا ہے۔ اس سلنڈر پر نمی کو جذب کرنے والا نمدہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ گودا جب نمدار ہو جاتا ہے تو پھر اسے کئی ایک سلنڈروں کی مدد سے اچھی طرح سے دبایا جاتا ہے تاکہ وہ خشک ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے نامکمل کاغذ کو کچھ ایسے سلنڈروں سے گزارا جاتا ہے جن میں سے بھاپ گزرتی رہتی ہے۔ وہ گرم رہتے ہیں۔ یہ سلنڈر نامکمل کاغذ کی چادر پوری یکسانیت کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ تاکہ اس میں جھریاں یا شکن نہ پڑنے پائے۔ پھر نامکمل کاغذ استری کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس میں چمک پیدا ہو جائے اور وہ خوبصورت معلوم ہو۔ اور سیاہی بھی نہ پھیلے۔ جب کاغذ مکمل صورت میں تیار ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے سلنڈر پر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ جہاں کاٹنے والی مشین مختلف سائزوں میں اسے کاٹ دیتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد رم بنا لئے جاتے ہیں۔ اس طرح کاغذ تیار ہو جاتا ہے۔

○

کاش ٹیسٹ کرکٹر ہوتے

مرسلہ:۔ ماجد لطیف، لاہور کینٹ۔

دادا جان منسٹر ہوتے
ابو چیف سلیکٹر ہوتے
اور چچا جو افسر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کرکٹر ہوتے
بولر سے ہم کبھی نہ ڈرتے
ہاتھ پہ ہاتھ کبھی نہ دھرتے
ویسٹ انڈیز سے پالا پڑتا
تو ان فٹ ہو جایا کرتے
وقت شناس مدبر ہوتے
ہم بھی ٹیسٹ کرکٹر ہوتے

مجھے یہ شعر پسند ہے

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

مرسلہ .... ممتاز الدین احمد، کراچی

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم وذ کا!
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا!

مرسلہ .... اعجاز الدین احمد، کراچی

نہیں جاتی کہاں تک فکر انسانی نہیں جاتی
مگر اپنی حقیقت آپ پہچانی نہیں جاتی

مرسلہ .... محمد باسط، کراچی

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

مرسلہ .... الماس زریں، کراچی

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق رضؓ کے لئے ہے خدا کا رسول بس

مرسلہ .... سیدہ حنا نورین کاظمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

مرسلہ .... فیصل زکریا، کراچی

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ______

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ______

رقم ______ بذریعہ ______

پتہ ______

______

فون نمبر ______

ہم مسلمان ہیں

مرسلہ ...... محمد عدنان عبد العزیز

مسلماں ہیں ہم بتاتے چلو
قدم ساتھ آگے بڑھاتے چلو
ہے حق میں ہمارے خدائے کریم
یہ فرمان عالی سناتے چلو
بھنور میں ہے ناؤ اگر قوم کی
اسے بھی کنارے لگاتے چلو
ہر اک اپنے دشمن کو دے کر شکست
ذرا شان اپنی دکھاتے چلو
نڈر ہو کے اب مثلِ فاروق تم
نصیبِ فلسطیں جگاتے چلو

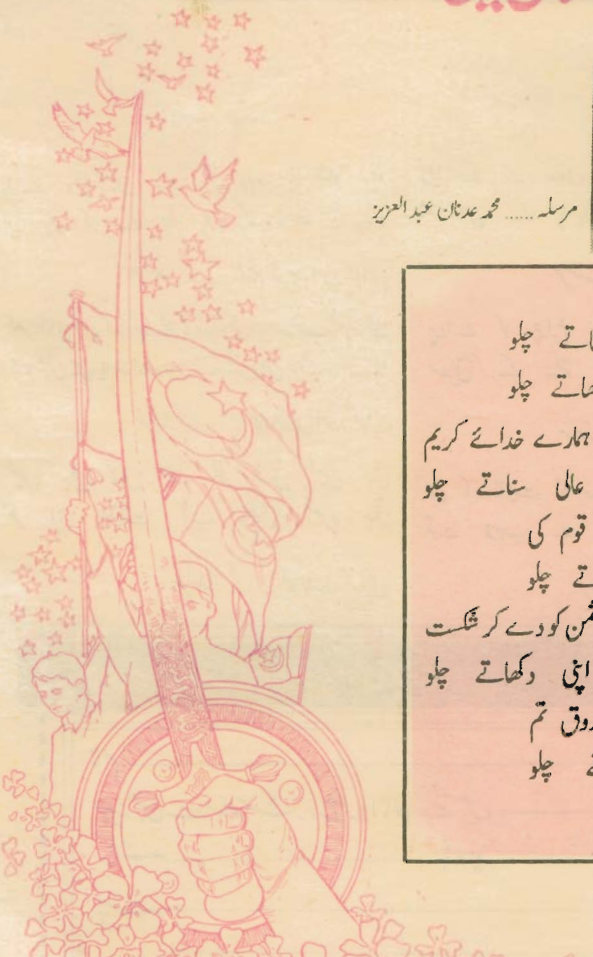

NUT CHOCOLATE
HACKS DROPS
HERO
HACKS
mentholated drops.
ORANGE CANDIES
real orange taste.
HERO
creamy milk chocolate
with rich coconut filling.
NUT CHOCOLATE
milk chocolate
full of nuts.
MOVE TO PAXY'S GALAXY OF SWEET STARS
Paxy's
SIND CHOCOLATE WORKS
Plot No. 11, K-28(C), University Road, Karachi-74800, Pakistan.
LASER DOT
☐ THAVER

REGD No M-266 SEPTEMBER 1994
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI